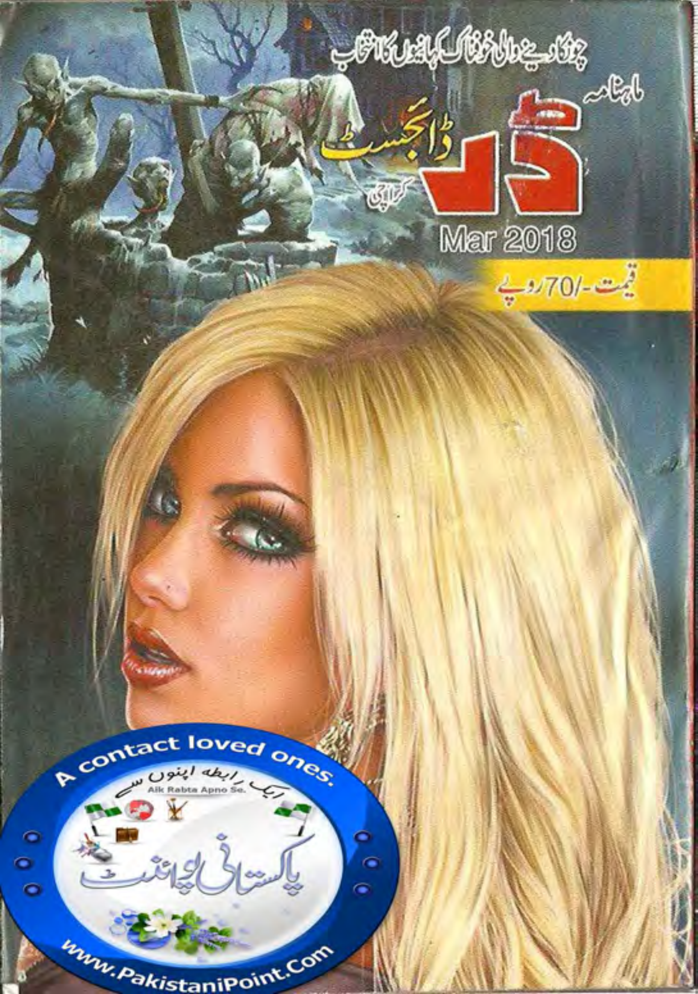
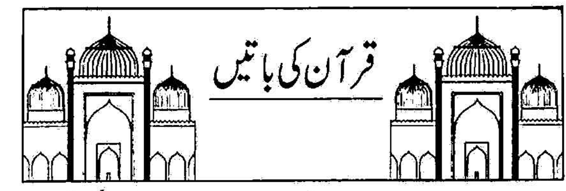

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
Mar 2018
قیمت -/70 روپے
A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ۔ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391



☆ مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں راہ اللہ میں صرف نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم صرف کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 92)

☆ جو آسودگی اور تنگی میں اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور غصے کو روکتے اور لوگوں **کے قصور** معاف کرتے ہیں، اور اللہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 134)

☆ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 42)

☆ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور جو شخص کوئی قصور یا گناہ تو خود کرے لیکن اس سے کسی بے گناہ کو متہم کر دے تو اس نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 111 سے 112)

☆ جو مومن ہیں وہ تو اللہ کے لئے لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ بتوں کے لئے لڑتے ہیں سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو اور ڈرو مت کیونکہ شیطان کا داؤ بودا ہوتا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 76)

☆ اور جو کافر ہیں ان کے لئے دنیا کی زندگی خوشنما کر دی گئی ہے اور وہ مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں لیکن جو متقی ہیں وہ قیامت کے دن ان پر غالب ہوں گے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 212)

☆ بھلا تم ہر اونچی جگہ پر عبث نشان تعمیر کرتے ہو اور محل بناتے ہو تو شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب کسی کو پکڑتے ہو تو ظالمانہ پکڑتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور اس سے، جس نے تم کو ان چیزوں سے مدد دی، جن کو تم جانتے، ہو ڈرو، اس نے تمہیں مویشیوں اور بیٹوں سے مدد دی اور باغوں اور چشموں سے۔ مجھ کو تمہارے بارے میں بڑے سخت دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (سورۃ شعراء 26 آیت 129 سے 135)

☆ جس خیرات دینے کے بعد لینے والے کو ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور اسکی بے ادبی سے درگزر کرنا بہتر ہے۔ اور اللہ بے پروا اور بردبار ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 263)

☆ ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے۔ (سورۃ ھمزہ 104 آیت 1)

(کتاب کا نام ''قرآن مجید کے روشن موتی'' بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

مسز فرحین حامد رحیم یار خان سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹر صاحب اور ادارہ ڈر ڈائجسٹ۔ فروری کے شمارے میں بہت سی کہانیاں شامل اشاعت تھیں۔ جس کے لئے رائے حاضر ہے۔ ڈر ایک ایسا ڈائجسٹ ہے کہ جسے بغور پڑھتی ہوں تو بہت ریلیکس ہوتی ہوں۔ رائٹرز میں فیورٹ رائٹرز احسان الحق صاحب، عمران قریشی صاحب، ایس امتیاز احمد صاحب، ایس حبیب خان صاحب، فلک زاہد صاحبہ، شکیل نیازی صاحب ہیں۔ یہ سب ڈر کی اصل پہچان ہیں۔ ہم پڑھنے والے ایک ہارر ڈائجسٹ میں جس کہانی کے طلب گار ہیں، یہ رائٹرز ہماری روح کی پکار ہیں۔ اس مرتبہ ایس امتیاز احمد صاحب، مریم فاطمہ نے دل جیت لیا۔ اس مرتبہ نہ ایس حبیب خان ہی کہانی پیش کر سکیں اور نہ ہی فلک زاہد صاحبہ۔ ہاں احسان الحق صاحب کی کہانیوں کے آنے کی نوید نے دل کو راحت بخشی ہے۔ راشد نذیر طاہر صاحب نے ایک زبردست سلسلہ وار کہانی کا آغاز کیا ہے۔ ''جان لیوا'' کہانی کی پہلی قسط سے ہی محسوس ہو رہا ہے کہ کہانی آگے چل کر کتنی دلچسپ اور سحر انگیز ہوگی۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کہانی دراصل ''حقیقت'' پرمبنی کہانی لگتی ہے۔ جب تک رائٹر نے ایک خاص عمر نہ گزاری ہو، تب تک اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا جا سکتا ورنہ تو الہ دین کے چراغ کی مانند، چراغ رگڑا اور جن حاضر والی بات بن کر رہ جائے گی۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہیں اور انہیں تقاضوں کے مطابق لکھا جاتا ہے۔ بات وہی پرانی ہوتی ہے لیکن لکھنے میں حقیقت کا رنگ ہونا چاہیئے۔ رائٹر اپنے مشاہدے اور مطالعے سے ان حالات کو اپنے قلمی فن کی مدد سے ایک منظر کا روپ دیتا ہے۔ راشد نذیر طاہر کی کہانی ''جان لیوا'' ڈر ڈائجسٹ میں ایک بہترین معیار کے ساتھ ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ سلسلہ وار کہانیوں کو لکھنا بھی ایک فن ہے، ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ اب اجازت، شکریہ اور دعائیں سب کے لئے سلام۔

☆☆ فرحین صاحبہ: آپ کی تمام باتیں حقیقت پرمبنی ہیں اور دل لگاؤ سے چند سطریں جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ Thanks۔

مسز زینت خار روات سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹرز صاحبان، رائٹرز، دیگر لکھنے والے اور قارئین۔ فروری کے شمارے کو بغور پڑھنے کے بعد یہ کہوں گی کہ بہت محنت سے ترتیب دیا گیا تھا۔ خطوط میں بہت سے خواتین واحباب نے اپنی زندگی کے الم بیان کیے۔ بہت سے دوستوں کے اپنے بچھڑے اور اکثر دوستوں کے اپنے بیمار دکھائی دیئے۔ تمام کے لئے دل سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ پاک سب پر اپنا کرم فرمائیں۔ آمین۔ بالخصوص ایس حبیب خان صاحبہ کی والدہ کے لئے دعا گو ہوں اور اپنی فیورٹ رائٹر سے یہی کہوں گی کہ والدین کی خدمت کرنا آج کے دور میں بہت بڑی سعادت کی بات ہے بلکہ نصیب کی بات ہے۔ اللہ پاک آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ تو آیئے اس ماہ کے ڈائجسٹ کی کہانیوں کی جانب۔ ان کاوشوں کی جانب جو جملہ رائٹرز نے مل کر ہم قارئین تک پہنچائیں۔ پہلی کہانی ایس امتیاز احمد صاحب کی ''شیطان'' پڑھی۔ اس کہانی میں امتیاز صاحب کے قلم کی روانی میں تھوڑی سی کمی محسوس کرتی رہی ہوں۔ بعض جگہوں پر کافی سکتہ تھا اور پڑھتے پڑھتے کہانی رک سی جایا کرتی تھی۔ لیکن کہانی American Hauntling فلم کا ترجمہ تھی۔ رضوان علی سومرو صاحب کی کہانی کفارہ کا ہیرو ہوا میں اتنا اچھل کر بار بار بے ہوش ہوتا رہا، آپ کو چاہئے کہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر ابھی مشق کیجیے اور کہانی میں ابتدائیہ، درمیانیہ اور اختتام کو با مقصد بنایئے۔ امید ہے کہ آئندہ چھوٹی لیکن با مقصد کہانی لکھنے کی سعی فرمائیں گے۔ صائمہ شاہد صاحبہ کی مختصر اور جامع کہانی روح کا انتقام بالکل کسی ہارر فلم کا پلاٹ تھی۔ لکھا اچھا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی مشق جاری رہے گی۔ ''دشمن روحیں'' اور ''ناتوانی'' کے بعد سلسلہ وار کہانی ''جان لیوا'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں جان نظر آتی ہے اور اس کی پہلی قسط جاندار اور شاندار کہانی ہے۔ راشد نذیر طاہر صاحب آپ کی اہلیہ کے انتقال کی خبر ڈر ڈائجسٹ میں پڑھ کر نہایت افسوس ہوا، اللہ پاک آپ کو اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کی زندگی کے ہم سفر کو بہشت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ شاہد رفیق سہو نے کہانی ''روح سے نجات'' پیش کی۔ یہ کہانی مقبول جہانگیر مرحوم نے فرانسیسی رائٹر موپساں کی کہانی کا ترجمہ کرتے ہوئے ''وہ ہاتھ'' کے نام سے شائع کروائی ہوئی ہے۔ آپ کی پیش کی

گئی اس کہانی میں بس کرداروں کے نام مختلف تھے اور پلاٹ والفاظ وہی تھے۔ ویسے کامیابی کے لئے محنت کرنی چاہئے۔اللہ پاک علم کی طلب دے اور ہم سب کو ہدایت دے، آمین، اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ''روح کی دوستی'' بہن مریم فاطمہ کی کوشش پسند آئی۔ آپ چھوٹی چھوٹی معیاری کہانیاں لکھ کر ہر ماہ پڑھنے والوں کو متاثر کرسکتی ہیں۔ لکھنے میں پختگی دکھائی دیتی ہے۔ لکھتی رہیے۔امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے، باقی آئندہ۔ نیک تمنائیں۔

☆☆ زینت صاحبہ: یہ حقیقت ہے کہ بغیر محنت شاقہ کے کسی بھی کام میں نکھار پیدا نہیں ہوتا اور وہی کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے بڑوں کی اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں، اور اچھے مشوروں کو گرہ میں باندھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ آپ کی باتوں پر عمل کرکے کوئی بھی اچھا لکھاری بن سکتا ہے۔ مشورے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

مسز سندس اقبال راولپنڈی سے، محترم ایڈیٹر ڈر ڈائجسٹ، السلام علیکم۔ ماہ فروری 2018 کا ڈر نئے سال کے دوسرے مہینے کا خوبصورت ڈائجسٹ تھا۔ سرورق پر کافی محنت کی گئی تھی۔ کہانیوں میں خوبصورت انداز تحریر میں لکھی گئی کہانیاں شیطان ایس امتیاز احمد، روح کا انتقام از صائمہ شاہد، روح کی فریاد از فاطمہ خان، روح سے نجات از شاہد رفیق سہو، روح کی دوستی از مریم فاطمہ تھیں۔ آخری کہانی کو جاندار ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ راشد نذیر طاہر صاحب کی اہلیہ کا افسوس ہوا، اللہ کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائیں۔ ویسے شاہد بھائی! ان کی لکھی کہانی کمال کی ہے اور پہلی قسط نے ہی ڈر میں اپنے سحر انگیز انداز کی بدولت ذہن پر چھا گئی اور ''جان لیوا'' پڑھنے کا مزا آ گیا۔ میرے شوہر بھی اس کہانی کو پڑھ رہے ہیں اور تعریف کررہے ہیں۔ آپ کا بہت بہت بہت شکریہ اس مرتبہ بس اتنا ہی۔ والسلام

☆☆ سندس صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی قلبی لگاؤ سے تجزیہ کرنا بہت خوب انداز ہے اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

خدیجہ فاطمہ اسلام آباد سے، السلام علیکم انکل! ابھی بھی ڈیٹ شیٹ نہیں آئی اس لئے کہانیاں پڑھنے کے بعد یہ خط لکھ رہی ہوں۔ فروری میں ایک نئی سلسلہ وار کہانی کا آغاز ہوا ہے جسے پڑھ کر دل بہت زیادہ خوش ہوا کیونکہ ایک عرصہ سے ڈر میں ایک solid سلسلہ وار کہانی کو miss کررہی تھی۔ اس سے پہلے تاتونی (عمران قریشی) نے دل کو خوشی دی تھی۔ اور یہ کہانی واقعی اپنی مثال آپ تھی۔ ایم الیاس صاحب نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا حالانکہ وہ چاہتے تو کہانی کے پلاٹ کے اعتبار سے تو کہانی میں جان ڈال سکتے تھے۔ ''جان لیوا'' کہانی ایسی کہانی ہے کہ چھوڑنے کو جی ہی نہیں کرتا۔ بہت زبردست کہانی ہے۔ سرورق بہت اچھا تھا اس کے لئے بھی شکریہ قبول فرمائیں۔ فروری میں کہانیوں کا چناؤ اچھا رہا جن میں شیطان (ایس امتیاز احمد) روح کا انتقام (صائمہ شاہد) روح کی دوستی (مریم فاطمہ) روح سے نجات (شاہد رفیق سہو) اچھی کہانیاں تھیں۔ اس ماہ اتنا ہی لکھنا تھا۔ آپ کے لئے دعاگو۔

☆☆ خدیجہ صاحبہ: آپ نے جو کچھ بھی لکھا بہت خوب لکھا، عمران قریشی کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ محنت سے قارئین کے لئے اچھی اچھی کہانیاں پیش کریں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ خیر ہم سب آپ کے لئے اللہ سے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب کرے۔

فاطمہ خان علی مظفر گڑھ سے، لیجئے جناب اپنی ایک اور تحریر ''خونی قبر'' کے ساتھ پیش خدمت ہوں۔ اس ماہ کچھ زیادہ معروفیات کی بنا پر خطاطی کا بالکل خیال نہیں رکھ سکی۔ اس کے لئے معذرت مگر کہانی کو اگر بروقت کاغذ پر نہ اتارتی تو اتنے شاندار خیال کا پرندہ ذہن کے پنجرے سے اڑ جاتا۔ اسی لئے بروقت کاغذ پر اتار ڈالا۔ کہانی کو مزید طویل نہیں کرسکی مگر مرکزی خیال لکھ ڈالا۔ وقت کی قلت کی وجہ سے خطاطی بھی نہیں ہوسکی۔ اس کے لئے بہت بہت معذرت۔ امید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ کہانی میں موجود کمی بیشی دور کرنے کرکے ''ڈر'' کی زینت بنا دیجئے گا۔ بہت بہت شکریہ۔

☆☆ فاطمہ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ معروفیات کے باوجود آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھا اور آئندہ بھی شکریہ کا موقع دیتی رہیں گی۔ شکریہ۔

ایڈووکیٹ نینا خان کراچی سے، السلام علیکم! جناب ایڈیٹر صاحب امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے، میری خدا سے دعا ہے کہ خدا سب کو کامل صحت عطا فرمائے۔ (آمین) اور ساتھ ہی ''ایس حبیب صاحبہ'' کی والدہ کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ محترمہ کو بھی کامل صحت عطا فرمائے۔ (آمین) ماہ فروری کی تمام کہانیاں ہر ماہ کی طرح زبردست تھیں۔

تھوڑی معروفیت کے باعث تمام کہانی پر مکمل طور پر تبصرہ نہیں کرسکوں گی۔ لیکن کہانیاں تمام ہی اچھی رہیں اس ماہ بھی۔ ''فاطمہ خان''، ''احسان الحق صاحب''، ''ماسٹر محمد خالد عباس''، ''مہر پرویز احمد دولو''، ''محمد حنیف شاکر'' اور ''ڈاکٹر رانا عامر شہزاد'' صاحب کی دل سے مشکور ہوں۔ جنہوں نے میری کہانیوں کی تعریف کرکے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اپنے لفظوں میں یاد رکھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین) مارچ میں وومن ڈے کے موقع پر ایک نظم لکھی ہے امید کرتی ہوں کہ ''قوس قزح'' میں میری غزلوں کو جس طرح جگہ بخشی ہے۔ ''وومن ڈے'' پر لکھی نظم کو بھی جگہ دی جائے گی۔ اب اجازت چاہوں گی۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ تمام لکھنے والوں اور ڈر کے ادارے میں کام کرنے والوں کو عمر دراز بالخیر عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆ نینا صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے وقت نکال کر ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھا اور اپنی تحریریں ارسال کیں۔ آپ کی کہانیاں بھی وقت کے ساتھ ساتھ پسندیدگی کی سند حاصل کرتی جارہی ہیں۔ محنت جاری رکھیں۔ کامیابی آپ کے قدم ضرور چومے گی۔ Thanks۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم، فروری 2018ء کا شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شیخ عمر دین صاحب اور راشد نذیر طاہر صاحب کی اہلیہ کے انتقال کی خبر سن کر دل بے حد اداس ہوا۔ خدا پاک انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین ثم آمین! راشد نذیر طاہر صاحب کی ''جان لیوا'' بھی میں نے پڑھنی شروع کی ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھی شروعات ہوئی ہے۔ گلاب خان سولنگی صاحب کی ''خوف کا سایہ'' ایک شاندار تحریر تھی لیکن اگر ''جونیئر آرٹسٹ'' اور باورچی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی وضاحت کردی جاتی تو زیادہ اچھا رہتا۔ بتول فاطمہ کی ''سیکنڈ فلور'' نہایت زبردست تحریر تھی۔ آپ کی سابقہ کہانی ''بدروح'' بھی اپنی مثال آپ تھی۔ محنت کرتی رہیں۔ خدا آپ کو کامیابی سے نوازے۔ آمین۔ مہر پرویز احمد دولو صاحب کی شکر گزار ہوں گی کہ میری کہانی بھوت کا مقصد سمجھ لیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے آپ کی تحریریں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ آخر میں میری کہانی ''روح کی دوستی'' شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔

☆☆ مریم صاحبہ: اس ماہ آپ کی کہانی شامل اشاعت نہ ہوسکی اس کے لئے معذرت، اگلے شمارے میں کہانی ضرور شائع ہوگی۔ ویسے نئی کہانی مل گئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

مریم مرتضیٰ اسلام آباد سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے ایڈیٹرز اور سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ میں ڈر ڈائجسٹ دس سال سے پڑھ رہی ہوں مگر خاموش قاری ہوں۔ 12 سال کی تھی تب سے پڑھنا شروع کیا۔ اتنے سال گزرنے کے باوجود ڈر ڈائجسٹ آج بھی میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ پاکستان میں یہ واحد معیاری ہارر ڈائجسٹ ہے۔ فروری 2018ء کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ فہرست میں جناب راشد نذیر طاہر کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کے ناول مداری اور بوقاف بہت ہی اعلیٰ تھے۔ جان لیوا بھی بہت اچھا لگا۔ ایک تحریر Email کے ذریعے بھیج رہی ہوں۔ اگر پسند آئے اور آپ کے معیار پر پوری اترے تو ضرور شائع کردیں۔

☆☆ مریم صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ پسند ہے اور ایک طویل عرصہ سے زیر مطالعہ ہے۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ اچھا موضوع ہوا تو ضرور بنا سنوار کر شائع کردی جائے گی۔ آئندہ ماہ بھی خط ضرور لکھنا۔ شکریہ۔

ملک این ایم کاوش سلانوالی سرگودھا سے، السلام علیکم ہزاروں دعاؤں، تمناؤں اور محبتوں کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ ادارہ ہذا کا اسٹاف اور پیارے قارئین بخیریت ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ کہنا لازم وملزوم سمجھتا ہوں کہ اسلامی صفحے کی بدولت ڈر ڈائجسٹ کی شان ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے جو سبق آموز مواد شامل کیا جاتا ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر کہانیوں کی بات کریں تو لکھاری حضرات کے قلم الفاظ نہیں بلکہ سونا اگلتے ہیں۔ یقین جانیے اتنے اچھے، قابل اور مشہور لکھاریوں کے درمیان خود کو آٹے میں نمک کے برابر سمجھتا ہوں۔ سینئر تو درکنار جونیئر بھی مجھ سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور مشکور ہوں شاہد صاحب اور خالد صاحب کا کہ پھر بھی ڈر ڈائجسٹ کے کونوں کھدروں میں جگہ دے کر عزت بخشتے ہیں۔ 7 جنوری 2018ء ایک ناقابل فراموش دن ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کے خصوصی تعاون اور علمی ادبی فاؤنڈیشن بلوچستان کے زیر انتظام ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے مشہور ومعروف اور نامور ادیب اور شعراء کرام کے علاوہ کالم نگاروں اور صحافت سے بلواسطہ اور

بلاواسطہ تعلق رکھنے والی اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ سیکڑوں کی تعداد تھی۔ ہال بھرا ہوا تھا وہیں ڈر ڈائجسٹ کے مشہور اور نامور لکھاری محمد خالد شاہان صاحب کو دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ ڈر ڈائجسٹ کے مشہور لکھاری، پاکستان کی شان اور ادب کی جان ساحل ابڑو صاحب نے اس تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ساحل ابڑو صاحب نے قرب و جوار سے آنے والے مہمانوں کے لئے بہت ہی اچھا انتظام کیا تھا اور جب بندہ ناچیز کو علم ہوا کہ ان سیکڑوں نامور شخصیات میں سے بندہ ناچیز کو ادبی خدمات کے عوض دوسرے نمبر پر منتخب کیا گیا ہے تو اس وقت جو حیرت و خوشی کا عالم تھا بیان سے باہر ہے۔ ساحل ابڑو صاحب نے خالد شاہان صاحب اور بندہ ناچیز کو اسٹیج پر اعلیٰ و عظیم شخصیات کے درمیان جگہ دے کر عزت بخشی۔ معزز مہمان خصوصی کے ہاتھوں سے شیلڈ اور سند وصول کرتے وقت یوں لگا جیسے اٹھارہ سال سے جاری محنت کا پل بھر میں صلہ مل گیا ہو۔ شیلڈ کو دیکھ کر یوں لگا جیسے اٹھارہ سال کی شدید تگ و دو کا بھاری معاوضہ مل گیا ہو اور سرٹیفکیٹ کو دیکھ کر لگا جیسے آج تک لکھی درجنوں کہانیوں کو کتابی شکل دے کر انہیں سمیٹ کر اس سرٹیفکیٹ کی شکل میں مجھے تھما کر ثابت کر دیا گیا ہو کہ دنیا میں کسی کی محنت کبھی رائیگاں نہیں گئی۔ محمد خالد شاہان صاحب کو بھی انہی اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ اس وقت ہماری خوشی دیدنی تھی۔ ڈر ڈائجسٹ کے تعاون اور علمی ادبی فاؤنڈیشن کے زیر انتظام ہونے والی اس تقریب نے دل خوش کر دیا۔ خالد علی اور شاہد علی کے ساتھ ساتھ محمد ساحل ابڑو کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اس قابل سمجھتے ہوئے عزت بخشی۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور بالخصوص علمی ادبی فاؤنڈیشن ڈیرہ اللہ یار بلوچستان کے زیر انتظام ساحل ابڑو صاحب کی بھرپور کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آپ کی سوچ فکر اور خواب کو پورا فرمائے اور اس کار خیر کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ کاوش صاحب: آپ کو اور خالد شاہان صاحب کو عزت افزائی مبارک ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈر ڈائجسٹ نے بے شمار خواتین و حضرات کو لکھاری بننے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی کہانیوں کو بنا سنوار کر پیش کرتا رہا اور کرتا ہے اور پھر رائٹر حضرات کامیاب و کامران ہو کر رائٹر بنتے ہیں۔ خیر ادارے کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل و کرم کرے۔ اور خاص کر ساحل ابڑو صاحب کو اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)

احسان الحق محترم ایڈیٹرز صاحبان ڈر ڈائجسٹ۔ سب کے لئے دعاؤں کے ساتھ عرض یہ ہے کہ ڈر ڈائجسٹ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے سرورق پر نگاہیں پڑیں تو دل میں تعریفی الفاظ خود بخود اُبھرنے شروع ہوئے اور پھر خطوط کو پڑھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایس حبیب خان صاحبہ کی امی حضور کو مکمل صحت عطا فرمائے، آمین۔ اس مرتبہ کہانیوں میں شیطان ٹاپ پر رہی۔ باقی کی کہانیاں بھی خوب تھیں اور مختصر ترین کہانی روح کا انتقام جو ٹوبہ ٹیک سنگھ سے صائمہ شاہد نے تحریر کی، کہانی کا بہت عمدہ طرز تحریر تھا۔ کہانی پڑھتے ہوئے بالکل کسی ہارر مووی کا سا گمان ہوتا تھا، شاباش۔ جان لیوا کے مصنف جناب راشد نذیر صاحب سے پہلے انتہائی دکھ و رنج کے ساتھ افسوس کرتا ہوں کہ ان کی جیون ساتھی کا انتقال پر ملال ہوا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے اور آپ کی دنیا و آخرت کی رفیقہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام، آمین۔ راشد صاحب نے سلسلہ وار کہانی کا آغاز کیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ وار داستان اپنے کمال عروج پر پہنچے اور دلوں میں ایک یادگار تاثر چھوڑے۔ دشمن روحیں کے بعد ڈر میں تاتوتی کا جادو بولتا نظر آیا ہے اور اب ''جان لیوا'' بھی ایک عمدہ ترین آغاز لیے زبردست کہانی ہے۔ موضوع جاندار ہے اور کہانی کے موڑ بھی دلچسپ ہیں۔ ویسے تو ہر کہانی کو حقیقت بھرا ہی ہونا چاہئے تب ہی جا کر پڑھنے والوں کے دل میں جگہ بناتی ہے لیکن سلسلہ وار کہانیاں چونکہ داستان گوئی کے زمرے میں آتی ہیں اور داستان کی خاصیت 'طوالت' ہے۔ اس لئے سلسلہ وار کہانی لکھنا بڑا آرٹ ہے۔ اس بہترین آغاز پر ڈر کی ٹیم اور رائٹر کو مبارکباد دیتا ہوں، اپنا بہت خیال رکھیے گا، والسلام و خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسند کے لئے بہت بہت شکریہ۔ اور ہاں یاد آیا ابھی تک آپ کی کہانی موصول نہیں ہوئی۔ پلیز غور کیجئے گا۔ Thanks۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Story`s اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ''ڈر'' خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا بہت بہت شکریہ، دیگر میٹرز بھی آپ کے پاس ہیں، کسی بھی قریبی شمارے میں لگا کر

شکریہ کا موقع دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام پڑھنے والے خوب صورت ویورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: خط لکھنے اور ڈر کی تعریف کے لئے شکریہ، کہانی شامل اشاعت ہے اور کسی بڑی کہانی کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کریں۔

شاھد عظیم راولپنڈی سے، السلام علیکم امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے، اس مرتبہ ڈر کا سرورق دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی، ایک تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ راشد نذیر طاہر صاحب کی اہلیہ کا بے انتہا افسوس ہوا، اللہ پاک انہیں اپنی رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ ایک طویل عرصہ کے بعد جب سے ایم اے راحت صاحب (مرحوم) کے قلم سے لکھی کہانی ''دشمن روحیں'' اور پھر کچھ عمران قریشی صاحب نے قلم اُٹھا کر سلسلہ وار کہانیوں میں اک نئی روح پھونکی، تو اب آ کر کچھ اُمید بندھی ہے کہ ''جان لیوا'' ایک زوردار، دھماکے دار کہانی ثابت ہوگی۔ اس کی پہلی قسط پڑھنے کا اتفاق ہوا اور پہلی قسط کی اُٹھان سے معلوم ہوگیا کہ کہانی قابل توجہ ہے۔ امید ہے کہ فلک زاہد صاحبہ اپنا قلم اُٹھائیں گی اور ایس حبیب خان صاحبہ بھی، تو مزا آ جائے گا۔ اور ہاں ایس حبیب خان صاحبہ کی امی جان کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ زندگی بس انہیں آزمائشوں کا نام دکھائی دیتی ہے۔ احسان الحق صاحب کی کہانیوں کا بھی منتظر ہوں۔ اللہ پاک آپ کو اور سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ سب کو سلام۔

☆☆ شاہد صاحب: جان لیوا اچھی کہانی ہے امید ہے آپ کو پسند آئے گی اور دیگر رائٹرز بھی اپنے چاہنے والوں کی خوشی کے لئے قلم اٹھائیں گے۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

میاں یاور حسین اسلام آباد سے، السلام علیکم انکل! فروری کے ڈر نے مجھے بہت سی خوشیاں بھی دیں اور کچھ غم بھی۔ پہلے غموں پر بات کرلوں۔ راشد نذیر طاہر کی اہلیہ کا انتقال اور شیخ عمر دین صاحب کا انتقال ہوا جس پر میں غمگین ہوگیا، اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ خطوط میں ایس حبیب خان باجی کی امی کی صحت کے متعلق پڑھا اور نمازوں میں دعا کرتا ہوں کہ وہ بھی جلد ٹھیک ہو جائیں، آمین۔ انکل پڑھائی کا لوڈ ہے ایم ایس سی کے پیپرز ہیں لیکن راشد نذیر طاہر صاحب کے قلم سے لکھی کہانی ''جان لیوا'' کی پہلی قسط نے دل خوش کر دیا جس پر میں پرسٹلی رائٹر اور ڈر کی ٹیم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مریم فاطمہ کی روح کی دوستی اور صائمہ شاہد کی روح کا انتقام بھی پسند آئیں۔ ایک خوشی یہ ہوئی کہ انکل احسان الحق کی کہانیاں بھی جلد آنے والی ہیں۔ میں ان کی کہانیوں کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔ ڈائجسٹ کا سرورق بھی عمدہ تھا۔ بہت شکریہ۔

☆☆ یاور صاحب صاحب: ویری تھینکس کہ آپ کو جان لیوا پسند آگئی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں پر اپنا فضل و کرم رکھے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کے لئے دعا گو ہیں کہ آپ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں۔

طارق محمود کامرہ اٹک سے، السلام علیکم رسالہ بہت ہی اچھا جا رہا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دن دگنی رات چوگنی ترقی سے نوازے۔ آمین۔ خطوط کی محفل میں خوب رنگ تھا ہر کسی کی اپنی پسند اپنا انداز ہوتا ہے جن لوگوں نے میری تحریریں پسند کیں بہت شکریہ اور جو لوگ تحریر اچھی نہیں سمجھتے ان سے عرض ہے کہ اپنی تحریر کو بہتر بنانے کے لئے مزید محنت اور پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی کہانیوں کو بہتر سے بہتر بناؤں اس ماہ ''شیطان'' کہانی بہت اچھی تھی۔ نئی شروع ہونے والی کہانی نے پہلی قسط سے جکڑ سا لیا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اچھی سلسلہ وار کہانی ہے چلانے کا انداز اور کہانی کا پلاٹ جاندار ہے۔ باقی کہانیاں بھی خوب تھیں۔ میرا تبصرہ اور کہانیاں کچھ لیٹ موصول ہو رہی ہیں۔ طبیعت خراب رہنے لگی ہے دعاؤں کا طلب گار ہوں۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو خوشیوں سے نوازے اور مکمل صحت عطا فرمائے۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

خالد عباس ننکانہ صاحب سے، السلام علیکم! فروری کے شمارے میں خط شائع ہونے پر بہت خوشی ہوئی، اس بار سرورق نہایت عمدہ لگا، تبصروں میں مسز زینت خان، خدیجہ فاطمہ، مسز فرحین حامد، ایس حبیب خان، مسز سندا اقبال، نیٹا خان، رشک نور، فاطمہ خان، مریم خان، محمد حنیف شاکر، ڈاکٹر رانا عامر شہزاد نے خوب تبصرے لکھے، کہانیوں میں روح کا انتقام، سیکنڈ فلور، شیطان، روح کی فریاد، محمد حنیف شاکر کی آسیبی مسکن، روح کی دوستی بہت اچھی ثابت ہوئیں، زاہد حنا، ریحانہ شاہد، ڈاکٹر رانا عامر شہزاد، سنبل

ماہین، نینا خان، ماریہ، قاسم رحمان، کائنات رشک، محترم محمد حنیف شاکر، فروا تنویر، رابعہ آفرین، اقرا تبسم، رابعہ عباس، فلک زاہد اور رابعہ امانت نے بہترین اشعار اور غزلیں لکھیں محترم ایڈیٹر صاحب میری تمام نیک تمنائیں ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ ہیں اور میں ڈاکٹر عامر شہزاد کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے ڈر ڈائجسٹ سے منسلک کردیا اگر آپ کا تعاون اور حوصلہ افزائی ملی تو ہمیشہ ڈر ڈائجسٹ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا۔ اگلے مہینے تک خدا حافظ۔

☆☆ خالد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، رسالہ اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط ارسال کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

گلاب خان سولنگی کشمور سے، السلام علیکم! خطوط کی محفل میں ایس حبیب، ایڈووکیٹ نینا خان، بتول فاطمہ، احسان الحق کے خطوط شاندار تھے۔ کہانیوں میں نیند، سنگ چور، بھوت بہت اعلیٰ تھیں۔ نینا خان کی حاسد ایک معیاری حقیقت کے قریب اور زبردست تحریر تھی۔ عمران قریشی ویلڈن، خلیل جبار کی کالا ناگ بہت اعلیٰ تحریر تھی۔ اشتیاق احمد کی چڑیل معیاری تھی۔ شاعری میں محمد اسلم جاوید، ایس حبیب، ایڈووکیٹ نینا خان، عروج ماہین، فلک زاہد، کائنات رشک وغیرہ کی شاعری خوب سے خوب تر تھی۔ قسط وار کہانیاں بھی خوب صورت، معیاری اور ڈر کے فارمیٹ کے مطابق ہیں۔ شاہد بھائی! آپ کی صحت کے بارے میں سنا، خدا آپ کو شفایاب کرے، جبکہ آپ کے ادارے کو ماہنامہ خوفناک کہانیاں نکالنے پر مبارکباد۔

☆☆ گلاب خان صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر اچھا لگا۔ نئی کہانی بھیجئے اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ

میاں پرویز احمد دولو میاں چنوں سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں، آپ بے شک مجھے حکم دے سکتے ہیں، میں اس کو ماننے کا پابند ہوں۔ جناب احسان الحق صاحب کی بے پایاں عنایات پر ممنون ہوں، ہمیشہ حوصلہ اور ڈھارس بندھا کر اچھے بنے پڑھنے لکھنے کا جذبہ اجاگر کرتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے میں دیر سویر اس لئے ہو جاتی ہے کہ یہ زندگی بہت مقروض ہے، ادائیگیوں کے سلسلے میں بعض اوقات دیر ہو جاتی ہے۔ اس لئے حاضر ہونے سے قاصر ہو جاتا ہوں۔ کوشش تو کرتا ہوں کہ حاضر ہوتا رہوں۔ مگر کبھی کاہلی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ زندگی کا ساتھ رہا تو آئندہ شکوہ کا موقع نہیں دوں گا۔ تمام ڈر کے ادیبوں اور قارئین کا شکرگزار ہوں، ان کی وجہ سے مجھے اچھا ادب پڑھنے کو مل رہا ہے۔ خوف و ہراس میں سبق آموز واقعات کبھی تو مشعل راہ بن کر من کی تاریکی کو دور کر دیتے ہیں۔ بہت سی پرخلوص دعائیں آپ سب پیاروں کے نام۔

☆☆ پرویز صاحب: آپ کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ بہر حال آپ کی محبت قابل دید ہے، دنیا میں سب کچھ رہ جاتا ہے، انسان کے ساتھ صرف اور صرف اس کا عمل جاتا ہے۔ میں اکثر سب کے لئے دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل وکرم رکھے۔ آئندہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

محسن عزیز حلیم کوٹھاں کلاں سے، السلام علیکم تمام ڈر اسٹاف ریڈرز اینڈ رائٹرز کو ہماری طرف سے محبت بھرا اسلام، فروری کا شمارہ اس بار لیٹ موصول ہوا۔ سرورق بہت بیسٹ تھا۔ "قرآن کی باتیں" اس بار زیادہ تھیں۔ ویری گڈ، راشد نذیر طاہر کی اہلیہ کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا اور شیخ عمر دین کا بھی اللہ تعالیٰ جتنے بھی مسلمان فوت ہو گئے ہیں۔ سبھی کی مغفرت فرمائے آمین۔ اس جنوری میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا بہت دل دہلا دینے والا ہے۔ اسپتال میں جب میرے آپریشن کی باری آئی تو..... جنات نے مشین خراب کردی تو میری کنڈیشن بہت خراب تھی اور جب گھر لے کر آئے تو دم وغیرہ کروایا میرے جنات مشتعل ہو گئے اور پھر غصے میں انہوں نے مجھ پر ایسے ظلم کے پہاڑ توڑے کہ بیان سے باہر ہے۔ سات دن تو مسلسل اذیت میں رہا میری چیخیں سن کر سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا تھا اور سبھی یہی کہتے تھے کہ محسن نہیں بچے گا مجھے تو ہوش ہی نہیں رہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ گھر والوں کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اب تو کافی حد تک طبیعت سنبھل گئی ہے۔ اس دفعہ شمارہ بھی آدھا ہی پڑھا ہے۔ روگ عاشقی محمد شعیب ویری نائس، سیکنڈ فلور بتول فاطمہ ویری گڈ، روح کی فریاد فاطمہ خان واؤ زبردست محنت جاری رکھیں۔ آسیبی مسکن، حنیف شاکر کیا زبردست کہانی بور نہیں ہونے دیا، آپ بہت زبردست لکھتے ہیں گڈ، روح کی دوستی، مریم فاطمہ ویری گڈ سسٹر آپ تو ڈھیرے ڈھیرے چھاتی جا رہی ہیں۔ خوف کا سایہ گلاب خان سولنگی اب آپ کی کیا بات کریں، تھوڑے ہی عرصے میں آپ نے ہمیں اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔

ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ محسن عزیز صاحب: یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کامل صحت عطا کرے اور پل پل خوشیوں کے پالنا میں جھلائے، خوش ہو جایئے، بکتک ناگن بھی جلوہ گر ہوگئی ہے۔ اگر صحت اجازت دے تو دیگر ممبر کے لئے سوچ لیجئے گا۔ Thanks۔

محمد حنیف شاکر ننکانہ صاحب سے، السلام علیکم! سلام کے بعد خیریت کا طالب اللہ کے فضل وکرم سے خیریت سے ہے آپ کی خیریت کے لئے خداوند قدوس سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دکھوں، مصیبتوں، تکلیفوں، پریشانیوں اور ہر طرح کے ڈپریشن سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ 23 جنوری کو جب ڈر ملا تو اسے دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے کھول کر معائنہ کیا چند منٹ میں ہی جائزہ لے لیا۔ اپنی غزل کو دیکھا۔ لیٹر بھی نظروں سے گزرا اور کہانی "آسیبی مسکن" بھی نگاہوں میں آئی۔ اس کے لئے شکریہ۔ قوس قزح میں خوب رنگ بکھرے نظر آئے۔ غزل کی دنیا میں قدم رکھا تو سب ہی غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لیکن "ماریہ نشا" "رابعہ آفرین" "نینا خان" اور ڈاکٹر رانا عامر شہزاد کی غزلیں دل کی گہرائی میں اتر گئیں۔ خطوط کی محفل بھی خوب جمی ہوئی نظر آئی۔ اس محفل میں نئے چہرے ماسٹر خالد عباس کو "خوش آمدید" کہانیوں کی مجلس میں آئے تو طارق محمود کی "بھوت گلی" محمد شعیب کی "روگ عاشقی" رضوان قیوم کی "جناتی آتما" بتول فاطمہ کی "سیکنڈ فلور" اور فاطمہ خان کی "روح کی فریاد" بہت عمدہ اسٹوریاں ہیں۔ صائمہ شاہد کی "روح کا انتقام" بھی ایک منفرد اسٹوری ہے۔ جناب رضوان علی سومرو کی "کفارہ" اپنی مثال آپ ہے۔ اچھی کہانی لکھنے پر آپ کو خوب داد دیتا ہوں۔ ملک این اے کاوش کی "کالا جادو" بہت خوب رہی۔ آخر میں ادارہ کے تمام اسٹاف کو اور سب قارئین کو بہت بہت سلام اور ڈر کی ترقی کے لئے بے شمار دعائیں۔

☆☆ حنیف صاحب: فروری کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر اور پڑھ کر آپ کو اچھا لگا اس کے لئے شکریہ قبول کریں، کہانی شامل اشاعت ہے، میں نے نام تبدیل کر دیا ہے۔ اگر پسند نہ آئے تو اس کے لئے معذرت، خیر کہانی کا نام کیا ہوتا ہے اصل نام تو رائٹر کا اہم ہوتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں، اگلے ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولئے گا۔ Thanks۔

محمد شمیر بوسن راجن پور سے، السلام علیکم! میں ڈر ڈائجسٹ کے تمام قارئین کو تہہ دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔ جناب میں ڈر ڈائجسٹ کا نیا لکھاری ہوں۔ ہاں البتہ ڈائجسٹ کو ایک سال سے پڑھ ضرور رہا ہوں۔ میں راجن پور کا رہائشی ہوں۔ ہمارے قصبے میں اتنے بک اسٹال تو نہیں ہیں جہاں سے ڈر ڈائجسٹ یا دوسرے رسالے خریدے جاسکیں۔ البتہ خانپور جہاں میں پڑھنے جاتا ہوں ایک بک اسٹال ہے، جہاں سے 15 تاریخ یا 10 تاریخ کو جا کر ڈر ڈائجسٹ مجھے ملتا ہے۔ اپریل 2017ء کا ڈر میں نے پہلی دفعہ پڑھا۔ مجھے خوفناک کہانیوں کے تیز سسپنس سے بھرپور ریلے بہا کے لے گئے۔ میں حیران ہو کر رہ گیا۔ مجھے ماننا پڑا کہ آج کے جدید ترین ٹیکنالوجی کے حیرت انگیز دور میں واقعی ڈر ڈائجسٹ منفرد اور نایاب ڈائجسٹ ہے۔ میرے پسندیدہ ڈائجسٹ کے رائٹر یہ ہیں۔ ایس حبیب صاحب، ضرغام محمود، احسان الحق، ایس امتیاز احمد، محمد شعیب اور اے وحید صاحب ان سب کو میرا سلام۔ واقعی یہ سب جاندار کہانیاں لکھتے ہیں۔ ویلڈن بہت اچھا۔ اگر میرے خط کو شائع کیا گیا تو اس کے بعد میں اچھی کہانی ضرور ادارے کو ارسال کروں گا۔

☆☆ محمد شمیر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، ڈر ڈائجسٹ اور اس کی کہانیاں دل کو بھا گئیں، اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔ بروقت ڈائجسٹ پانے کے لئے سالانہ خریدار بن جائیں تو اچھا رہے گا۔ چلئے خط شائع ہو گیا اب حسب وعدہ کوئی اچھی سی کہانی بھیج دیں۔ Thanks۔

خضر حیات روڈہ تھل سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں سب لوگ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سدا خوش رکھے۔ فروری کا شمارہ ایک خوب صورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 25 جنوری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت بہت خوب صورت اور دلکش تھا۔ اس نے پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیئے۔ شمارہ ایک طرف اور ٹائٹل ایک طرف۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ ہر لحاظ سے ہر طرح سے بہت زبردست اور اچھا تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، عمدہ اور اچھی اور ساتھ ساتھ خوفناک اور پراسرار بھی تھیں۔ سب کہانیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ فلاں کی اچھی تھی۔ فلاں کی بری تھی تو

یہ بالکل زیادتی ہوگی۔ سب نے بہت بہت اچھا لکھا۔ قوس قزح میں شاعری نے تو پورے شمارے کا مزہ ہی دوبالا کردیا۔ غزلوں نے تو خوب رنگ جمایا۔ سب غزلیں بہت عمدہ اور اچھی تھیں۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر دل اور بھی خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ اب اجازت، زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ انہی صفحات کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ دعا ہے ڈر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ خضر حیات صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر اچھا لگا، ہماری دلی دعا ہے کہ آپ سمیت تمام قارئین و رائٹرز حضرات پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔ صحت دے، ترقی دے، آئندہ ماہ بھی خط ضرور لکھئے گا۔

محمد دانیال روڑ وتھل سے، فروری 2018ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، میرا ڈر میں یہ پہلا خط ہے۔ امید کرتا ہوں جگہ دے کر خوش آمدید کہیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ میں نے پہلی بار ڈر لیا۔ پہلی بار پڑھا پہلی بار ہی اچھا لگا اور پہلی بار میں ہی خط لکھ رہا ہوں۔ یہ بہت اچھا شاندار ڈائجسٹ ہے۔ یہ مجھے بہت ہی اچھا لگا ہے۔ کیونکہ اس میں ہر چیز موجود ہے۔ یہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ میں نے جب شاعری اور غزلیں پڑھیں تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میں شعر اور غزل بھیج رہا ہوں۔ پلیز مارچ کے شمارے میں ضرور لگا دیجئے گا۔ میں کالج کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں نے کبھی بھی کسی ڈائجسٹ میں نہیں لکھا۔ یہ پہلا موقع ہے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا رسپونس دیتے ہیں۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ اب تک کے لئے اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ انہی صفحات کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ دعا ہے ڈر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ دانیال صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، لیجئے حوصلہ افزائی ہوگئی لہٰذا اب حسب وعدہ ہر ماہ اپنی اچھی اچھی تحریر ارسال کیا کریں۔ Thanks۔

عبدالجبار رومی قصور سے، ڈراؤنے ٹائٹل کے ساتھ ڈر کا خوب صورت شمارہ سامنے ہے، کہانیوں میں شیطان پڑھی مغرب سے درآمد اچھی کہانی تھی، سوسن خود ہی شیطان تھی، اس نے اپنا آپ بھی داؤ پر لگا دیا تھا، ویران بھوت گلی تو شادو کے ڈویشن سے آباد ہوگئی، لیکن عاطف کی مانگ سے شادی کا سن کر شادو کا دل ویران ہوگیا، طارق محمود کی کہانی عمدہ رہی۔ سمیر مرنے کے بعد بھی سائرہ سے عاشقی نبھاتا رہا مگر سائرہ اسے نہ سمجھ سکی تھی۔ اب جب کہ ساری حقیقت سائرہ پر منکشف ہوئی تو تب بہت دیر ہوچکی تھی۔ روگ عاشقی نے بھی اچھا تاثر دیا۔ روح کی فریاد میں کیٹ کا کمرے میں جانا تھا اور مظلوم کیلا کو انصاف ملنا تھا یوں کیتھی اور اسلیلا اپنے انجام کو پہنچیں۔ فاطمہ خان کی کہانی اچھی لگی۔ جانور انسان کے ملاپ سے جنم لینے والی انوکھی کہانی اچھی تھی جس نے رونگٹے کھڑے کردیئے۔ خوف کے سائے میں فلم بھی مکمل ہوگئی اور کہانی بھی مکمل ہوئی واہ کیا ڈراؤنی فلم تھی اور ایک سے بڑھ کر ایک سین خوف کے سائے بہت اچھی لگی۔ کفارہ میں زبیر کو کالا نانے اپنے لئے استعمال کیا اور بھیانک واقعات سامنے آتے گئے جس کی وجہ سے اس کا بھائی عمیر اور ہالو بھی ان مافوق الفطرت واقعات کی ضد میں رہے آخر زبیر نے اپنے کیئے کا کفارہ ادا کیا اور کالا نا سے سودا کرلیا اور ہمیشہ کے لئے غائب بھی ہوگیا یوں ہالو اور عمیر خوش تو ہوئے مگر اپنے بھائی کو کھو دیا عمدہ کہانی تھی۔

☆☆ عبدالجبار صاحب: کہانی وہ اچھی ہوتی ہے جو دل کو بھائے اور وہ حقیقی لگے، ڈر کے رائٹر حضرات لگن اور محنت شاقہ سے کہانیاں لکھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں خوشیوں سے نوازے۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

شہباز احمد ایبٹ آباد سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے تمام لکھاری و قاری اور ادارے والے خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ فروری کا شمارہ اپنے ٹائم پر مل گیا تھا ٹائٹل اچھا تھا۔ میری ڈر انتظامیہ سے گزارش ہے کہ ٹائٹل صرف اور صرف ہارر ہی ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں اس کے بعد خطوط پڑھے، ایس حبیب صاحبہ اور محمد حنیف شاکر صاحب اور ادارے والوں کا شکریہ کہ انہوں نے میرے ابو جان کے لئے دعائے مغفرت کی اور لواحقین کے لئے صبر جمیل کی دعا کی، کہانیوں میں ابھی صرف قسط وار کہانیاں پڑھی ہیں جو کہ بہت اچھی جا رہی ہیں۔

☆☆ شہباز صاحب: کہانیوں اور رسالے کی تعریف کے لئے تھینکس ویسے تو ٹائٹل ہر ماہ ہارر ہوتا ہے، اور پھر ڈائجسٹ پڑھنے والے بے شمار لوگ ہیں، ہر آدمی کی پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ خیر اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجئے گا۔

ڈاکٹر عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! 23 جنوری کو ڈیوٹی سے واپس گھر آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکیہ ڈائجسٹ دے گیا ہے تو خوشی سے دل باغ باغ ہوگیا۔ تبصروں میں مسز زینت خان، خدیجہ فاطمہ، مسز

فرحین حامد، ایس حبیب خان، مسز سندس اقبال، گریٹ نینا خان، رشک نور، فاطمہ خان، محترم احسان الحق، محمد شعیب، مہر پرویز احمد، خالد عباس اور ہر دلعزیز محمد حنیف شاکر لاجواب رہے۔ کہانیوں میں ایس امتیاز احمد کی "شیطان" صائمہ شاہد کی "روح کا انتقام" محمد شعیب کی "روگ عاشقی" بتول فاطمہ کی "سیکنڈ فلور" فاطمہ خان کی "روح کی فریاد" ملک این اے کاوش کی "کالا جادو" محمد حنیف شاکر کی "آسیبی مسکن" گلاب خان سولنگی کی "خوف کا سایہ" مریم فاطمہ کی "روح کی دوستی" اور رضوان علی کی "کفارہ" بیسٹ ثابت ہوئیں، دیگر رائٹرز نے بھی بہت اچھی کہانیاں لکھیں، قوس قزح میں زاہدہ حنا، ایس حبیب خان، شرف الدین جیلانی، ریحانہ شاہد، خالد عباس اور عمر دراز نے اچھے اشعار لکھے۔ غزل میں ایس حبیب خان، محمد سلیم جاوید، سنبل ماہین، ڈاکٹر واجد، ماریہ نشا، گریٹ نینا خان، کائنات رشک، فروا تنویر، محمد حنیف شاکر، اقرا تبسم، رابعہ عباس، رابعہ امانت اور فلک زاہد نے عمدہ غزلیں لکھیں، اس کے علاوہ یوتا سنگھ، الطاف ملا اور ذکا اللہ بھٹی نے بھی اچھی کاوش کی میری ساحل دعا بخاری سے درخواست ہے کہ آپ بھی کسی بہترین کہانی کے ساتھ ڈر میں حاضری دیں، آپ کی تمام تحاریر بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ ماشاء اللہ تمام رائٹرز بہت لگن سے لکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحت اور تندرستی عنایت فرمائیں، خیر دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ خوب ترقی کرے، آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ عامر صاحب: خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور شاعری کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، خوش ہو جایئے، کہانی شامل اشاعت ہے۔ اور ہاں ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر ارسال کیجئے گا۔ یعنی خط کے پیچھے اشعار یا غزل نہ لکھا کریں۔ آئندہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

محمد خالد شاہان صادق آباد سے، ان گنت نیک دلی تمناؤں، خواہشوں اور محبتوں کی پرچھائیوں میں ادارہ ہذا اور قارئین کے لئے بندہ ناچیز کی طرف سے تحفہ سلام قبول ہو۔ ڈر ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ ہاتھ آیا تو سرورق کی تصویر نے بتایا کہ اس بار لکھاری حضرات کافی پراسرار اور ڈراؤنی کہانیوں کے ساتھ حاضر ہو جائے ہیں اور ورق گردانی کرتے وقت اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ المختصر ڈر ڈائجسٹ کے اس تازہ شمارے نے حق ادا کردیا۔ دوسری طرف ڈر ڈائجسٹ کے خصوصی تعاون اور علمی ادبی فاؤنڈیشن، ڈیرہ اللہ یار بلوچستان ہونے والی شاندار اور ناقابل فراموش تقریب نے سونے پر سہاگہ کردیا۔ میں یہ بات کہے بنا نہیں رہ پا رہا کہ جس تنظیم، ادارے یا فاؤنڈیشن میں ساحل ابڑو، جیسا کم عمر، بلند حوصلہ، محنت کش اور مخلص انسان شامل ہو وہ ادارہ کامیابیوں کی بلندیوں کو راتوں رات چھو لیتا ہے۔ سینکڑوں مہمان مجمع میں موجود تھے۔ کتنی ہی عظیم شخصیات جن کے آج تک بس نام سنے تھے نہ صرف ان کے درشن نصیب ہوئے بلکہ ان کے ساتھ اچھا وقت گزارنے کا موقع میسر آیا اور جب معلوم ہوا کہ بندہ ناچیز کو ادبی ایوارڈ کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں موجود ادیبوں، شعراء، کالم نگاروں میں ڈر ڈائجسٹ کے لکھاریوں سے مل کر خوشی دوبالا ہوگئی۔ خاص الخاص ملک این اے کاوش اعوان سرگودھا کو دیکھ کر حقیقت میں حیرت و خوشی ہوگئی۔ تقریباً سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کی مسلسل طوالت کے بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ ملک صاحب کے ساتھ ناقابل فراموش وقت گزرا۔ ہنسی خوشی وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور جب تقریب کا اختتام ہوا تو سب کے چہرے مرجھا گئے تھے۔ کوئی بھی جدا ہونے کو تیار نہ تھا۔ ساحل ابڑو صاحب نے جیسے سب کو لا کر ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا تھا اس کے لئے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ آخر میں ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں اور علمی ادبی فاؤنڈیشن کے وائس چیئرمین ساحل ابڑو کا بے حد مشکور ہوں کہ جنہوں نے سب کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرکے انہونی کو ہونی کر دکھایا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ "ہمت مرداں مدد خدا" کے مصداق بس انسان ارادہ کرلے آسانیاں اللہ خود بخود پیدا کرتا ہے بس یقین کامل ہو جانا چاہئے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ساحل ابڑو صاحب اور ان کی ٹیم کی اس کاوش کو قبول کرے اور ادبی خدمات سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ والسلام۔

☆☆ خالد شاہان صاحب: یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی نیک ارادے سے اچھا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ عزت دیتا ہے اور پھر ایسا شخص ہر دل عزیز بن جاتا ہے آپ کو عزت ملی ڈر ڈائجسٹ کے تھرو یہ بہت بڑی بات ہے۔ محنت شاقہ سے آگے بڑھتے رہیں مزید کامیابی قدم چومے گی۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ترقی دے اور خوشیوں سے نوازے اور مزید ہر دلعزیز بنادے۔ (آمین)

☆☆



کالی ماتا کا پجاری

ضرغام محمود۔کراچی

صدیوں پر محیط ایک آتما کی دیدہ دلیری اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس خاندان کے ہر فرد کو نیست و نابود کرے گی اور پھر وہ کمربستہ ہوگئی تو خاندان والے انگشت بدنداں ہوگئے کہ......

لفظ لفظ اور سطر سطر......خوف وہراس کے سمندر میں غوطہ زن......خوفناک کہانی

"**بھوت** کیا ہے؟ اکثر یہ سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے دنیا میں لوگوں کی بڑی تعداد بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتی ہے لیکن دنیا کے مختلف معاشرے میں بھوتوں کی ماہیت اور ان کے کردار پر نظریات مختلف ہیں کئی ترقی یافتہ ممالک میں بھوتوں کے وجود کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کہ آیا بھوتوں کا وجود ہے یا نہیں۔۔۔۔ یہ سب معلوم کرنے کے لئے سائنسی آلات کی مدد لی گئی ہے ان آلات سے بھوتوں کے وجود کے بارے میں مثبت جواب ملا ہے۔"

"بھوتوں کے وجود پر یقین رکھنے والے اور بھوتوں کے وجود کو افسانہ قرار دینے والے کروڑوں افراد اس دنیا میں رہتے ہیں کچھ لوگ بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں تو کچھ لوگ بھوتوں کی وجود کے انکاری ہیں مگر۔۔۔ مگر یہ سب لوگوں کی خواہش ہے کہ کہیں سے انہیں الہ دین کا چراغ مل جائے تا کہ وہ چراغ کے جن یا بھوت کو قابو کر کے اپنی زندگی کی مشکلات حل کرسکیں۔"

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا اور میں نے ایک طائرانہ نظر حاضرین پر ڈالی سب لوگ خاموشی سے بیٹھے میری تقریر سن رہے تھے، میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر اپنی تقریر جاری رکھی۔

"اکثر معاشرے میں یہ بات مشہور ہے کہ انسانی روحیں ہی اصل میں بھوت ہوتی ہیں مرنے کے بعد انسان کی روح دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے مگر کسی سے شدید محبت یا کسی سے شدید نفرت اور انتقام کی خواہش کی تکمیل کے لئے روح اپنی دنیا کا اصول توڑ کر واپس ہماری دنیا میں آجاتی ہے۔

اکثر عاملوں کا خیال ہے کہ روح ازخود کچھ نہیں کرسکتی اسے اپنا مشن مکمل کرنے کے لئے کسی انسان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ روح کسی انسان کو اپنے تابع کر کے اس سے اپنا مشن مکمل کرواتی ہے مگر روح ہر انسان پر قبضہ نہیں کرسکتی روح اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے صرف ایسے انسان کو ہی قابو کرسکتی ہے جو روحانی طور پر کمزور ہوتا ہے۔

بھوتوں کی تصویریں اور وڈیو بڑی تعداد میں انٹرنیٹ پر موجود ہے اکثر وڈیو بناتے ہوئے یا تصویر وغیرہ کھینچتے ہوئے ان وڈیوز اور تصویروں میں غیر مرئی مخلوق یعنی بھوتوں کی شبیہ آجاتی ہے جس کا احساس بعد میں وڈیو یا تصویر دیکھنے کے بعد ہوتا ہے۔

جنات کا وجود تو قرآن سے ثابت ہے لیکن بھوت پریت، چڑیل اور مکمل پیری وغیرہ کے وجود کے

لئے ہمیں مختلف معاشرے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ میں یہاں صرف روح کے وجود کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ اکثر روحیں اپنی دنیا سے نکل کر ہماری دنیا میں آجاتی ہیں اس میں کچھ نیک روحیں ہوتی ہیں اور کچھ بری روحیں جنہیں ہم بدروح کہتے ہیں اور یہی بدروحیں اس دنیا کے زندہ انسانوں کو تنگ کرتی ہیں اور انسان کے لئے مسئلہ بن جاتی ہیں ان روحوں کو قابو کرنے اور واپس اپنی دنیا میں بھیجنے کے لئے ماہر عاملوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

تقریر کے آخر میں، میں آپ کو یہ بتادوں کہ غیر مرئی مخلوقات جیسے روح، بھوت، جن وغیرہ کافی امن پسند ہوتے ہیں وہ بلاوجہ کسی کو تنگ نہیں کرتے مگر جس طرح انسانوں میں کچھ انسان شرپسند ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ان مخلوقات میں بھی کچھ شرپسند ہوتے ہیں جو انسانوں کو تنگ کرکے مزا لیتے ہیں۔ یہی شرپسند مخلوقات انسانوں کے لئے مسائل پیدا کرتے ہیں مگر ان کے تعداد کم ہیں۔ لہٰذا ان مخلوقات سے ڈرنا یا انہیں بلاوجہ تنگ کرنا اچھی بات نہیں ہے اس کائنات میں خدا نے سب مخلوقات کا اپنا دائرہ کار رکھا ہے اور تمام مخلوقات بشمول انسانوں کے سب کو اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اسی طرح ہم اپنی زندگی سہل بناسکتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر میں نے اپنی تقریر ختم کی اور ڈائس سے ہٹ گیا، اس کے بعد پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا میں تحسین آمیز نظروں سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہوئے اسٹیج کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں ہنزہ ویلی کے ایک کمیونٹی ہال میں بھوتوں کے وجود کے حوالے سے تقریر کررہا تھا، میں کل ہی ہنزہ ویلی آیا تھا یہاں آنے کی دعوت مجھے میرے استاد نما دوست جناب نیاز علی فخری نے دی تھی نیاز علی نہ صرف میرے دوست تھے بلکہ وہ میرے استاد بھی تھے انہوں نے ہی میرے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچانا اور میری صلاحیتوں کو نکھارا نیاز علی پہلے میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آبائی علاقے ہنزہ میں شفٹ ہوگئے اور یہاں انھوں نے غیر انسانی مخلوقات یعنی بھوت پریت وغیرہ پر ریسرچ شروع کی ساتھ ہی انہوں نے ایک NGO بھی بنائی جو ایسے واقعات کا نوٹس لیتی ہے جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہے۔

نیاز علی کی NGO نے ہی یہ سیمینار منعقد کیا تھا اور نیاز علی نے خود مجھے فون کرکے اس سیمینار میں مدعو کیا لہٰذا میں انہیں انکار نہیں کرسکا اور ہنزہ ویلی آگیا۔

"سر آٹوگراف پلیز" جیسے ہی میں اسٹیج سے نیچے اترا ایک لڑکی نے آٹوگراف میری جانب بڑھائی میں نے مسکرا کر اس سے آٹوگراف بک لی اور اس پر اپنی دستخط کرکے آٹوگراف بک اس لڑکی کو واپس کی۔

"سر پلیز ایک تصویر۔۔" ایک اور آواز ابھری اور پھر ہر جانب سے آٹوگراف اور تصویروں کی فرمائشیں شروع ہوگئیں میں خندہ پیشانی کے ساتھ آٹوگراف دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ تصویریں بھی بنوا رہا تھا۔

"سر۔۔ سر اوصاف" مجھے ایک جانی پہچانی آواز آئی تو میں نے گھوم کر آواز کی سمت دیکھا مجھے آواز دینے والا نیاز علی کا شاگرد جنید تھا۔

"ہاں جنید۔۔ کیا بات ہے" میں تمام لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے جنید کی جانب بڑھا۔

"سر آپ کو نیاز سر یاد کررہے ہیں" جنید نے کہا تو میں نیاز علی کی جانب چل دیا۔

نیاز علی اسٹیج سے کچھ دور ہال کے ایک گوشے میں ایک اٹھائیس تیس سال کے نوجوان کے ساتھ کھڑے تھے اور دونوں باتیں کررہے تھے۔

"سر آپ نے یاد کیا؟" قریب پہنچنے کے بعد میں نیاز علی سے ادب سے مخاطب ہوا نیاز علی میرے کولیگ تھے مگر عمر اور تجربے میں مجھ سے بڑے ہیں لہٰذا میں ان کا ادب کرتا ہوں اور انہیں سر کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔

"اوصاف۔۔ آؤ۔ آؤ" نیاز علی میری جانب

دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"ظفر یہ ہے پروفیسر اوصاف علی ہمدانی جن کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔۔" نیاز علی نے میرا تعارف اپنے ساتھ کھڑے نوجوان سے کرایا۔

"اوصاف یہ ظفر علی شیرازی ہے۔" نیاز علی نے اس نوجوان کا تعارف بھی مجھ سے کرایا تو میں نے گرمجوشی کے ساتھ ظفر کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"اوصاف۔۔۔ ظفر کی بیوی کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے پلیز تم دیکھ لو۔۔" نیاز علی نے ہم دونوں کا آپس میں تعارف کرانے کے بعد کہا۔

"سر جیسا آپ کا حکم۔۔" میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مسئلہ ہے آپ کی وائف کا؟" نیاز علی کو جواب دینے کے بعد میں نے براہ راست ظفر سے پوچھا۔

"سر بات کچھ لمبی ہے اگر کہیں بیٹھ کر بات کرلی جائے تو بہتر ہوگا" ظفر احترام کے ساتھ بولا۔

"اوکے ایسا کرو کل صبح مجھے ہوٹل میں مل لو۔۔ میں ہوٹل ڈی فرانس کے کمرہ نمبر 111 میں ٹھہرا ہوں" میں نے ظفر سے کہا تو وہ سر ہلانے لگا اسی وقت اسٹیج سے سر نیاز علی کے نام کی پکار لگی تو نیاز علی ہم دونوں سے معذرت کرتے ہوئے اسٹیج کی جانب چل دیئے۔

اگلی صبح میں جلدی بیدار ہوگیا نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور ہنزہ ویلی کی خوبصورتی کو دیکھنے کی غرض سے ہنزہ کی سڑکوں پر گشت کرنے لگا ہنزہ ویلی واقعی کافی خوبصورت جگہ ہے اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی ہنزہ ویلی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے ہر جانب ہریالی ہی ہریالی تھی خوبصورت شفاف پانی کی جھیلیں اور جھیل کے کنارے کھلے رنگ برنگی پھول خوبصورت نظارہ دے رہے تھے دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی سفید سفید برف دل فریب نظارہ پیش کر رہی تھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اترتی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جب گالوں سے ٹکراتی تو پورے جسم میں ایک پرلطف احساس جاگزیں ہو جاتا میں ان نظاروں سے لطف اندوز ہورہا تھا کافی دیر تک میں ہنزہ کے خوبصورت نظاروں کی سیر کرتا رہا اور اللہ کی صناعی کی داد دیتا رہا۔ سیر کرنے کے بعد جب میں واپس ہوٹل پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر ظفر علی شیرازی کھڑا میرا انتظار کررہا ہے مجھے دیکھتے ہی ظفر نے اپنا ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کیا میں سیدھا ظفر کے پاس پہنچا میرے قریب پہنچتے ہی ظفر نے مجھے سلام کیا۔

"سیر کرتے ہوئے ذرا آگے نکل گیا تھا۔۔ ہنزہ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے" ظفر کے سلام کا جواب دینے کے بعد میں نے کہا۔

"جی سر۔۔ ہنزہ واقعی خوبصورت جگہ ہے میں بھی پہلی بار ہنزہ آیا ہوں" میری بات سن کر ظفر نے کہا۔

"آپ یہاں کے مقامی نہیں ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں سر میں لاہور سے آیا ہوں" ظفر نے جواب دیا تو میں سر ہلانے لگا۔

"چلو۔ کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" میں نے ظفر سے کہا اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے چائے اپنے کمرے میں بھیجنے کا کہہ کر میں نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے میرے ساتھ ظفر بھی قدم بقدم چلنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے ظفر کو بیٹھنے کا کہا اور خود واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہوکر جب میں واش روم سے باہر نکلا تو بھاپ اڑاتی چائے میز پر رکھی تھی میں نے چائے کا ایک کپ اٹھا کر ظفر کو دیا اور خود دوسرا کپ لے کر ظفر کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہوں۔۔۔ اب مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہاری وائف کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" میں نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ظفر سے پوچھا۔

"یہ پچھلے ماہ کی بات ہے" ظفر چائے کا کپ ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولا اس کی نظریں کمرے کی چھت پر گڑی ہوئی تھیں وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا محسوس ہورہا تھا شائد واقعات کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''پچھلے ماہ مجھے کمپنی کی جانب سے پروموشن لیٹر ملا اور ساتھ ہی ایک سال کے لئے ہنزہ ویلی میں کام کرنے کا حکم بھی ملا میں اور سیما، سیما میری وائف کا نام ہے'' ظفر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پچھلے ماہ میں اور سیما ہنزہ ویلی آنے کی تیاریاں کر رہے تھے'' ظفر کی آنکھیں پھر خلا میں گھورنے لگیں۔

''یار سامان احتیاط کے ساتھ ہنزہ پہنچنا چاہئے'' میں کنٹریکٹر سے کہا اس نے کنٹریکٹر کو میری کمپنی نے ہائیر کیا تھا تا کہ میرے گھر کا سامان لاہور سے ہنزہ پہنچایا جائے۔

''سر آپ فکر نہ کریں یہ ہمارا روز کا کام ہے آپ کا سارا سامان احتیاط کے ساتھ آپ کے ہنزہ والے گھر میں پہنچ جائے گا'' کنٹریکٹر نے جواب دیا تو میں اطمینان سے سر ہلانے لگا۔

''اچھا صاحب میں چلتی ہوں'' کچن سے نکل کر میری ماسی نے مجھ سے کہا۔

''ہاں۔۔ٹھیک ہے۔۔یہ لو اپنے پیسے'' میں نے اپنا والٹ کھول کر اس میں سے کئی نوٹ نکال کر ماسی کو دیئے۔

''شکریہ صاحب''

''ایک سال بعد جب ہم واپس لاہور آئیں گے تو پھر تم سے رابطہ کرلیں گے'' میں نے ماسی کو وضاحت کی۔

''جی صاحب'' ماسی نے مجھ سے پیسے لیتے ہوئے کہا اور پھر وہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''بیگم صاحبہ کہاں ہے؟'' میں نے گھر کے باہر جاتی ہوئے ماسی سے پوچھا۔

''وہ اوپر کمرے میں ہیں'' ماسی نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر گھر سے باہر چلی گئی میں کنٹریکٹر کے کام پر نظر ڈالتا ہوا سیڑھیوں کے ذریعے اوپر کے کمرے کی جانب چل دیا۔اوپر کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سیما کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی ہے اس کی آنکھیں نم ہیں، میں دھیرے سے سیما کے قریب پہنچا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے تو سیما نے مڑ کر نم آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''اپنے خوابوں کی سرزمین چھوڑنا یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہے'' میں نے سیما کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی پر لیتے ہوئے کہا۔

''میں خوشی اور غمی کے عجب دوراہے پر کھڑی ہوں ایک جانب لاہور چھوڑنے کا غم ہے تو دوسری جانب اس بات کی خوشی ہے کہ میں اپنے آباؤاجداد کی سرزمین ہنزہ ویلی جارہی ہوں'' سیما بولی۔

''تمہارے دادا کی تو پیدائش ہنزہ ہی کی تھی نا؟'' میں نے سیما سے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔۔دادا جان ہنزہ ہی میں پیدا ہوئے تھے'' سیما نے میری بات کی تصدیق کی۔

''تو پھر تم کبھی ہنزہ ویلی کیوں نہیں گئی'' میں نے حیرت سے پوچھا ''ہنزہ کوئی دوسرے ملک میں تو نہیں ہے''

''بس دادا جان ہمیشہ ہم لوگوں کو ہنزہ جانے سے منع کرتے تھے'' سیما بولی۔

''تو اب تمہیں کیسے اجازت ملی ہنزہ جانے کی''

'' اب دادا جان تو اس دنیا میں رہے نہیں۔۔ابا جان تو مجھے منع کر رہے ہیں کہ میں ہنزہ نہ جاؤں'' سیما نے وضاحت کی۔

''تو تم لاہور میں رک جاؤ۔۔۔صرف ایک سال کا کنٹریکٹ ہے ایک سال بعد میں واپس آجاؤں گا'' میں نے سیما سے کہا۔

''میں آپ کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتی آپ ایک سال کی بات کرتے ہیں'' سیما مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''تم اس حالت میں ایک نئی جگہ۔۔۔'' میں نے سیما کے پیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا سیما دو ماہ کی حاملہ تھی دو دن پہلے ہی لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی تھی۔

''یہ ایک فطری عمل ہے اور میری طبیعت کوئی

ایسی بھی خراب نہیں ہے اور پھر ہنزہ کوئی اتنی بیک ورڈ جگہ بھی نہیں ہے وہاں کافی اچھے ہسپتال وغیرہ موجود ہیں میں نیٹ پر سب سرچ کر چکی ہوں۔۔۔میں ہر حالت میں آپ کے ساتھ چلوں گی'' سیما ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی اور اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا میں ہولے ہولے سیما کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''وہاں رہائش کا کیا بندوبست ہے؟'' کچھ دیر بعد سیما نے مجھ سے پوچھا۔

''رہائش کی تم فکر نہ کرو۔۔کمپنی نے ایک بنگلہ کرائے پر لیکر اس کو سیٹ کروا دیا ہے ساتھ ہی ایک میڈ (ماسی) کا بھی بندوبست کر دیا ہے'' میں نے سیما کو جواب دیا تو سیما اطمینان بھرے انداز میں سر ہلانے لگی۔

اگلے ہی دن ہم دونوں اپنی کار میں ہنزہ ویلی کے لئے نکل پڑے، گھومتے پھرتے اسلام آباد مری کاغان کی سیر کرتے ہوئے ہم دونوں ایک ہفتے کے بعد ہنزہ پہنچے۔ہنزہ پہنچ کر ہم اس بنگلے تک پہنچے جس کا بندوبست کمپنی نے ہمارے لئے کیا تھا ہماری نئی میڈ (ماسی) زرینہ نے ہمارا استقبال کیا۔بنگلہ جدید طرز کا نیا بنا ہوا تھا مخصوص ہنزہ اسٹائل کا وہ بنگلہ سیما اور مجھے بہت پسند آیا ساتھ ہی زرینہ ماسی بھی ہمیں پسند آئی زرینہ نہایت ہوشیار اور جانفشانی سے کام کرنے والی عورت ہے بنگلہ دیکھ کر اور زرینہ ماسی سے مل کر میں نے سکون کا سانس لیا ہمارے ہنزہ پہنچنے سے پہلے ہی ہمارا سامان لاہور سے ہنزہ ہمارے بنگلے پر پہنچ چکا تھا جسے زرینہ نے نہایت خوبصورتی سے سیٹ کر دیا تھا سیما کو بھی زرینہ بہت پسند آئی۔اگلے ہی دن سے میں نے کمپنی کے نئے پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا'' ظفر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور میری جانب دیکھنے لگا میں گہری سوچ میں ڈوبا ظفر کی باتیں سن رہا تھا۔ظفر کے خاموش ہونے پر میں نے نظر اٹھا کر ظفر کی جانب دیکھا مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر ظفر نے اپنی سانس درست کی اور پھر گویا ہوا۔

''ہنزہ منتقل ہونے کے چند دن بعد اتوار کے دن میں اور سیما بنگلے کے گارڈن میں مالی سے نئے پودے لگوانے کی خاطر گڑھے کھدوا رہے تھے کہ اچانک ایک گڑھا کھودتے کھودتے مالی چیخ اٹھا۔

''ارے اس گڑھے میں سے یہ کیا نکلا''

''کیا ہے؟'' میرے اور سیما کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تو مالی نے گڑھے میں سے اپنا ہاتھ بلند کر کے ہمیں دکھایا مالی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیاہ رنگ کی مورتی تھی۔

سیما اور میں لپک کر مالی کے قریب پہنچے میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر مالی کے ہاتھ سے مورتی لے لی اور مورتی پر لگی مٹی صاف کرنے لگا مٹی صاف کر کے میں نے مورتی کو بغور دیکھا۔آدھا فٹ لمبی وہ مورتی کسی مرد کی تھی جس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے بلاشبہ وہ مورتی آرٹ کا ایک بہترین شاہکار تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مورتی زندہ جاوید ہو اور ابھی بول پڑے گی میں مورتی کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ سیما میرے قریب آئی اور اس نے مورتی میرے ہاتھ سے لے لی۔

جیسے ہی سیما نے مورتی اپنے ہاتھ میں لی اچانک ہوائیں تیز چلنے لگیں، آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا میں گھبرا گیا مگر فوراً ہی آسمان پر سے سیاہ بادل چھٹ گئے اور دوبارہ اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔اجالا ہونے کے بعد میں نے سیما کی جانب دیکھا تو مجھے سیما کے چہرے کے زاویے بگڑتے ہوئے محسوس ہوئے میں نے سیما کو مخاطب کیا تو سیما ایسے چونکی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو میں نے گھبرا کر سیما کو تھاما۔

''سیما تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے سیما سے پوچھا۔

''ہاں میری طبیعت ٹھیک ہے کیوں؟'' سیما نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''نہیں کچھ نہیں۔۔بس یونہی'' میں نے بات ٹال دی۔

''ظفر دیکھو کتنی خوبصورت مورتی ہے۔۔میں اسے اپنے کمرے میں رکھوں گی'' سیما نے کہا اور مورتی

لے کر بنگلے کے اندر چلی گئی" ظفر اتنا کہہ کر ایک بار پھر خاموش ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے بیٹھا ظفر کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"سر آپ یقین نہیں کریں گے" کچھ دیر بعد ظفر نے پھر کہنا شروع کیا "سیما کو اس مورتی سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ وہ گھنٹوں اس مورتی کے سامنے بیٹھی رہتی اس مورتی کے آنے کے بعد سیما نے جیسے مجھے نظر انداز کرنا شروع کردیا، نہ صرف مجھے بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی لاپروا ہوگئی۔ کئی کئی دن سیما اپنا منہ نہیں دھوتی نہ بال بناتی نہ ہی سیما کو کھانے پینے کا ہوش تھا بس وہ چپ چاپ گھنٹوں مورتی کے سامنے بیٹھی رہتی۔

پھر ایک دن میں نے زبردستی سیما کو بال وغیرہ بنانے پر مجبور کیا تو سیما ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے کے سامنے اپنے بال بنانے لگی میں باہر بیٹھا تھا۔

مجھے سیما کے چیخنے کی آواز آئی میں دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سیما ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنا منہ چھپائے کھڑی ہے اور رو رہی ہے اس کا پورا بدن لرز رہا ہے۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا؟" میں نے پیار سے سیما کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ میرا چہرہ۔۔۔ میرا چہرہ۔۔۔ بگڑ گیا ہے" سیما نے بے ربط الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"تمہارا چہرہ۔۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا پھر میں نے پیار سے اس کے چہرے پر سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا سیما کا چہرہ پہلے کی طرح خوبصورت تھا میرے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"لو جانو۔ اپنا چہرہ خود دیکھ لو" میں نے سیما کا رخ آئینے کی جانب پھیرا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔" سیما نے اپنی نظریں جھکا لیں میں نے پیار سے اس کی تھوڑی پر اپنی انگلی رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تو سیما نے ڈرتے ڈرتے اپنی نظریں اوپر کیں اور جیسے ہی اس کی نظر آئینے پر پڑی تو وہ آنکھیں پھاڑ کر آئینے کو دیکھنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ میرا چہرہ۔۔۔ اب۔۔۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔۔ مگر اس وقت میرے بجائے آئینے میں کوئی اور نظر آرہا تھا" سیما بے یقینی کے لہجے میں کہنے لگی۔

"کون نظر آرہا تھا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ کوئی بھوت تھا؟" سیما بولی۔

"جان تم بہت تھک گئی ہو۔۔۔ اور شائد ٹینشن میں بھی ہو۔۔ چلو کچھ دیر آرام کرتے ہیں، اس سے تمہاری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی" میں نے پیار سے سیما سے کہا اور اسے کندھے سے پکڑ کر بیڈ کی جانب لے جانے لگا۔

"ظفر۔۔ میرا یقین کرو۔۔ میں نے خود دیکھا کہ میری جگہ۔۔ وہ کوئی بھوت کھڑا تھا" سیما پھر بولی۔

"کوئی بات نہیں۔۔ ایسا اکثر تھکن کی وجہ سے ہوجاتا ہے۔۔ تم یہ سکون کی ٹیبلٹ لے لو اور کچھ دیر سو جاؤ اٹھو گی تو تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگی" میں نے سیما کو بیڈ پر بٹھایا اور بیڈ کی سائیڈ کی دراز سے سکون بخش ٹیبلٹ نکالی اور پانی کے گلاس کے ساتھ سیما کے ہاتھ میں دی سیما نے وہ ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگل لی ٹیبلٹ کھا کر سیما کو نیند آگئی اور وہ سو گئی۔

اس دن کے بعد سیما کو وہ بھوت اکثر نظر آنے لگا سیما آئینہ دیکھنے سے ڈرنے لگی سیما کی حالت دیوانوں کی سی ہوگئی اسے نیند بھی نہیں آتی تھی وہ پہروں جاگتی رہتی نیند کی گولیاں بھی اس پر بے اثر تھیں، میں نے کئی ڈاکٹرز کو سیما کو دکھایا مگر کوئی بھی سیما کی بیماری نہیں سمجھ سکا سیما کی حالت کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوگیا لہٰذا میں سوچنے لگا کہ میں سیما کو لیکر واپس لاہور لوٹ جاؤں۔

پھر ایک شام جب میں دفتر سے واپس گھر آیا تو میں نے دیکھا کہ سیما نہا دھو کر تیار کھڑی ہے اس نے میرا پسندیدہ لباس پہنا ہوا ہے بہت دن بعد اس نے مجھے والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا میں سیما کا یہ انداز دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ سیما کی طبیعت ٹھیک ہوگئی

ہے۔ اس دن ہم دونوں کافی دنوں بعد گھر سے باہر نکلے رات کا کھانا ہم دونوں نے باہر کھایا اور ہنزہ کی سیر کرنے کے بعد ہم دونوں رات گئے گھر واپس پہنچے۔ رات کو جب میں اور سیما واپس گھر آرہے تھے تو ہمارے گھر کے سامنے ہماری پڑوسی رضا علی آفندی ملے وہ اپنے کتے کے ساتھ ٹہل لگا رہے تھے ان کے پاس اصیل نسل کا السیشن کتا تھا۔

"ہیلو ظفر ہیلو سیما کیسے ہیں آپ دونوں؟" آفندی نے ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"فائن آپ سنایئے کیسے ہیں اور آج آپ رات کے وقت شیرو کو ٹہلا رہے ہیں" میں نے آفندی کو جواب دے کر سوال بھی داغ دیا شیرو آفندی کے کتے کا نام تھا۔

"بس کھانا کھا کر ٹہلنے نکلا تو یہ بھی ساتھ ہولیا" آفندی نے جواب دیا۔

اسی وقت اچانک شیرو نے بھونکنا شروع کردیا وہ زور زور سے بھونک رہا تھا اور ساتھ ہی آفندی کے ہاتھ سے زنجیر چھڑانا بھی چاہ رہا تھا شیرو کی نظریں مسلسل سیما پر جمی ہوئی تھیں۔ میں کسی مغالطے کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ شیرو سیما پر بھونک رہا تھا شیرو کے زور لگانے پر آفندی کے ہاتھ سے زنجیر چھوٹ گئی اور شیرو زور زور سے بھونکتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا شیرو بھاگتے ہوئے مڑ مڑ کر سیما کی جانب دیکھ رہا تھا میں نے پہلی بار شیرو کی آنکھوں میں خوف دیکھا وہ سیما سے ڈر رہا تھا شیرو بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گیا۔

"پتا نہیں اچانک شیرو کو کیا ہوگیا" آفندی بولے اور تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب چل دیئے۔

"نہ جانے شیرو کو کیا ہوگیا"؟ آفندی کے جانے کے بعد میں نے سیما سے کہا۔

"پاگل ہوگیا ہے اسے تو گولی مار دینی چاہیے" سیما کا لہجہ کافی جارحانہ تھا میں نے حیران ہوکر سیما کو دیکھا کیونکہ سیما جانور سے کافی محبت کرتی تھی لاہور میں اس نے بھی ایک کتا پالا ہوا تھا لہٰذا سیما کا اس طرح شیرو کو گولی ماردینے کا کہنا میرے لئے کافی حیرت کا باعث تھا۔

اگلے دن علی الصبح اٹھ کر میں جاگنگ کے لئے گھر سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ آفندی کے گھر کے سامنے رش لگا ہوا ہے میں جاگنگ کے انداز میں دوڑتا ہوا آفندی کے گھر کے سامنے پہنچا اور لوگوں کی بھیڑ میں راستہ بناکر آگے بڑھا اور آفندی کے گھر کے قریب پہنچا تو۔۔ تو دھک سے رہ گیا آفندی کے گھر کے دروازے پر شیرو کی لاش پڑی تھی شیرو کی لاش ادھڑی ہوئی تھی کسی نے اس کی گردن دبوچ کر اس کا پیٹ پھاڑ کر اسے مارا تھا۔

"لگتا ہے رات کو شیرو کی مڈبھیڑ کسی درندے سے ہوگئی شائد کسی چیتے یا ریچھ وغیرہ سے کیونکہ یہ کسی درندے کا ہی کام لگتا ہے" مجمع میں سے ایک آدمی بولا تو آفندی افسردگی سے سر ہلانے لگے، میں نے بھی دکھ اور صدمے سے آفندی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور قریب جاکر شیرو کی لاش دیکھنے لگا، شیرو کی گردن بری طرح ادھڑی ہوئی تھی اور اس کا پیٹ بھی پھٹ گیا تھا لگتا تھا کسی جانور نے اپنے مضبوط دانتوں سے شیرو کو ادھیڑ کر رکھ دیا میں آفندی سے افسوس کا اظہار کرکے واپس گھر آگیا جب میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سیما اٹھ چکی ہے اور مورتی کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھی ہے میں نے سیما کو ہائے کہا مگر سیما نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ بیٹھی مورتی کو گھورتی رہی میں سیما کے قریب پہنچا تو سیما کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا سیما کے چہرے اور گردن پر خراشوں کے واضح نشان تھے۔

"سیما۔۔ سیما۔۔ یہ تمہارے چہرے پر خراشیں کیسی ہیں؟" میں سیما کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا۔۔ کیا۔۔" سیما ایسے چونکی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔

"یہ تمہارے چہرے پر خراشیں کیسی ہیں"؟ میں دوبارہ پوچھا۔

"کہاں کہاں" سیما اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی تو میں نے چھوٹا آئینہ اٹھایا اور

اس میں سیما کو اس کا چہرہ دکھانے لگا۔

"پتا نہیں۔۔۔یہ خراشیں کہاں سے آئیں" سیما نے لاپرواہی سے جواب دیا اور دوبارہ مورتی کو گھورنے لگی۔ میں پریشانی کے عالم میں بیڈ روم میں آیا تو مجھے مسہری کے نیچے ایک تھیلی نظر آئی مجھے حیرت ہوئی کہ مسہری کے نیچے یہ کیسی تھیلی رکھی ہے میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ تھیلی مسہری کے نیچے سے نکالی اور تھیلی کھول کر دیکھنے لگا تھیلی کو کھول کر جیسے ہی میں نے تھیلی کے اندر ہاتھ ڈال کر تھیلی میں رکھی چیز باہر نکالی ۔۔۔تو مجھے زور کا جھٹکا لگا اور میں دکھ اور صدمے سے تھیلی میں سے نکلی چیز کو دیکھنے لگا۔

تھیلی میں سے سیما کا نائٹ سوٹ نکلا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اس نائٹ سوٹ پر تازہ تازہ خون کے دھبے صاف نظر آرہے تھے اور ساتھ ہی اس نائٹ سوٹ پر خون کے ساتھ شیرو کے جسم کے بال بھی جابجا چپکے ہوئے تھے۔

"سیما۔۔سیما نے شیرو کو۔۔" میں نے دکھ کے مارے اپنا سر پکڑ لیا میری حالت بہت بری ہو رہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں مگر میں نے ضبط کا دامن تھامے رکھا اور نائٹ سوٹ دوبارہ تھیلی میں ڈال کر تھیلی کا منہ بند کیا اور اسے پہلی والی پوزیشن میں مسہری کے نیچے رکھ دیا۔

نہا دھو کر جب میں بیڈ روم سے باہر نکلا تو سیما کی حالت بھی سنبھل چکی تھی وہ بڑی لگاوٹ سے مجھ سے ملی اور ناشتے میں میز پر بھی وہ بڑی لگاوٹ کا اظہار کر رہی تھی۔" ظفر اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"یہ کتے والی بات کب کی ہے؟" ظفر کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

"دو دن پہلے کی" ظفر نے جواب دیا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"میں نے سیما پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے شیرو کی موت کا راز معلوم ہوگیا ہے میں حسب معمول تیار ہو کر آفس چلا گیا مگر آفس میں میرا دل نہیں لگا اسی دن مجھے اپنے باس سے حکم ملا کہ جو مال ہماری کمپنی نے لاہور سے منگوایا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے تو میں لاہور چلا جاؤں اور معلوم کروں کہ مال ہنزہ نہ پہنچنے کی کیا وجہ ہے۔۔۔باس کی بات سن کر میں بہت خوش ہوا اور مجھے یقین تھا کہ سیما بھی میری بات سن کر بہت خوش ہوگی ۔۔۔مگر" ظفر ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

"مگر کیا؟"

"میں آفس سے فوراً نکل پڑا اور گھر پہنچا سیما مجھے جلدی گھر آتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"خیریت تو ہے آج آپ جلدی گھر آگئے" سیما میرے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"خوشخبری ہے بہت بڑی" میں نائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

"خوشخبری۔۔کون سی خوشخبری؟" سیما نے پوچھا۔

"کل ہم لاہور جارہے ہیں" میں نے سیما کو خوشخبری سنائی اتنی بات کہہ کر ظفر ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

"سیما کا ری ایکشن یہ بات سن کر کیسا تھا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"سر آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔میں تو سمجھ رہا تھا کہ سیما بہت خوش ہوگی۔۔مگر اس کا ری ایکشن انتہائی شدید تھا اس نے ہنزہ چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ جب میں نے اصرار کیا۔۔تو وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی اور گھر کی چیزیں میرے اوپر پھینکنے لگی بڑی مشکل سے سیما کو قابو کیا سیما کی بس ایک ہی رٹ تھی وہ ہنزہ ویلی سے باہر نہیں جائے گی۔"

ظفر ایک بار پھر خاموش ہوگیا ظفر کی بات سن کر میرے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوگیا۔

"اور سر کل میرے سسر کا فون آیا انھوں نے جو بات مجھے بتائی اس نے مجھے کافی پریشان کر دیا" ظفر بولا۔

"کیا بتایا انھوں نے؟"

"انھوں نے بتایا کہ سیما نے انہیں فون کر کے ہنزہ آنے کی دعوت دی جب انھوں نے ہنزہ آنے سے انکار کیا تو پہلے تو سیما نے خوشامد کی مگر پھر سیما نے

دھمکی دی کہ اگر اس کے سارے گھر والے ہنزہ نہیں آئے۔۔تو وہ خودکشی کر لے گی نہ صرف اپنے ماں باپ اور بھائی کو بلکہ سیما نے اپنی بڑی بہن جو کہ امریکا میں رہتی ہے اسے بھی فون کر کے فورس کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے اپنے بچوں کے ساتھ ہنزہ آئے" ظفر اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے بولا۔

"حیرت انگیز سیما اپنے پورے خاندان کو ہنزہ ویلی میں جمع کر رہی ہے" میں سوچتے ہو بڑبڑایا۔

"یہ بات میرے لئے بھی کافی حیرت کی باعث ہے" ظفر بولا۔

"تمہارے سسر وغیرہ ہنزہ ویلی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" میں نے ظفر سے پوچھا۔

"سر میرے سسر نے مجھے اب یہ راز بتایا ہے کہ ان کے والد یعنی سیما کے دادا نے سب کو سختی کے ساتھ ہنزہ جانے سے منع کیا تھا لہٰذا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے ہنزہ آنے کا" ظفر بولا۔

"کیوں۔۔۔؟ سیما کے دادا نے اپنے خاندان کو ہنزہ آنے سے کیوں منع کیا تھا کیا کوئی مسئلہ یا خاندانی دشمنی" میں نے پھر پوچھا۔

"کچھ معلوم نہیں سیما کے دادا کی تو پیدائش ہنزہ کی تھی مگر پھر بھی وہ کبھی خود بھی ہنزہ نہیں آئے اور نہ ہی انھوں نے اپنے کسی بچے کو ہنزہ آنے دیا" ظفر بولا۔

"اب سیما کے دادا کہاں ہیں"؟ میں نے پوچھا۔

"پچھلے سال سیما کے دادا کا انتقال ہوگیا" ظفر بولا تو میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"اس کا مطلب ہے سیما کے دادا کے ساتھ ہی وہ راز بھی دفن ہوگیا" میں بولا تو ظفر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"ٹھیک ہے تمہارے گھر چلتے ہیں وہاں چل کر دیکھتے ہے سیما کے ساتھ مسئلہ کیا ہے" میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا مخصوص بیگ اٹھایا اور اسے کھول کر چیک کرنے لگا کہ تمام چیزیں بیگ میں رکھی ہے یا نہیں۔ بیگ چیک کرنے کے بعد میں ظفر کے پاس آیا تو ظفر بھی صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر میں اور ظفر، ظفر کے کار میں بیٹھ کر اس کے گھر کی جانب روانہ ہوئے ۔دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ظفر نے سفید ماربل کے بنے مخصوص ہنزہ اسٹائل کے ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے کار روکی تو میں اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا میں نے بنگلے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی بنگلہ کافی خوبصورت اور جدید طرز کا تھا سفید ماربل سورج کی سنہری کرنوں میں چمک رہے تھے۔

ظفر بھی کار سے نیچے اترا اور اس نے آگے بڑھ کر بنگلے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا ظفر کے پیچھے میں بھی بنگلے میں داخل ہوا بنگلے کے اندر داخل ہو کر میں نے دیکھا ایک وسیع لان ہے جس میں بہت خوبصورت پھولدار پودے لگے ہیں ہری ہری گھاس کسی مخمل کی طرح فرش پر بچھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی میں ستائشی نظروں سے لان کو دیکھنے لگا۔

"لان تو بہت خوبصورت بنایا ہے" بالآخر دل کی بات میرے زبان پر آہی گئی۔

"یہ سب سیما کا کارنامہ ہے۔۔مگر جب سے وہ منحوس مورتی ملی ہے سیما سب کچھ بھول گئی بس دن رات مورتی کے سامنے بیٹھی رہتی ہے اسے اپنا ہوش تک نہیں ہے" ظفر یہ کہتے ہوئے گھر کے اندرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا میں بھی ظفر کے ساتھ اندرونی دروازے کی جانب بڑھا اچانک میں ٹھٹک کر رک گیا میری چھٹی حس مجھے خبردار کرنے لگی میں نے ظفر کو ایک نظر دیکھا جو اندرونی دروازہ کھول رہا تھا پھر میں نے مکان کی جانب نظر اٹھائی مجھے اس مکان میں شیطانی قوتوں کا احساس ہو رہا تھا میں نے احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائے اور ظفر کے پیچھے چل دیا۔ظفر اندرونی دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوا گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ظفر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ظفر کی چیخ سن کر میں جلدی سے گھر کے اندرونی دروازہ سے گزر کر گھر کے اندر داخل ہوا میں جہاں داخل ہوا تھا وہ ایک بڑا سا ہال تھا پہلے شاید وہ خوبصورتی سے

سجا ہوگا مگر اب ہر چیز بے ترتیب پڑی تھیں، دیواروں سے تصاویر اتر کی فرش پر بے ترتیب پڑی تھی۔ صوفے بھی الٹے پڑے تھے شیشے کے شوپیس فرش پر کرچیوں کی صورت میں بکھرے پڑے تھے۔

''سیما۔۔ سیما'' ظفر بے تابی کے ساتھ چیختا ہوا گھر کے اندر کے جانب دوڑا میں نے اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلنے لگا۔

''صاحب۔۔ صاحب۔'' ہال کے ایک کونے سے آواز ابھری تو میں نے دیکھا کہ ایک عورت جو حلئے سے ماسی لگ رہی تھی ظفر کی جانب لپک کر آئی

''زرینہ ماسی۔۔۔ سیما کہاں ہے؟'' ظفر نے بے تابی سے زرینہ سے پوچھا۔

''صاحب۔۔ صاحب۔۔ یہ سب بی بی جی نے کیا ہے'' زرینہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔

''سیما کہاں ہے''؟ ظفر نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

''وہ۔۔ وہ بی بی جی اوپر چھت پر۔۔۔'' زرینہ جلدی جلدی بولی زرینہ کے منہ اتنا سن کر ظفر پھرتی کے ساتھ زینے کی جانب لپکا اور ایک ساتھ تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر کی جانب دوڑا، ظفر کے پیچھے میں بھی زینے کی جانب لپکا اور اوپر کی سمت چل دیا ظفر نے اوپر پہنچ کر چھت کا دروازہ لات مار کر کھولا اور اوپر چھت پر پہنچ گیا میں بھی ظفر کے پیچھے پیچھے تھا، مجھے ایک بار پھر ظفر کی چیخ سنائی دی تو میں تیزی کے ساتھ چھت پر پہنچا چھت پر پہنچ کو جو منظر میں نے دیکھا وہ مجھے ششدر کرنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے چھت پر پہنچ کر دیکھا کہ ایک چوبیس پچیس سال کی لڑکی چھت پر بنی باؤنڈری وال کی پتلی سی دیوار پر اس طرح چل رہی ہے جیسے کسی پارک کی نرم نرم گھاس پر چہل قدمی کر رہی ہو۔

''سر۔۔ یہ میری وائف سیما ہے'' مجھے دیکھ کر ظفر نے کہا تو میں نے سر ہلا دیا ظفر سیما کو آواز دینا چاہتا تھا مگر میں نے ظفر کا بازو پکڑ کے اسے روک دیا۔

''سیما کو تیز آواز مت لگانا بلکہ پیار سے اسے دیوار سے نیچے اتارو۔۔'' میں ظفر کے کان میں سرگوشی کی تو ظفر میری بات سن کر سر ہلانے لگا۔

''سیما۔۔ سیما ڈارلنگ۔۔ یہاں آؤ میرے پاس۔۔'' ظفر نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بڑے پیار سے سیما کو پکارا، ظفر کی آواز سن کر سیما نے ظفر کی جانب دیکھا۔

اف سیما کی آنکھوں سے ظفر کو دیکھتے ہی شعلے نکلنے لگے وہ کہر آلود نگاہوں سے ظفر کو گھور رہی تھی میں بغور سیما کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا سیما کی آنکھوں سے بے شک شعلے نکل رہے تھے۔۔ مگر اس کی آنکھیں بے نور سی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سویا ہوا انسان ہو، مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت سیما کسی شیطانی طاقت کے زیر اثر ہے۔

سیما ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے دیوار پر سے چھلانگ مار کر اتری، کسی حاملہ عورت کا چار فٹ کی دیوار پر سے اس طرح چھلانگ مار کر اترنا کافی خطرناک ہو سکتا تھا مگر سیما باحفاظت نیچے اتری اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ظفر کی جانب آئی وہ مسلسل ظفر کو اپنی شعلے برساتی نگاہوں سے گھور رہی تھی سیما دھیرے دھیرے ظفر کے قریب پہنچی ظفر نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر سیما کو اپنی بانہوں میں لینا چاہا۔۔ مگر سیما نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ آگے کئے اور ظفر کی گردن کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور ظفر کو زمین سے اوپر کر دیا۔

ظفر کے پیر ہوا میں لہرا رہے تھے وہ بری طرح تڑپ رہا تھا سیما اس کی گردن مسلسل دبا رہی تھی ظفر کی سانسیں رکنے لگیں اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلنے لگیں وہ پھنسی پھنسی آواز میں سیما کو پکار رہا تھا مگر سیما مسلسل ظفر کی گردن دبائے جا رہی تھی اس کے ہونٹوں پر بڑی شیطانی قسم کی مسکراہٹ تھی۔

صورتحال کافی تشویش ناک تھی اگر میں دخل نہیں دیتا تو سیما ظفر کو گردن دبا کر مار دیتی میں نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے دم کئے ہوئے

پانی کی بوتل نکالی اور قرآنی آیات پڑھتے ہوئے اس پانی کا چھینٹا سیما کے منہ پر مارا۔

جیسے ہی پانی سیما کے منہ پر پڑا سیما کے منہ سے ایک مردانہ چیخ نکلی اور اس کے ہاتھ سے ظفر کی گردن چھوٹ گئی، ظفر دھڑام سے پکے فرش پر گر پڑا پھر جلدی سے اٹھا اور میرے قریب آ کر اپنی گردن مسلتے ہوئے سیما کو دیکھنے لگا سیما اب مجھے گھور رہی تھیں اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھی مگر سیما کے اندر جو کوئی بھی تھا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ میری جانب بڑھتا بلکہ میں دو قدم سیما کی جانب بڑھا اور پھر قرآنی آیات پڑھتے ہوئے پانی اپنے چلو میں لیا اور سیما کے منہ پر ایک بار پھر پانی کا چھینٹا مارا تو سیما زور زور سے چیخنے لگی اس کے منہ سے بھاری سی مردانہ آواز نکل رہی تھی۔

''کون ہو تم۔۔۔۔ بولو کون ہو تم۔۔؟'' میں نے اپنے بزرگوں کا عطا کردہ نقش، سیما کے چہرے کے سامنے کیا تو سیما کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''بولو کون ہو تم۔۔؟'' میں مزید سیما کے قریب ہوا۔

''راجیش۔۔۔۔۔ راجیش اودھا۔۔۔'' سیما کے منہ سے ایک مردانہ آواز نکلی اور پھر سیما دھڑام سے چھت کے پکے فرش پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

''یہ۔۔ یہ کیا تھا یہ کس کی آواز تھی۔۔؟'' ظفر سیما کے منہ سے ایک انجانی مردانہ آواز سن کر بوکھلا گیا۔

''سیما کو سنبھالو۔۔'' میں نے ظفر سے کہا تو ظفر جلدی سے سیما کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور سیما کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا مگر سیما ہوش میں نہ آئی۔

''سیما کو اٹھا کر کمرے میں لے چلو۔۔'' میں نے ظفر سے کہا تو ظفر سیما کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر چھت سے نیچے کی جانب اترنے لگا۔ ظفر سیما کو اٹھا کر اپنے بیڈروم میں لے گیا اور اسے بیڈ پر لیٹا دیا۔

''یہ۔۔ یہ راجیش اودھا کون ہے؟'' سیما کو بیڈ پر لیٹا کر ظفر نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ بات تو میں تم سے پوچھنے والا تھا کہ یہ راجیش اودھا کون ہے؟'' میں نے جواباً ظفر سے کہا۔

''میں نہیں جانتا میں نے اس سے پہلے یہ نام کبھی نہیں سنا'' ظفر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''راجیش اودھا کو بعد میں دیکھیں گے پہلے ڈاکٹر کو فون کرو'' میں نے ظفر کی توجہ سیما کی جانب دلائی تو ظفر اپنا سیل فون نکال کر ڈاکٹر کو فون کرنے لگا میں نے بھی اپنا سیل فون نکالا اور ظفر کے بیڈروم سے باہر آ کر نیاز علی کا نمبر ملانے لگا، میں نیاز علی سے راجیش اودھا کے متعلق معلوم کرنا چاہتا تھا میرا خیال تھا شائد نیاز علی کو راجیش اودھا کے بارے میں جانکاری ہو۔

پہلی ہی بیل پر نیاز علی نے فون اٹھا لیا'' ہیلو اوصاف کیسے ہو؟۔۔۔ ظفر کی وائف کے کیس کا کیا بنا؟'' نیاز علی فون اٹھاتے ہی شروع ہو گئے۔

''سر اسی لئے آپ کو فون کیا ہے۔۔۔ آپ سے ایک بات پوچھنی تھی'' میں نے ادب سے نیاز علی سے اجازت چاہی۔

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔ پوچھو''

''سر۔۔ آپ راجیش اودھا نام کے کسی شخص سے واقف ہیں؟'' میں نے نیاز علی سے راجیش اودھا کے متعلق پوچھا۔

''راجیش اودھا۔۔'' نیاز علی بڑبڑانے لگے'' نہیں۔۔ میں کسی راجیش اودھا نام کے شخص سے واقف نہیں ہوں۔۔۔ کیوں تم راجیش اودھا کے متعلق کیوں جاننا چاہتے ہو'' نیاز علی نے مجھے جواب دینے کے بعد خود بھی سوال داغ دیا۔

''سر ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ پلیز اپنے جاننے والوں سے معلوم کر کے مجھے بتایئے کہ آپ کے حلقۂ احباب میں سے کوئی راجیش اودھا کے متعلق کچھ جانتا ہے؟'' میں جواباً کہا۔

''ٹھیک ہے میں معلوم کرتا ہوں جیسے ہی مجھے کچھ پتا چلا میں تمہیں بتاتا ہوں'' نیاز علی نے مجھے جواب دیا تو میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے میں نے دیکھا ظفر بھی اپنے بیڈ

روم سے باہر آ گیا تھا اور میری فون پر بات چیت ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر آ رہا ہے" ظفر نے مجھے اپنی جانب متوجہ پایا تو بولا میں نے ظفر کی بات سن کر اپنا سر ہلایا اور زینے کی جانب بڑھ گیا زینے سے نیچے اتر کر میں نے دیکھا کہ زرینہ ماسی نے ہال میں بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھ دیا ہے اور ہال کو کافی حد تک صاف بھی کر دیا ہے میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھا اور ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی نکال کر اس پر بیٹھ گیا۔

"صاحب آپ کے لئے چائے بناؤں۔۔؟" زرینہ ماسی نے مجھے ڈائننگ ٹیبل کے پاس بیٹھا دیکھا تو بولی۔

"ہاں بنا دو۔۔" میں نے جواب دیا میرے ماتھے پر فکر کی گہری شکنیں تھیں میں سیما کے متعلق سوچ رہا تھا اور یہ راجیش اودھا کون ہے اور اس نے سیما پر کیوں قبضہ کیا ہے اور وہ ظفر کو کیوں مارنا چاہتا تھا۔

میں فکر مندی سے مکان کے چاروں اطراف دیکھ رہا تھا اس مکان میں کسی بڑی شیطانی قوت کے ہونے کا احساس میری چھٹی حس مجھے دلا رہی تھی۔

میں خاموشی سے بیٹھا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا ساتھ ہی موجودہ صورتحال کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ایک شخص ہاتھ میں ڈاکٹرز کا مخصوص بیگ پکڑے اندر داخل ہوا مجھے ہال میں اکیلا بیٹھا دیکھا تو تھوڑا جھجک گیا۔

"میں ڈاکٹر تکریم علی۔۔۔ظفر نے مجھے فون کیا تھا کہ اس کی وائف سیما کی طبیعت خراب ہے" ڈاکٹر تکریم نے احتیاط کے ساتھ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

"جی۔۔۔جی ہاں سیما کی طبیعت خراب ہے ظفر اور سیما بیڈروم میں ہیں" میں نے ڈاکٹر تکریم سے کہا تو وہ اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے زینے کی جانب بڑھ گیا شائد ڈاکٹر تکریم، ظفر کا فیملی ڈاکٹر ہے اسی لئے اسے ظفر کے بیڈروم کا راستہ معلوم ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر تکریم اور ظفر واپس ہال میں آئے "سیما کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے ایسی حالت میں اس کا بلڈ پریشر بڑھنا خطرناک ہو سکتا ہے" ہال میں آنے کے بعد ڈاکٹر تکریم علی نے ظفر سے کہا تو ظفر فکر مندی سے سر ہلانے لگا۔

"میں نے سیما کو دوا دے دی ہے چار پانچ گھنٹے وہ پرسکون سوتی رہے گی۔۔۔آپ یہ مزید دوائیں میڈیکل اسٹور سے منگوا لیجئے" کچھ دیر بعد ڈاکٹر تکریم نے دوبارہ ظفر سے کہا اور پھر اپنا لیٹر پیڈ نکال کر اس پر دوائیں لکھنے لگا دوائیں لکھنے کے بعد ڈاکٹر تکریم نے وہ پرچہ ظفر کے حوالے کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا ظفر بھی انہیں چھوڑنے کی غرض سے ان کے ساتھ باہر کی جانب چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ظفر واپس آیا اس کے چہرے پر فکر مندی کی گہری لکیریں تھیں وہ بھی ڈائننگ ٹیبل کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا ہم دونوں کے درمیان طویل خاموشی چھا گئی۔

"ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا" بالآخر خاموشی کا طویل دورانیہ میں نے توڑا اور بات چیت کی غرض سے سیما کی طبیعت پوچھی۔

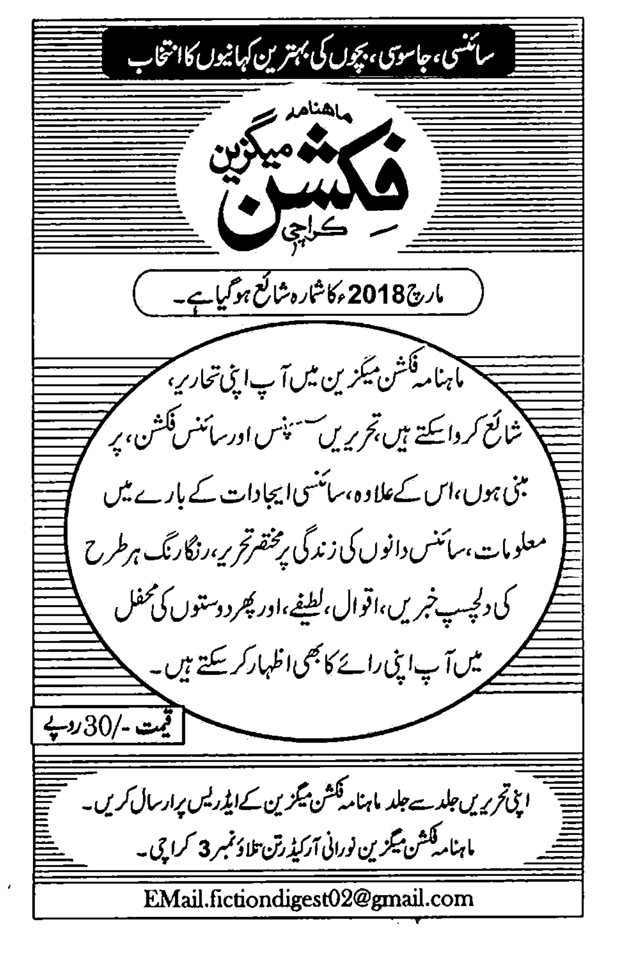
"ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ سیما کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے جو خطرناک بات ہے" ظفر نے جواب دیا۔

"ہوں" میں پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"سر۔۔۔یہ راجیش اودھا کون ہے"؟ ظفر نے مجھ سے پوچھا۔

"میں نے سر نیاز علی کو بھی فون کیا تھا مگر انہیں بھی کچھ نہیں معلوم۔۔۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں معلوم کریں شائد کسی کو راجیش اودھا کے بارے میں معلوم ہو" میں نے ظفر کو جواب دیا۔

"صاحب۔۔صاحب۔۔آپ۔۔آپ نے کیا کہا کیا نام لیا۔۔؟" ماسی زرینہ جو میز پر چائے رکھ رہی تھی میرے منہ سے راجیش اودھا کا نام سن کر گھبرا گئی اس کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا خوف کے مارے اس کے ہاتھ



سے چائے چھلک کر میز پر گر پڑی۔

"ماسی زرینہ دھیان سے۔۔ابھی چائے سر اوصاف کے کپڑوں پر گر جاتی" ظفر نے زرینہ کو تنبیہ کی مگر زرینہ نے ظفر کی بات ہی نہیں سنی بس وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔۔

"آپ نے کیا نام لیا صاحب؟" ماسی زرینہ نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا۔

"راجیش اودھا۔۔۔کیا تم راجیش اودھا کو جانتی ہو؟" میں نے ماسی زرینہ کے سوال کا جواب دینے کے بعد خود بھی سوال کیا میری نظریں ماسی زرینہ پر گڑی ہوئی تھی ماسی زرینہ نے میرے سوال کا جواب اثبات میں سر ہلا کر دیا تو میں کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے راجیش اودھا۔۔۔اور تم کیسے جانتی ہو اسے" میں نے جلدی سے ماسی زرینہ سے پوچھا ظفر بھی حیرت سے ماسی زرینہ کو دیکھ رہا تھا جس شخص کے متعلق ہم پریشان ہو رہے تھے ماسی زرینہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔

"یہ نام میں نے اکثر اپنے بڑے دادا سے سنا ہے" ماسی زرینہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"بڑے دادا۔۔" عجیب سا رشتہ سن کر میں بڑبڑایا۔

"بڑے دادا میرے دادا کے بڑے بھائی ہیں اس لئے ہم انہیں بڑے دادا کہتے ہیں" ماسی زرینہ نے عجیب رشتے کے متعلق وضاحت کی تو میں سر ہلانے لگا۔

"تمہارے بڑے دادا سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے"؟ میں نے ماسی زرینہ سے پوچھا۔

"بڑے دادا ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں" ماسی زرینہ نے جواب دیا۔

"تم اپنے بڑے دادا سے مجھے ملوا سکتی ہو"؟ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"جی ہاں۔بڑے دادا بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ تر گھر میں رہتے ہیں۔۔آپ کو ان سے ملنا ہے تو میرے گھر چلنا ہوگا" ماسی زرینہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ابھی مجھے اپنے گھر لے چلو میں اسی وقت تمہارے بڑے دادا سے ملنا چاہونگا" میں نے ماسی زرینہ سے کہا۔

"سر میں بھی آپ کے ساتھ چلونگا" ظفر بھی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"مگر سیما۔۔۔سیما کو اس حالت میں اکیلے کیسے چھوڑ سکتے ہیں" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"سر آپ فکر نہ کریں میں اپنے پڑوسی آفندی صاحب کی وائف کو بلوا لیتا ہوں وہ ہمارے آنے تک سیما کے پاس رہیں گی۔" ظفر نے مجھے جواب دیا اور میری بات سنے بغیر تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"راجیش اودھا کے متعلق تم کیا جانتی ہو؟" ظفر کے جانے کے بعد میں نے ماسی زرینہ سے پوچھا۔

"زیادہ کچھ نہیں۔۔۔یہ نام میں نے اکثر بڑے دادا کے منہ سے سنا ہے۔۔" ماسی زرینہ نے جواب دیا۔

"تم یہیں ہنزہ کی رہنے والی ہو؟" میں نے ایک بار پھر ماسی زرینہ سے پوچھا۔

"ہم نسلوں سے ہنزہ ویلی میں رہ رہے ہیں" ماسی زرینہ نے جواب دیا۔

اسی وقت بیرونی دروازے سے ظفر گھر میں داخل ہوتا نظر آیا اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی مقامی عورت تھی اس عورت نے مجھے ادب سے سلام کیا تو میں نے بھی اس کے سلام کا جواب دیا۔

"سر اوصاف یہ ہماری پڑوسن مسز آفندی ہیں۔۔" ظفر نے اس خاتون کا تعارف کروایا۔

"سیما اوپر بیڈ روم میں ہے ڈاکٹر نے اسے سکون کا انجکشن دیا ہے وہ چار پانچ گھنٹے سوتی رہے گی بس ہم لوگ ابھی واپس آجاتے ہیں" ظفر نے مجھے کہنے کے بعد مسز آفندی سے مخاطب ہوا تو مسز آفندی سر ہلاتے ہوئے زینے کی جانب بڑھ گئیں۔

"چلئے سر۔" مسز آفندی کے جانے کے بعد

ظفر نے مجھے مخاطب کیا تو میں اور ماسی زرینہ ظفر کے پیچھے پیچھے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد میں، ماسی زرینہ، ظفر کی کار میں بیٹھے بڑے دادا سے ملنے ماسی زرینہ کے گھر کی جانب رواں دواں تھے ہنزہ ویلی کی ٹیڑھی میڑھی پرخطر سڑکوں پر دس منٹ کے سفر کے بعد کار ایک مضافاتی آبادی میں پہنچ گئی ماسی زرینہ کی نشاندہی پر ظفر نے کار ایک پرانے سے مکان کے سامنے روک دی۔

کار رکتے ہی زرینہ پھرتی کے ساتھ کار سے نیچے اتری اور خستہ حال مکان کے دروازے کے پاس پہنچی میں اور ظفر بھی کار سے نیچے اترے زرینہ نے آگے بڑھ کر بند دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔

"آیئے صاحب۔۔" زرینہ دروازہ کھولنے کے بعد بولی اور مکان کے اندر داخل ہو گئی میں اور ظفر بھی زرینہ کے پیچھے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔

گھر کافی پرانا تھا مگر مضبوط بنا ہوا تھا میں نے گھر کے اندر داخل ہو کر گھر کے چاروں جانب نظریں دوڑائی گھر کی دیواروں سے خستہ حالی جھلک رہی تھی۔

"اماں۔۔۔یہ میرے صاحب لوگ ہیں۔۔بڑے دادا سے ملنے آئی ہیں۔" گھر کے اندرونی حصے سے ایک بڑی عمر کی عورت آئی تو زرینہ نے اس عورت کو مخاطب کر کے کہا اس عورت نے ہمیں دیکھتے ہی اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور ہمیں سلام کیا وہ عورت زرینہ ماسی کی ماں ہے۔

"بڑے دادا کہاں ہیں" سلام کے بعد زرینہ نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔۔" زرینہ ماسی کے ماں نے جواب دیا تو زرینہ گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی اور ساتھ ہی مجھے اور ظفر کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا کہا میں اور ظفر بھی زرینہ کے پیچھے پیچھے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے اندر ایک لمبی راہداری تھی اس راہداری کے کونے میں ایک دروازہ نظر آرہا تھا زرینہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس دروازے تک پہنچی میں اور ظفر بھی زرینہ کے پیچھے اس بند دروازے تک پہنچ گئے۔دروازے کے سامنے پہنچ کر زرینہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک نقاہت زدہ بوڑھی آواز باہر نکلی۔

"بڑے دادا میں ہوں زرینہ۔" زرینہ ماسی نے دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔

"آجاؤ۔۔"

زرینہ اندر داخل ہو گئی زرینہ کے پیچھے میں اور ظفر بھی کمرے میں داخل ہو گئے کمرے میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ یہ ایک بڑا سا کمرہ ہے کمرے کے وسط میں ایک پرانا پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر ایک بوڑھا آدمی تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا ہے کمرے میں چاروں اطراف کتابیں ریک میں سلیقے سے رکھی ہیں شائد بڑے دادا کو مطالعے کا شوق ہے میں نے کمرے میں رکھی کتابیں دیکھ کر سوچا۔

"بڑے دادا یہ میرے صاحب لوگ ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں" کمرے میں داخل ہونے کے بعد زرینہ نے بڑے دادا سے ہمارا تعارف کرایا میں نے اور ظفر نے بڑے دادا کو سلام کیا تو بڑے دادا ہمارے سلام کا جواب دینے کے بعد پلنگ سے اٹھنے لگے۔

"آپ۔۔آپ آرام سے بیٹھے رہیے" میں بڑے دادا کے پلنگ کے پاس ہوتا ہوا بولا اور بڑے دادا سے ہاتھ ملایا۔

"بڑے دادا یہ آپ سے راج۔۔۔۔" زرینہ نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کے بات کاٹ دی۔

"زرینہ اس بارے میں بھی بات کر لیں کہ پہلے بڑے دادا کی خیر خیریت تو پوچھ لیں" میں نے جلدی سے زرینہ کی بات کاٹی دراصل میں پہلے بڑے دادا سے تھوڑی دوستی پیدا کرنا چاہ رہا تھا تاکہ وہ بے تکلف ہو کر راجیش اودھا کے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیں۔۔زرینہ بھی میرا مقصد سمجھ گئی لہذا وہ خاموش ہو گئی اور کمرے سے باہر چلی گئی تاکہ ہم تنہائی میں بڑے دادا

سے گفتگو کر سکیں۔ میں بڑے دادا سے بات چیت کرنے لگا ان کی طبیعت کے متعلق پوچھا اور ان کے مشاغل کی بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا بڑے دادا ہمزہ دہلی میں پوسٹ ماسٹر تھے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن پر گزارا کر رہے ہیں انہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے وہ اپنی پنشن کا بڑا حصہ کتابوں کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں۔

کافی دیر تک میں بڑے دادا سے بات چیت کرتا رہا ہمارے درمیان کافی بے تکلفی ہوگئی ظفر خاموشی سے بیٹھا ہماری بات چیت سن رہا تھا کبھی کبھی بیچ میں لقمہ دے دیتا۔

''تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟'' کافی دیر بات چیت کے بعد بڑے دادا نے مجھ سے پوچھا۔

''بڑے دادا۔۔۔آپ راجیش اودھا کے متعلق کیا جانتے ہیں'' میں نے اپنی آواز کو کافی پراسرار بناتے ہوئے بڑے دادا سے پوچھا۔

''کیا۔۔کیا نام لیا تم نے'' بڑے دادا میرے منہ سے راجیش اودھا کا نام سن کر جیسے اچھل پڑے۔

''راجیش۔۔۔۔راجیش اودھا۔۔'' میں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''تو۔۔تم راجیش اودھا کو کیسے جانتے ہو؟'' بڑے دادا نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال داغ دیا راجیش اودھا کا نام سن کر بڑے دادا کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہو گئے تھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

''آ۔۔آپ بتائے آپ راجیش اودھا کے بارے میں کیا جانتے ہے؟'' میں نے بڑے دادا کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دوبارہ کیا۔

''نہیں۔۔پہلے تم بتاؤ تم راجیش اودھا کا نام کیسے جانتے ہو؟'' بڑے دادا قطعیت بھرے لہجے میں بولے تو میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا تھوڑی دیر خاموش رہ کر میں نے بڑے دادا کو سیما کی حالت کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ سیما کے منہ سے بے ہوش ہوتے ہوئے راجیش اودھا کا نام نکلا تھا۔

''اوہ۔۔میرے خدا۔۔اس کا مطلب ہے کہ۔۔وہ واپس آ گیا۔۔اپنا انتقام لینے کے لئے وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آ گیا'' بڑے دادا میرے بات سن کر بڑبڑانے لگے۔

''کون تھا راجیش اودھا۔۔بڑے دادا بتائیے کون تھا راجیش اودھا'' میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''شیطان تھا وہ۔۔۔بہت بڑا شیطان۔۔کالی ماتا کا بھگت تھا کالی ماتا کا پجاری۔۔۔'' بڑے دادا بدستور ٹرانس کی حالت میں بڑبڑا رہے تھے۔

''بڑے دادا پلیز مجھے بتائیے راجیش اودھا کون تھا کیا تھا؟'' میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں بھرا اور بڑے دادا کو دیتے ہوئے کہا بڑے دادا نے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں پورے گلاس کا پانی پی لیا، پانی پی کر بڑے دادا نے گلاس مسہری کے سائیڈ میں رکھا اور اپنے ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے کمرے کی چھت کو گھورنے لگے شائد وہ راجیش اودھا کے متعلق یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یہ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کی بات ہے ابھی پاکستان نہیں بنا تھا ہمزہ دہلی کی مشرق کی سمت کالی ہندو گھرانے آباد تھے وہ ہندو گھرانے امن و آشتی کے ساتھ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزار رہے تھے ان کی اپنی پنچائت تھی وہ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد تھے۔

ہندومت میں ذات پات کی تقسیم بہت گہری ہے برہمن ان کی سب سے اونچی ذات ہے اس کے بعد چھتری اور ویش کی ذاتیں ہیں جب کے ہندومت میں سب سے نچلی ذات شودر کی ہے شودر لوگوں کو ہندومت میں اچھوت سمجھا جاتا ہے اگر کسی شودر کا سایہ بھی کسی برہمن پر پڑ جائے تو برہمن کو گنگا کے پانی سے نہا کر پاک ہونا پڑتا ہے شودر کو کسی بھی ہندو کے برابر بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی سیدھی بات یہ ہے کہ ہندومت میں شودر کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا۔ راجیش اودھا کا تعلق

ہندوؤں کی شودر ذات سے تھا اس کے ماتا پتا اونچی ذات کے ہندوؤں کے گھروں کی غلاظت اٹھانے کا کام کرتے تھے راجیش گو کہ نچلی ذات کا ہندو تھا مگر وہ بے حد ذہین تھا اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا راجیش اسکول جانا اور پڑھنا چاہتا تھا مگر اس وقت صرف اونچی ذات کے ہندوؤں کے بچے ہی اسکول جا سکتے تھے کسی نچلی ذات کے ہندو کے بچے کو اسکول میں داخلہ نہیں دیا جاتا تھا لہٰذا راجیش اسکول میں داخلہ نہ لے سکا جس کا اسے بہت ملال تھا۔

راجیش بچپن ہی سے سارا سارا دن کالی ماتا کے مندر میں بیٹھا رہتا اور وہاں بیٹھا مختلف جاپ کرتا رہتا تھا لوگ کہتے ہیں کہ راجیش نے کالا جادو سیکھ رکھا تھا اور وہ کالے جادو کا ماہر تھا راجیش کا تعلق گاؤں کے دیگر لوگوں سے برائے نام تھا وہ مہینوں اپنے گھر بھی نہیں جاتا تھا بس کالی ماتا کے چرنوں میں پڑا رہتا تھا'' بڑے دادا یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئے اور میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگے میرے چہرے پر فکر کی گہری شکنیں تھیں میں غور سے بڑے دادا کی باتیں سن رہا تھا بڑے دادا کچھ دیر میری جانب دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''شکنتلا برہمن خاندان کی لڑکی تھی جانے کب شکنتلا اور راجیش اودھا کے درمیان پریم کا پودا کھلا اور تناور درخت بن گیا وہ دونوں دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر ملنے لگے مگر کب تک عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا وہ دونوں بھی پکڑے گئے جس وقت ہندو لڑکے ان دونوں کو پکڑ کر گاؤں میں لائے میں بھی وہاں موجود تھا۔

''اونچی ذات کے ہندو راجیش کی اس جرأت پر بہت سیخ پا ہوئے کہ اس نے ایک اونچی ذات کی لڑکی سے پریم کیا وہ بہت طیش میں تھے فوراً پنچائت بلائی گئی اور پنچائت کے مکھیا نے شکنتلا اور راجیش کو موت کی سزا کا حکم دیا ان دونوں کو کالی ماتا کے مندر کے سامنے میدان میں لایا گیا اس وقت اماوس کی رات تھی گاؤں کے لوگوں نے مشعلیں روشن کر کے کالی ماتا کے مندر کے سامنے میدان کو روشن کیا ہوا تھا مکھیا کے حکم پر راجیش اور شکنتلا کو زہر پلا کر مرتیو ڈنڈ دیا جانے لگا مکھیا نے خود آگے بڑھ کر راجیش اور شکنتلا کے منہ میں زہر کا پیالہ انڈیلا راجیش نے کافی مزاحمت کی مگر ہندو لڑکوں نے اس کا منہ زبردستی کھولا اور مکھیا نے راجیش کے منہ میں زہر انڈیل دیا۔ زہر جیسے ہی راجیش اور شکنتلا کے جسم کے اندر پہنچا وہ دونوں تڑپنے لگے ان کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا مگر اس حالت میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے تھے مگر جیسے ہی وہ ایک دوسرے کے قریب آتے لڑکے ان دونوں کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ کر پھر دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتے راجیش اور شکنتلا پھر ایک دوسرے کی جانب رینگتے ہوئے بڑھنے لگتے اور لڑکے انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر ایک دوسرے سے دور کرتے رہے مگر ان دونوں نے ہمت نہ ہاری اور آخر کار وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اونچی ذات کے ہندو یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایک نیچ ذات والا لڑکا ان کی لڑکی کا ہاتھ پکڑے لہٰذا اونچی ذات کے ہندوؤں نے راجیش اور شکنتلا کے ہاتھوں پر بے دریغ لاٹھیاں برسائیں مگر ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا شکنتلا راجیش کا ہاتھ پکڑ کر اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی راجیش کے قریب آئی اور اس نے راجیش کے سینے پر سر رکھا اور آخری بار اپنی بند ہوتی آنکھوں سے راجیش کو دیکھا اور راجیش کے سینے پر سر رکھ کر دم توڑ دیا۔

شکنتلا کے مرتے ہی راجیش کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور۔۔اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا راجیش کا سارا جسم اس کے اپنے خون میں نہایا ہوا تھا۔

راجیش نے اپنے زخمی ہاتھ بلند کئے اور زور زور سے کوئی منتر پڑھنے لگا راجیش کے منتر پڑھتے ہی ہوائیں تیز چلنے لگیں درختوں سے سوکھے پتے گرنے لگے

ہوائیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں ایسا لگا جیسے آندھی آ گئی ہو تمام لوگ گھبرا گئے ہوا تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اسی وقت راجیش اودھا زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔

”کھیا جس طرح تو نے میری شکنتلا کو مرتیو ڈنڈ دیا ہے میں تیرے سارے ونش کو مرتیو ڈنڈ دونگا۔۔یاد رکھنا کھیا۔۔۔میں لوٹ کر آؤنگا۔۔۔جے کالی۔۔۔جے کالی ماتا۔۔“ راجیش کی دھمکی سن کر سب لوگ دھک سے رہ گئے راجیش آسمان کی جانب دیکھ کر پھر منتر پڑھنے لگا۔

اچانک آندھی کی رفتار بہت تیز ہو گئی میدان میں جلتی ہوئی ساری مشعلیں بجھ گئیں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

اسی وقت کالی ماتا کے مندر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور مندر سے ایک تیز روشنی نکلی اس روشنی نے میدان کے وسط میں کھڑے راجیش کو اپنے حصار میں لیا تو راجیش کے پیر زمین سے اوپر اٹھ گئے اور وہ روشنی سے حصار میں اڑتے ہوئے کالی ماتا کے مندر کے اندر چلا گیا راجیش کے مندر کے اندر جاتے ہی مندر کا دروازہ ایک بار پھر آپ ہی آپ بند ہو گیا مندر کا دروازہ بند ہوتے ہی آندھی چلنا بھی بند ہو گئی اور بجھی ہوئی تمام مشعلیں خود بخود جل اٹھیں۔

مجھ سمیت تمام لوگوں پر یہ سب دیکھ کر سکتہ طاری ہو گیا ہر شخص ڈرا سہما اپنی جگہ کھڑا تھا آخرکار کچھ دیر بعد چند بہادر نوجوان آگے بڑھے اور انھوں نے آگے بڑھ کر کالی ماتا کے مندر کا دروازہ کھولا مندر کا دروازہ کھلا۔۔تو سب دھک سے رہ گئے کیونکہ مندر کے اندر راجیش اودھا موجود نہیں تھا حالانکہ مندر میں جانے اور آنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا وہ دروازہ۔۔۔مگر دروازہ تو بند تھا آخر راجیش کہاں چلا گیا یہ بات مجمع میں کھڑا ہر شخص سوچ رہا تھا۔

پھر کھیا ہمت کر کے مندر کے اندر داخل ہوا اس کے ساتھ چند اور لوگ بھی مندر میں داخل ہوئے مندر میں داخل ہو کر انھوں نے دیکھا کہ کالی ماتا کے چرنوں میں ایک مورتی پڑی ہے آدھی فٹ لمبی وہ سیاہ مورتی کالی ماتا کے چرنوں میں اس طرح پڑی ہوئی تھی جیسے کالی ماتا کے چرنوں میں ماتھا ٹیک رہی ہو کھیا ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس نے وہ سیاہ مورتی اٹھائی کر سیدھی کی۔۔تو سب حیران رہ گئے کیونکہ اس سیاہ مورتی کی شکل راجیش اودھا سے بہت مل رہی تھی سب لوگ ڈر گئے مگر کھیا نے ہمت دکھائی اور لڑکوں کو لکڑیاں جمع کر کے آگ دہکانے کا حکم دیا منٹوں میں کالی ماتا کے مندر کے باہر آگ دہکائی گئی کھیا نے وہ مورتی آگ میں ڈال دی آگ کافی دیر تک جلتی رہی جب آگ بجھی۔۔تو سب حیران رہ گئے کیونکہ آگ نے مورتی کو جلایا نہیں۔۔آگ میں کافی دیر رہنے کے باوجود اس مورتی کا کچھ نہیں بگڑا پھر کھیا کے کہنے پر چند نوجوانوں نے مورتی پر بڑے بڑے پتھر برسائے مگر ان پتھروں کی ضربوں نے بھی مورتی کو کوئی گزند نہیں پہنچایا آخر پنچائت کے بڑوں کے فیصلے پر مورتی کو دور جنگل میں ایک گہرا گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

اس واقعے کے بعد سب لوگ کافی عرصہ ڈرے سہمے رہے ہر رات لوگوں کا خیال ہوتا کہ راجیش واپس آ جائے۔۔مگر جب کافی عرصے تک جب کچھ نہیں ہوا تو سب لوگ مطمئن ہو گئے اور۔۔۔پھر ہندوستان تقسیم ہو گیا اور ہنزہ کے بہت سے ہندو بھارت چلے گئے ان جانے والوں میں کھیا بھی شامل تھا۔“ بڑے دادا ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

”اس کا مطلب ہے وہ مورتی جو ظفر کے گھر کے گارڈن سے ملی وہ راجیش اودھا کی ہے“ میں بڑبڑایا تو بڑے دادا اثبات میں سر ہلانے لگے۔

”یعنی راجیش اودھا نے اپنی کالی شکتیوں سے اپنی موت کو ٹال دیا اور خود کو ایک مورتی میں قید کر لیا“ میں پھر سوچتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

”ہاں۔۔۔راجیش اودھا کالی شکتیوں کا ماہر تھا وہ کالی ماتا کا سب سے بڑا بھگت۔۔سب سے بڑا پجاری تھا“ میری بات سن کر بڑے دادا بھی بول اٹھے۔

”مگر راجیش نے سیما پر ہی کیوں قبضہ کیا“ ظفر جو اتنی دیر سے ہماری باتیں سن رہا تھا بول اٹھا۔

”یہ سوچنے کی بات ہے۔۔شائد اس لئے اس نے سیما پر قبضہ کیا کہ سیما ایک عورت ہے اور اپنی موجودہ حالت کی وجہ سے کمزور بھی ہے“ میں نے سیما کے حاملہ ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ظفر کو جواب دیا۔

”راجیش نے مجھے مارنے کی کوشش کیوں کی؟“ ظفر نے اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے پوچھا جب سیما کے اندر موجود راجیش نے ظفر کا گلا دبا کر مارنا چاہا۔

”کہیں تمہارا تعلق کھیا کے گھرانے سے تو نہیں ہے“ میں نے ظفر سے پوچھا۔

”نہیں ہم لوگ ایرانی ہیں اور میرے آباؤاجداد برسوں پہلے لاہور آ کر آباد ہو گئے تھے“ ظفر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”کھیا اور اس کے خاندان کا کیا ہوا؟“ میں نے بڑے دادا سے پوچھا۔

”کھیا تو تقسیم کے وقت بھارت چلا گیا تھا“ بڑے دادا نے جواب دیا۔

”اور کھیا کے گھر والے“؟ میں نے پھر سوال کیا۔

”کھیا کی بیوی کا دیہانت تو راجیش کے واقعے سے کافی عرصہ پہلے ہو گیا تھا۔۔کھیا کے گھر میں کھیا اور اس کا اکلوتا بیٹا وکرم ہی رہ گیا تھا“ بڑے دادا نے بتایا۔

”کھیا کا بیٹا وکرم بھی کیا بھارت چلا گیا تھا“ میں نے پھر پوچھا۔

”راجیش کے واقعے کے وقت وکرم لاہور پڑھنے گیا ہوا تھا وہ لاہور ہی میں تھا جب ہندوستان تقسیم ہوا، کہنے والے کہتے ہیں کہ کھیا بھارت جاتے سے اپنے بیٹے کو بھی لاہور سے بھارت لے گیا تھا۔۔۔مگر۔۔“ بڑے دادا کہتے کہتے رک گئے۔

”مگر کیا“

”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وکرم کو لاہور میں کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور اس نے اسلام قبول کر کے اس مسلمان لڑکی سے شادی کر لی تھی اور لاہور ہی میں رہنے لگا تھا۔۔مگر اس بات کی تصدیق کبھی نہیں ہو سکی۔۔کیونکہ ہنزہ سے جانے کے بعد کھیا یا وکرم کبھی ہنزہ نہیں آئے“ بڑے دادا نے بتایا۔

”اب اس بات کی تصدیق کیسے ہو گی کہ وکرم لاہور میں رک گیا تھا یا اپنے پتا کے ساتھ بھارت چلا گیا تھا؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اب شائد اس بات کی تصدیق نہ ہو سکے ہندوستان کی تقسیم کو بے شمار سال گزر چکے ہے“ ظفر نے جواب دیا تو میں اور بڑے دادا سر ہلانے لگے۔

”بڑے دادا آپ کے پاس کھیا یا وکرم کی کوئی تصویر ہے؟“ کچھ دیر بعد مجھے خیال آیا تو میں نے بڑے دادا سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ایک تصویر تھی وکرم کی میرے پاس۔۔۔۔جب میں پرائمری میں پڑھتا تھا تو وکرم میرا کلاس فیلو تھا اس وقت ہمارے اسکول نے ڈسٹرکٹ فٹبال چمپئین شپ جیتی تھی اس ٹیم میں، میں اور وکرم بھی شامل تھے وکرم ہمارا کپتان تھا اس وقت کی ایک تصویر ہے میرے پاس۔۔۔۔۔نہ جانے کہاں رکھی ہو گی ڈھونڈتا ہوں“ بڑے دادا یہ کہتے ہوئے پلنگ سے نیچے اترے اور کتابوں کے ریک کے پاس پہنچ کر تصویر ڈھونڈنے لگے۔

”ابھی کچھ دنوں پہلے تو میں نے دیکھی تھی وہ تصویر نہ جانے کہاں رکھ دی“ بڑے دادا تصویر ڈھونڈنے کے ساتھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

”او یہ رہی۔۔اس کتاب کے اندر رکھ دی تھی“ بڑے دادا ایک کتاب کے اندر سے ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو صاف کرتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔

”یہ اس وقت کی تصویر ہے جب میں اور وکرم پانچویں کلاس میں تھے اور اسکول کی فٹبال ٹیم میں بھی ہم دونوں ساتھ کھیلتے تھے“ بڑے دادا نے تصویر میری جانب بڑھائی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر تصویر بڑے دادا سے لے لی اور تصویر دیکھنے لگا۔

”یہ میں ہوں اور یہ ٹرافی اٹھائے ہوئے وکرم

ہے کھیا کا بیٹا" بڑے دادا نے انگلی رکھ کر اپنی اور وکرم کی تصویر کی جانب اشارہ کیا، میں بغور وکرم کو دیکھنے لگا چوڑی پیشانی کا دس گیارہ سال کا خوبصورت سادہ لڑکا کافی ذہین معلوم ہوتا تھا تصویر دیکھنے کے بعد میں نے تصویر ظفر کی جانب بڑھائی اور وکرم کی تصویر پر انگلی رکھ کر ظفر کو وکرم کا بتایا ظفر بھی وکرم کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا وکرم کی تصویر دیکھتے ہی ظفر کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"خیریت ظفر کیا ہوا؟" میں ظفر کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر دیکھ کر بول اٹھا۔

"یہ۔۔یہ وکرم ہے" ظفر کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔۔کیوں خیریت تو ہے نا؟" میں نے ظفر سے پوچھا۔

"میں۔۔میں نے اسے دیکھا ہے" ظفر بولا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"اگر وکرم آج زندہ ہوگا تو بڑے دادا کی عمر کا ہوگا" میں نے ظفر کو جواب دیا مگر ظفر نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں وہ اپنا موبائل نکال کر اس میں البم کا آپشن کھولنے لگا پھر اس نے ایک تصویر موبائل کی اسکرین پر روشن کیا اور وکرم کی تصویر سے اس تصویر کو ملانے لگا۔

"دیکھئے یہی وکرم ہے" ظفر اپنا موبائل مجھے دیتا ہوا بولا میں نے ہاتھ بڑھا کر ظفر سے اس کا موبائل لیا اور دوسرے ہاتھ سے بڑے دادا کی دی ہوئی تصویر پکڑی اور پھر موبائل کی اسکرین پر نظر دوڑائی موبائل کی اسکرین پر اسی نوے سال کے ایک بوڑھے کی تصویر تھی میں دوسری نظر بڑے دادا کی دی ہوئی تصویر میں سے وکرم پر نظر ڈالی تو۔۔تو میں اچھل پڑا وہ بوڑھا سو فیصد وکرم ہی تھا۔

"یہ۔۔یہ تو واقعی وکرم کے بوڑھاپے کی تصویر ہے" میں بولا تو بڑے دادا بھی جلدی سے میرے قریب آئے اور دونوں تصویروں کو بغور دیکھنے لگے۔

"یہ۔۔یہ وکرم ہی ہے۔یہ دیکھئے یہ وکرم کے بائیں آنکھ کے نیچے چوٹ کا نشان یہ ہمارے ساتھ کھیلتے ہوئے اسے چوٹ لگی تھی یہی نشان اس بوڑھے کی بائیں آنکھ کے نیچے بھی ہے گو کافی مدہم پڑ گیا ہے مگر صاف نظر آرہا ہے۔۔یہ سو فیصد وکرم ہی ہے" بڑے دادا جوش میں بولے۔

"یہ کون ہے۔۔" میں نے ظفر سے پوچھا۔

"یہ سیما کے دادا حضور ہیں جن کا پچھلے سال انتقال ہو گیا" ظفر نے بتایا تو میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی اب ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔

"اوہ تو اس کا مطلب ہے بڑے دادا کہ یہ بات بالکل سچ ہے کہ وکرم کو لاہور میں کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسلام قبول کر کے لاہور ہی میں رک گیا تھا" میں نے کہا۔

"ہاں سیما اسی وکرم کی پوتی ہے اس طرح سیما کا تعلق کھیا کے گھرانے سے ہے" بڑے دادا نے بھی لقمہ دیا۔

"اسی لئے سیما میں موجود راجیش اودھا سیما کے ذریعے اس کے سارے خاندان کو ہنزہ دیلی آنے پر مجبور کر رہا ہے" میں نے کہا۔

"لیکن راجیش نے مجھے کیوں مارنے کی کوشش کی" ظفر نے ایک نقطہ اٹھایا۔

"راجیش نے تمہیں اس لئے مارنے کی کوشش کی کہ سیما کے اندر رہتے ہوئے اس نے سیما کی تم سے محبت کو محسوس کر لیا لہذا جیسے اس سے اس کی محبت چھین لی گئی تھی وہ سیما سے بھی اس کی محبت کو چھین لینا چاہتا ہے" میں نے ظفر کی پریشانی کو دور کیا تو ظفر میری بات سن کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"اب کیا ہوگا سیما کو راجیش اودھا سے کیسے چھٹکارا دلایا جائے گا" ظفر کچھ دیر بعد بولا۔

"بڑے دادا اس مسئلے کا کوئی حل ہے" میں نے ظفر کی بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے دادا سے پوچھا۔

"اس کا حل پنڈت سوامی نارائن کے پاس ہو

سکتا ہے" بڑے دادا نے جواب دیا۔

"پنڈت سوامی نارائن؟" میں نے سوالیہ لہجے میں بڑے دادا سے پوچھا۔

"ابھی بھی ہنزہ میں کافی ہندو آباد ہیں پنڈت سوامی نارائن ان کے مذہبی رہنما ہیں" بڑے دادا نے بتایا۔

"پنڈت جی کہاں ملیں گے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں لے کر چلتا ہوں آپ لوگوں کو پنڈت سوامی نارائن کے گھر۔میرا کافی اچھا دوست ہے پنڈت" بڑے دادا بولے اور اٹھ کر اپنی لاٹھی اور ٹوپی اٹھانے لگے۔

"زرینہ آپ ایسا کریں کہ واپس گھر سیما کے پاس چلی جائیں" ظفر نے اپنے والٹ سے کچھ رقم نکال کر زرینہ کو دیتے ہوئے کہا تو زرینہ ظفر سے رقم لیکر سر ہلانے لگی۔

"چلئے پنڈت سوامی نارائن سے بھی مل لیتے ہیں" بڑے دادا اپنے سر پر ٹوپی جماتے ہوئے بولے تو میں اور ظفر بڑے دادا کے ساتھ گھر کے بیرونی دروازے کی جانب چل دیئے۔

چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم ایک ایسی کالونی میں پہنچ گئے جہاں گھر کافی چھوٹے چھوٹے اور پرانی طرز کے بنے ہوئے تھے بڑے دادا کی رہنمائی میں ظفر کار کو ایک پرانی طرز کی عمارت کے سامنے لے آیا اور کار عمارت کے سامنے روک دی۔

"یہ قدیم مندر ہے اور مندر کے ساتھ ہی پنڈت سوامی نارائن کا گھر ہے" بڑے دادا یہ کہتے ہوئے کار سے اتر گئے ان کی تقلید میں، میں اور ظفر بھی کار سے باہر نکلے بڑے بڑے دادا لاٹھی ٹیکتے ہوئے ایک پرانے طرز کے مکان کے منقش دروازے کے پاس پہنچے اور اپنی لاٹھی سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔

"پنڈت۔۔او پنڈت۔۔" فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور سفید دھوتی کرتے میں ملبوس ماتھے پر تلک لگائے ہوئے ایک چاق وچوبند بوڑھا باہر نکلا۔

"اخاہ۔۔آج خان سجاول کیسے غریب کے گھر کا راستہ بھول گئے" باہر نکلنے والے شخص نے بڑے دادا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہمان لے کر آیا ہوں پنڈت۔۔۔" بڑے دادا باہر آنے والے شخص سے بولے جو پنڈت سوامی نارائن تھا۔

"مہمان۔۔۔میں ابھی بیٹھک کھولتا ہوں" اتنا کہہ کر پنڈت سوامی نارائن دوبارہ گھر میں گھس گیا۔

"پنڈت میرا بہت بے تکلف دوست ہے" پنڈت سوامی نارائن کے جانے کے بعد بڑے دادا بولے۔

"جی وہ آپ لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ لوگوں کا خیال کر لیا پنڈت نے ورنہ وہ میری آنے کی خوشی میں یہیں رقص شروع کر دیتا" بڑے دادا بولے۔

"آیئے۔۔آیئے" پنڈت سوامی نارائن اپنے گھر کے برابر کا بنا ہوا ایک اور دروازہ کھول کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر بولا تو بڑے دادا میں اور ظفر پنڈت سوامی نارائن کے قریب پہنچے میں نے اور ظفر نے پنڈت سے ہاتھ ملایا جبکہ بڑے دادا پنڈت سے لپٹ گئے سلام دعا کے بعد ہم سب بیٹھک میں داخل ہوئے۔بیٹھک میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ بیٹھک میں چارپائیاں رکھی ہوئی ہیں جن پر سفید چادریں بچھی ہوئی ہیں دیواروں پر کافی تصویریں لگی ہوئی ہیں اور ان تصویروں پر پھولوں کے ہار پڑے ہوئے ہیں وہ تصویریں پنڈت سوامی نارائن کے پرکھوں کی تھیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہیں بیٹھک کے ایک کونے میں ایک میز رکھی ہوئی ہے جس پر بھگوان کرشن کی مورتی رکھی ہوئی ہے بھگوان کرشن بانسری بجا رہے ہے ان کے سامنے اگربتی جل رہی ہے جس کے مدہم مدہم مہک پورے بیٹھک میں پھیلی ہوئی ہے۔پنڈت سوامی نارائن کے اشارے پر ہم تینوں چارپائیوں پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"ہاں سجاول۔۔۔چائے پیئے گا یا ٹھنڈا بنواؤں" ہم سب کے بیٹھنے کے بعد پنڈت نے کہا۔

''نہیں نارائن ۔۔تکلف مت کر۔۔یہ بچے تیرے پاس ایک اہم کام سے آئے ہیں'' بڑے دادا نے پنڈت کو منع کرتے ہوئے کہا۔

''جی کیا کام ہے آپ کو۔۔'' بڑے دادا کی بات سن کر پنڈت سوامی نارائن براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔راجیش اودھا واپس آگیا'' میں نے ہکلا کر جملہ مکمل کیا۔

''کیا۔۔کیا کہا'' میری توقع کے مطابق میرے منہ سے راجیش اودھا کا نام سنتے ہی پنڈت سوامی نارائن اچھل پڑا ''کیا نام لیا تم نے''

''آرام سے بیٹھ جا نارائن۔۔'' بڑے دادا نے پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ۔۔یہ کیا کہہ رہا ہے'' پنڈت کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ سچ کہہ رہا ہے راجیش اودھا واپس آگیا ہے''۔

''اوہ بھگوان۔۔۔یہ۔۔یہ کیسے ہوا''؟

پنڈت سوامی نارائن کے پوچھنے پر میں نے سیما پر راجیش اودھا کے قابض ہونے کی ساری داستان سنا دی اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ سیما کا تعلق کھیا کی نسل سے ہے۔

''ہاں۔۔راجیش کے پاس کالے جادو کی شکتیاں تھیں اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ کھیا کے سارے خاندان والوں کو مرتیو ڈنڈ دے گا'' پنڈت بڑبڑایا۔

''ہم راجیش سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں'' میں نے پنڈت سے پوچھا۔

''جب راجیش کو مرتیو ڈنڈ دیا گیا تو اس مندر میں میرے پتا جی پنڈت تھے انھوں نے راجیش کے بارے میں کافی ریسرچ کی تھی اور اپنی ڈائری میں وہ طریقہ اور منتر لکھ دیا تھا جس کے ذریعے راجیش کے قبضے سے سیما کو چھڑایا جا سکتا ہے اور راجیش کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ واپس اپنی مورتی میں چلا جائے'' پنڈت سوامی نارائن نے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھک کے اندرونی دروازے کو کھول کر گھر کے اندر چلا گیا۔ پنڈت کے جانے کے بعد ہم سب خاموش بیٹھے رہے کچھ ہی دیر بعد پنڈت واپس بیٹھک میں آیا اس کے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کی ڈائری تھی جسے ورق پلٹتے ہوئے پنڈت کچھ پڑھ رہا تھا۔

''اس ڈائری میں بڑے تفصیل سے وہ طریقہ لکھا ہے جس کے ذریعے ہم راجیش کو دوبارہ اس کی مورتی میں بھیج سکتے ہیں'' پنڈت سوامی نارئن ہمارے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا طریقہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سنسکرت جانتے ہیں؟'' پنڈت نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کر دیا۔

''جی میں اچھی طرح سنسکرت جانتا ہوں ۔۔کیوں؟'' جواب دینے کے بعد میں نے بھی سوال داغ دیا۔

''میرے سورگ واسی پتا جی نے یہ ڈائری سنسکرت میں لکھی ہے'' پنڈت نے جواب دیا۔

''اعتراض نہ ہو تو مجھے دکھایئے مجھے کافی اچھی سنسکرت آتی ہے'' میں نے کہا تو پنڈت نے ڈائری میرے حوالے کر دی میں نے پنڈت کے ہاتھ سے ڈائری لی اور اسے پڑھنے لگا۔ پنڈت کے پتا جی نے کافی تفصیل کے ساتھ راجیش کے حوالے سے لکھا تھا کہ کس طرح اسے مرتیو ڈنڈ دیا گیا اور مرتے ہوئے اس نے کس طرح قسم اٹھائی آخر میں انھوں نے راجیش کی کالی شکتیوں سے بچنے کے لئے منتر بھی لکھے تھے۔ میں ڈائری کو پڑھنے لگا۔

''اس کی رو سے تو ہم سیما کو راجیش سے چھڑانے کا عمل اماوس کی رات کو ہی کر سکتے ہیں'' ڈائری پڑھنے کے بعد میں نے ڈائری پنڈت کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔اور بھگوان کی کرپا سے کل کی رات

ہی اماوس کی رات ہے'' پنڈت نے جواب دیا اس کا مطلب تھا کہ پنڈت سوامی نارائن بھی سنسکرت اچھی طرح جانتا تھا اور اس نے بھی ڈائری پڑھ رکھی تھی شائد وہ نہیں چاہتا تھا کہ منتر کے بارے میں بڑے دادا اور ظفر کو کچھ معلوم ہو اسی لئے اس نے مجھے خود کچھ بتانے کے بجائے مجھے ڈائری پڑھنے کے لئے دے دی تھی۔

''ہاں۔۔کل رات ہی اماوس ہے تو پھر ہم کل رات ہی یہ عمل کر لیتے ہیں'' میں نے پنڈت سے کہا۔

''کل رات کو گیارہ بجے تک سیما کو کالی ماتا کے مندر میں لے آیئے۔۔تاکہ ہم وہاں راجیش کے کالے جادو کا توڑ کر سکیں'' پنڈت بولا۔

''کالی ماتا کے مندر میں کیوں۔۔'' ظفر جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا بول اٹھا۔

''راجیش کالی ماتا کا بھگت تھا اسے کالی ماتا کے سامنے ہی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ سیما کو چھوڑ دے'' میں نے جواب دیا تو ظفر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''میں مندر کی صفائی کر لوں گا اور دیگر انتظامات بھی مکمل کر لونگا آپ لوگ بس سیما کو لیکر کسی طرح کل رات کو کالی ماتا کے مندر میں پہنچ جائیں'' پنڈت بولا۔

''کیوں کیا کالی ماتا کے مندر پہنچنا مشکل ہے'' ظفر نے پنڈت کی بات سن کر کہا۔

''مندر جنگل کے اندر ہے جہاں کا راستہ بھی کافی کٹھن ہے اس کے علاوہ سیما کے اندر موجود راجیش کسی بھی حال میں سیما کو کالی ماتا کے مندر میں نہیں جانے دے گا'' پنڈت نے جواب دیا۔

''پھر۔۔پھر ہم سیما کو کیسے مندر تک لے کر جائیں گے'' ظفر پریشان ہو گیا۔

''ہم سیما کو بے ہوش کر کے مندر تک لے جائیں گے'' میں نے ظفر کی پریشانی دور کی۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا'' پنڈت نے بھی میری تجویز سن کر تائید کی۔

☆......☆......☆

استغفار کی برکات

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جو بندہ استغفار کو لازم پکڑ لے (یعنی اللہ تعالیٰ سے برابر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تنگی و مشکل سے نکلنے اور رہائی پانے کا راستہ بنا دے گا اور اس کی ہر فکر اور ہر پریشانی کو دور کر کے کشادگی اور اطمینان عطا فرما دے گا اور اس کو ان طریقوں سے رزق دے گا جن کو اس کا خیال و گمان بھی نہ ہوگا۔'' (بحوالہ: مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، معارف الحدیث)

''رات کی حفاظت''

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ''جب تم رات کو کتے کا بھونکنا اور گدھے کا چلانا سنو تو شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگو (یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھو) کیونکہ کتے اور گدھے وہ چیز دیکھتے ہیں جو تم نہیں دیکھتے اور رات کو جب لوگ بازاروں میں پھرنا موقوف کریں اور راستے بند ہو جائیں تو تم گھر سے بہت کم نکلا کرو۔ اس لئے کہ رات کو خدا اپنی مخلوقات میں سے جس کو چاہتا ہے پراگندہ کرتا ہے۔ (بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب اسوۂ رسول اکرم ﷺ)

(ایس حبیب خان۔کراچی)

جنگل میں ہوائیں تیز تیز چل رہی تھیں ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا ہمارے پیروں تلے سوکھے پتے چرمرا رہے تھے میں اور ظفر اسٹریچر تھامے جنگل کے پرخطر راستوں پر رواں دواں تھے اسٹریچر پر بے ہوشی کی حالت میں سیما لیٹی ہوئی تھی ہمارے آگے ایک بڑا سا گیس لیمپ لئے بڑے دادا چل رہے تھے گیس لیمپ کی روشنی میں ہمیں راستہ صاف نظر آرہا تھا ہم چاروں کالی ماتا کے مندر جارہے تھے میں نے بڑے دادا کو منع کیا کہ وہ ہمارے ساتھ نہ آئیں مگر بڑے دادا نہ مانے اور زبردستی ہمارے ساتھ کالی ماتا کے مندر جانے کی ضد کرنے لگے بڑے دادا جوش میں بھرے ہوئے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے کچھ ہی دور چلنے کے بعد مجھے ایک پرانی طرز کی عمارت نظر آئی شائد قدیم زمانے میں یہ عمارت کافی پرشکوہ رہی ہوگی مگر اس وقت وہ عمارت کسی بھوت بنگلے کا منظر پیش کر رہی تھی اسی وقت کسی گیدڑ کے دھاڑنے کی آواز فضا میں گونجی تو ظفر کے ہاتھ سے اسٹریچر لڑکھڑا گیا۔

''احتیاط سے ظفر۔۔''میں نے ظفر کو تنبیہ کی۔

''ہاں۔۔ہاں۔۔ اصل میں مجھ پر جنگل کی دہشت کا اثر ہو رہا ہے''ظفر نے جواب دیا۔

''آیت الکرسی پڑھتے رہو۔۔انشاء اللہ ڈر دل سے نکل جائے گا''میں نے ظفر سے کہا تو ظفر سر ہلانے لگا۔

''بس مندر بھی آیا ہی جاتا ہے''میں نے دوبارہ ظفر سے کہا۔

بڑے دادا مندر کے سامنے پہنچ کر رک گئے میں اور ظفر بھی ان کے پاس پہنچ کر رک گئے ہمارے پہنچنے کے بعد بڑے دادا مندر کے اندر داخل ہوگئے ان کے پیچھے میں اور ظفر بھی اسٹریچر پر لیٹی سیما کو لیکر مندر کے اندر داخل ہوئے مندر کے اندر داخل ہوکر میں نے دیکھا کہ مندر کی ایک دیوار کے ساتھ کالی ماتا کی دس ہاتھوں والی مورتی رکھی ہے سرخ سرخ زبان نکالتی اور اپنی بڑی بڑی خونخوار آنکھوں سے گھورتی کالی ماتا کی مورتی اس ڈراونے ماحول کو مزید ہیبتناک بنا رہی تھی۔

مندر کے وسط میں بہت ساری موم بتیاں ایک بڑے سے گول دائرے میں رکھی جل رہی تھیں ان ہی موم بتیوں کی روشنی سے مندر روشن تھا کالی ماتا کے سامنے پنڈت سوامی نارائن ہون (ایک مخصوص انگیٹھی جس میں آگ جل رہی ہوتی ہے ہندو اسے مقدس مانتے ہیں) کے سامنے بیٹھا تھا ہون میں آگ جل رہی تھی اور پنڈت اس آگ کے سامنے بیٹھا منتر پڑھ رہا تھا ہمیں مندر میں آتا دیکھ کر پنڈت اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے سیما کا اسٹریچر موم بتیوں کے درمیان رکھنے کا کہا، میں نے اور ظفر نے احتیاط کے ساتھ اسٹریچر موم بتیوں کے حصار میں رکھ دیا۔

اسٹریچر رکھنے کے بعد ہم دونوں موم بتیوں کے حصار سے باہر آگئے پنڈت نے ہاتھ کے اشارے سے بڑے دادا اور ظفر کو مندر کے دیوار کے ساتھ کھڑا ہونے کا کہا اور مجھے موم بتیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہونے کا کہا اور اشارے سے بتایا کہ وہ منتر شروع کر رہا ہے میں نے اثبات میں سر ہلا کر پنڈت کو جواب دیا۔

پنڈت نے پہلے کالی ماتا کی مورتی کو پرنام کر پھر ہون کے سامنے بیٹھ کر منتر الاپنے لگا پنڈت تیز آواز میں منتر پڑھ رہا تھا میں نے بھی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر آیت قرآنی کے نقش کو مضبوطی سے پکڑ لیا مجھے یقین تھا کہ راجیش اتنی آسانی سے سیما کا پیچھا نہیں چھوڑے وہ یقیناً مزاحمت کرے گا۔

سیما بے ہوشی کی حالت میں موم بتیوں کے حصار میں لیٹی تھی بڑے دادا اور ظفر آنکھیں پھاڑے سیما کو گھور رہے تھے ظفر کے چہرے پر پریشانی اور امید کی متضاد لکیریں تھیں میں بھی سیما کو بغور دیکھ رہا تھا میرے کان پنڈت کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

پنڈت نے منتر پڑھتے ہوئے ہون کی آگ میں تھوڑا سا گھی ڈالا تو آگ یک دم بھڑک اٹھی شعلے بلند ہونے لگے۔

اسی وقت سیما نے بھی آنکھیں کھول دیں اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

جیسے ہی سیما کے اندر موجود راجیش کو صورتحال کا اندازہ ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا، کھڑے ہوکر راجیش نے ایک کہر آلود نظر ہم سب پر ڈالی پھر اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی، چیخ اتنی تیز تھی کہ مجھے لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہو راجیش نے چیخ مارنے کے بعد اپنے ہاتھ بلند کیے۔

جیسے ہی راجیش نے اپنے ہاتھ بلند کیے وہ فضا میں اٹھنے لگا فضا میں اٹھنے کے بعد راجیش تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑتا ہوا موم بتیوں کے حصار سے باہر کی جانب نکلنے کے لئے لپکا مگر جیسے ہی وہ موم بتیوں کے قریب آیا موم بتیوں کی لو ایک دم اتنی تیز ہوگئی کہ موم بتیوں سے نکلنے والی آگ نے راجیش کو حصار سے نہ نکلنے دیا راجیش فوراً حصار کے دوسری جانب لپکا مگر اس جانب کی موم بتیوں کی لو بھی آگ کے شعلوں میں تبدیل ہوگئی اور ان شعلے نے راجیش کے حصار سے باہر نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا۔

حصار سے باہر نکلنے پر ناکامی پر راجیش جھنجھلا گیا اور اس نے پنڈت کی جانب دیکھتے ہوئے پھر ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی مندر کی چھت کی جانب دیکھتے ہوئے ایک تیز پھونک ماری، جیسے ہی راجیش نے پھونک ماری مندر کے اندر ہوائیں چلنے لگیں۔ ہوا تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے تیز آندھی چل رہی ہو مندر میں دھول مٹی کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا تیز ہوا کی وجہ سے مندر میں کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا، بڑے دادا اور ظفر مندر کے دیوار سے چپکے کھڑے تیز ہوا کا مقابلہ کر رہے تھے ان کے قدم بار بار اکھڑ جاتے مگر پھر وہ مضبوطی سے زمین پر قدم جما لیتے میرے لئے بھی مندر کے فرش پر قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا میں نے اپنے دانت زور سے بھینچے اور نقش کو مضبوطی سے تھاما اور اپنے اکھڑے قدم مندر کے فرش پر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔

پنڈت سوامی نارائن بھی تیز ہوا سے پریشان تھا ہوا بار بار پنڈت کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی مگر پنڈت پھر بھی مضبوطی سے اپنی جگہ جما منتر الاپ رہا تھا حیرت انگیز طور پر اتنی تیز ہوا کے باوجود موم بتیاں جل رہی تھی، ہوا ان موم بتیوں کی روشنی کو بجھا نہیں پا رہی تھی اسی طرح ہون میں آگ بھی جل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ آندھی کا زور ٹوٹ گیا اتنی تیز آندھی کے باوجود ہم سب اپنی جگہ جمے کھڑے رہے اپنا یہ وار خالی جاتا دیکھ کر راجیش اودھا پاگل ہوگیا وہ زور زور سے دھاڑنے لگا۔ پنڈت سوامی نارائن نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے نقش اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس کا رخ راجیش کی جانب کیا، نقش دیکھ کر راجیش اودھا ڈر گیا۔

''جاؤ۔۔چلے جاؤ۔۔واپس اپنی مورتی میں چلے جاؤ۔۔چھوڑ دو۔۔۔چھوڑ دو سیما کو۔۔''میں نے نقش راجیش کے چہرے کے سامنے کیا تو راجیش کے منہ سے ڈری ڈری چیخیں نکلنے لگیں وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹنے لگا مگر موم بتیوں کے لو نے اسے مزید پیچھے ہٹنے سے روک دیا۔ راجیش بری طرح چیخ رہا تھا۔

اچانک راجیش اوپر کی جانب اٹھنے لگا اسی وقت پنڈت سوامی نارائن نے کالی ماتا کے سامنے رکھے سیندور میں سے تھوڑا سا سیندور لیکر فضا میں اچھالا تو وہ سیندور سیدھا راجیش اودھا کی جانب گیا، جیسے ہی سیندور راجیش کے بدن پر پڑا سیما کے اندر قابض راجیش اودھا نے ایک تیز چیخ ماری اور پھر سیما کے منہ ناک اور کانوں سے سیاہ دھواں نکلنے لگا جب سیما کے اندر سے سارا سیاہ دھواں نکل گیا تو سیما دھڑام سے بے ہوش ہوکر گر پڑی اور سیاہ دھوئیں نے ایک انسانی شبیہ بنالی وہ انسانی شبیہ راجیش اودھا کی تھی۔ راجیش اودھا سیدھا اپنی مورتی تک پہنچا اور سارا سیاہ دھواں مورتی میں سما گیا۔

جیسے ہی سارا دھواں مورتی کے اندر گیا پنڈت انتہائی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے سیاہ مورتی کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اپنے گلے میں پڑے سیاہ دھاگے کو نکال کر مورتی کے گرد اس طرح لپٹنے لگا

جیسے کسی انسان کو زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے، مورتی کے گرد سیاہ دھاگا لپیٹنے کے بعد پنڈت نے فاتحانہ انداز میں ہماری جانب دیکھا، میں نے پنڈت کی جانب دیکھنے کے بعد ظفر کو اشارہ کیا کہ وہ سیما کو سنبھالے جو بے ہوشی کی حالت میں مندر کے فرش پر پڑی تھی۔ میرا اشارہ پاتے ہی ظفر لپک کر سیما تک پہنچا اور سیما کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے ہوش میں لانے لگا، تھوڑی کوشش کے بعد سیما کو ہوش آگیا، سیما کو ہوش آنے کے بعد ظفر نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا سیما بہت نڈھال ہورہی تھی وہ ظفر کا سہارا لیکر کھڑی ہوگئی تھی مگر اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

''اب سیما راجیش کے اثر سے آزاد ہے'' پنڈت ہمارے قریب آتے ہوئے بولا ''راجیش دوبارہ اپنی مورتی کے اندر چلا گیا ہے''

''اس مورتی کو نیست و نابود کردینا چاہیے تاکہ بعد میں کبھی راجیش واپس نہ آسکے'' ظفر پنڈت کی بات سن کر بولا۔

''اس مورتی کو نشٹ نہیں کیا جاسکتا'' پنڈت نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''راجیش اودھا کے پاس بھی بڑی طاقت ہے وہ کالی شکتیوں کا ماہر ہے اور پھر راجیش کے ساتھ بہت نا انصافی ہوئی تھی اس نے تو صرف محبت کی تھی کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔'' پنڈت بولا۔

''اس کا مطلب ہے راجیش پھر کبھی واپس آکر نقصان پہنچا سکتا ہے'' بڑے دادا جو اتنی دیر سے خاموش کھڑے باتیں سن رہے تھے بول اٹھے۔

''راجیش صرف کھیا کے خاندان کا دشمن ہے وہ کسی اور شخص کو نقصان نہیں پہنچائے گا'' پنڈت بڑے دادا کی بات سن کر بولا۔

''لیکن کھیا کے خاندان کا دشمن تو وہ رہے گا نا'' بڑے دادا حجت کرتے ہوئے بولے۔

''راجیش کبھی بھی ہنزہ ویلی سے باہر نہیں جاسکتا کھیا کے خاندان کے کسی بھی افراد کو چاہیے کہ وہ کبھی بھول سے بھی ہنزہ ویلی کا رخ نہ کرے'' پنڈت نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے ظفر اور سیما فوراً سے پیشتر ہنزہ ویلی چھوڑ کر واپس چلے جائیں'' میں نے پنڈت سے پوچھا۔

''ان دونوں کے حق میں یہی بہتر رہے گا'' پنڈت نے جواب دیا۔

''اس مورتی کا کیا کروگے''؟ بڑے دادا نے پنڈت سے پوچھا۔

''اس مورتی کو میں زمین کی گہرائی میں دفن کردونگا'' پنڈت نے اپنے ہاتھ میں پکڑی سیاہ مورتی کو لہراتے ہوئے جواب دیا۔

''میں کل صبح ہی ہنزہ چھوڑ دونگا'' ظفر پنڈت کی بات سن کر بولا۔

''اور تمہارے پروجیکٹ کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کمپنی کو صاف جواب دے دونگا کہ میں ہنزہ میں نہیں رہ سکتا کسی دوسرے شخص کو یہ پروجیکٹ سونپ دیا جائے۔۔اگر کمپنی نے میری بات مان لی تو ٹھیک ورنہ یہ نوکری چھوڑ دونگا۔۔زندگی رہی تو اور بہت نوکریاں مل جائیں گی'' ظفر نے تفصیل سے جواب دیا تو میں اطمینان بھرے انداز میں سر ہلانے لگا۔

اگلی صبح میں ظفر اور سیما پی آئی اے کے فوکر میں بیٹھے اسلام آباد جارہے تھے جہاز آہستہ آہستہ ہنزہ سے دور ہوتا جارہا تھا میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر ہنزہ ویلی کی سرسبز وادیوں کو دیکھا جہاں رنگ برنگے پھول لہرا رہے تھے اور ان ہی لہراتے پھولوں کی سرزمین میں کسی گہرائی میں راجیش اودھا اپنی تمام کالی شکتیوں کے ساتھ مدفون تھا۔ میں نے جہاز کی نشست سے اپنی پشت لگائی اور اپنا سر پیچھے کرکے جہاز کی سیٹ پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔



پراسرار ہوٹل

اسداللہ بھٹی۔ بھکر

چند لمحوں کی کشمکش کے بعد نوجوان ذہنی طور پر بلا سے مقابلے کے لئے تیار ہوچکا تھا اور پھر بجلی کی تیزی کے ساتھ داھنا پنجہ کو نہایت برق رفتاری سے اس بلا کے پیٹ میں جڑ دیا۔

اکثر انسان مستی اور خرمستی کی وجہ سے موت کو گلے لگالیتا ہے، دل فگار حیرانگیز کہانی

جوں جوں موسم گرما کی چھٹیاں قریب آرہی تھیں۔ ان تینوں دوستوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ کیونکہ اس مرتبہ ان کا مری جانے کا منصوبہ تھا۔ یہ تینوں دوست احتشام، قدیر خان اور اسحاق ہر مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں سرد علاقوں میں گھومنے پھرنے جاتے تھے۔ تینوں بہت گہرے دوست اور ایک ہی محلہ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے والدین کی بھی آپس میں خوب بنتی تھی اور تینوں ہی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے اس لیے تو انہیں ہر مرتبہ سرد علاقوں میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔

تینوں دوست سفر کی تیاریوں میں مگن تھے۔ اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تیاریوں میں مگن تھے۔ آخر کار وہ دن بھی آگیا جس دن کا ان تینوں کو بے صبری سے انتظار تھا۔ وہ ماں باپ کی دعائیں لیتے ہوئے اپنے سفر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ تینوں ایک پرائیویٹ گاڑی میں محو

سفر تھے اور اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیئے بے تاب تھے۔ پانچ گھنٹے کے لمبے سفر کے بعد وہ مری جیسے پرفضا مقام پر پہنچ گیئے۔ ان تینوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی جب گاڑی نے انھیں دوپہر کے وقت انکی منزل مقصود پہنچا دیا۔

وہ تینوں رات گیئے تک گھومتے رہے۔ انھیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور ہر طرف رات کی سیاہی گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ گھومتے گھومتے بہت دور تک چلے گیئے۔ اس غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ کافی دور تک نکل گیئے، جہاں دور دور تک کسی ہوٹل کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ وہ تینوں بہت پریشان ہوئے کیونکہ رات گزارنے کے لیئے انھیں کسی محفوظ مقام کی ضرورت تھی۔ اور یہاں دور دور تک کہیں کسی محفوظ مقام کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

وہ تینوں اسی پریشانی میں تھے کہ انھیں دور برقی قمقموں کی جھلک نظر آئی وہ تینوں بہت خوش ہوئے اور اپنے مایوس اور لڑکھڑاتے قدموں کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وہ جلد از جلد اس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد انہیں ایک ہوٹل کا سائن بورڈ نظر آیا ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ان کے لڑکھڑاتے قدموں کی رفتار مزید تیز ہوگئی اور وہ چلتے چلتے اس ہوٹل کے صدر دروازے تک پہنچ چکے تھے ہوٹل کے قریب پہنچنے پر انکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ جو ہوٹل بظاہر دیکھنے میں پر رونق نظر آتا تھا وہ پر رونق نہ تھا بلکہ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی ایک عجیب سی دہشت برس رہی تھی۔ بالآخر وہ تینوں صدر دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ ہوٹل کے اندر بھی اچھی خاصی وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ تینوں اندر ہی اندر گھبرائے جا رہے تھے۔

ہوٹل ویران و سنسان تھا۔ اور مزید برآں یہ کہ ہوٹل میں ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر اک چیز سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ تینوں بدروحوں کے دیس میں آگئے ہوں جہاں وحشت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔ بالآخر ان تینوں نے اپنے خوف کو بالائے طاق رکھ کر اپنے قدم استقبالیہ کاؤنٹر کی جانب بڑھا دیئے۔ استقبالیہ پر کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھی، احتشام نے چند منٹ ویٹ کرنے کے بعد استقبالیہ کاؤنٹر کو اپنے ہاتھ سے بجانا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد بغلی دروازے سے ایک شخص برآمد ہوا چند منٹ کی گفتگو کے بعد سیکنڈ فلور پر انھیں ایک کمرہ دے دیا گیا ایک ملازم کے ہمراہ وہ سیکنڈ فلور پر کمرہ نمبر پانچ میں پہنچ گیے۔

کمرے میں اٹیچ باتھ روم غرض یہ کہ کمرے میں ضروریات زندگی کا تمام سامان موجود تھا۔ وہ تینوں باری باری گرما گرم پانی سے نہانے کے بعد مکمل طور پر فریش ہو چکے تھے۔ گرما گرم کھانا تناول فرمانے کے بعد وہ تینوں آپس میں محو گفتگو ہو گیے۔

☆......☆......☆

"یار مجھے تو یہ ہوٹل کم اور بھوت بنگلہ زیادہ لگتا ہے۔" احتشام نے گفتگو میں پہل کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو ہر چیز کو ہی آثار قدیمہ سے ملانے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔" اسحاق نے جل بھن کر کہا۔

احتشام نے قدیر کو گہری سوچ میں گم دیکھا تو اسے مزاح سوجھی تو اس نے کہا۔ "تم اتنا مت سوچا کرو ورنہ سر کے بال خزاں رسیدہ پتوں کی مانند جھڑ جائینگے۔" قدیر جو ابھی تک ان کی بکواس سنے جا رہا تھا کسی گہری سوچ میں گم تھا پر احتشام نے فقرہ کسا۔

"یار اس کو سوچنے دو یہ قائداعظم کی طرح نیا ملک بنانے کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہا ہے۔" اسحاق نے طنز کیا اور وہ تینوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"ہمیشہ سوچ کر کام کرنے والے ہی کامیاب ہوا کرتے ہیں نہ کہ تم جیسے جاہل، وہ سیانے کہتے ہیں نا کہ "عالم کا ایک دن جاہل کے ساتھ ساری زندگی گزارنے سے بہتر ہے" قدیر جو ابھی تک ان کی بکواس سنے جا رہا تھا طنزا یہ کہا۔

"ان کی سنیئے جن کی کوئی نہیں سنتا ہو وہ کہتے ہیں نا کہ "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" ان صاحب کی مثال بھی اسی کی طرح ہے۔" اسحاق نے بھی فطرتاً قدیر کی بات میں کہا۔ خیر اسی طرح کافی دیر تک وہ آپس میں محو گفتگو رہے

اور ایک دوسرے پر طعنے بازی کرتے رہے۔

"مجھے تو نیند آرہی ہے بھئی۔" احتشام جو کافی دیر سے انکی گفتگو سنے جا رہا تھا اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"تم تو ہو ہی فراڈ جب دیکھتے ہو کہ بازی پلٹ رہی ہے تو تمھیں نیند آنی شروع ہو جاتی ہے۔" قدیر نے احتشام پر فقرہ کستے ہوئے کہا جو اسحاق پر سبقت لیئے جا رہا تھا۔

"یار نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔" اسحاق نے بھی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

بالآخر وہ تینوں سونے کے لیئے چل دیئے اور اپنے اپنے بستروں میں لحاف اوڑھ کر سوتے بنے۔ چند منٹ بعد کمرے میں ان تینوں کے خراٹے گونج رہیا، اور وہ تینوں دنیا و مافیا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں گم ہو گیے۔ چند منٹ پہلے ڈائننگ ٹیبل کے گرد جہاں وہ تینوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اب وہاں ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی ان تینوں کی جانب کن انکھیوں سے انھیں دیکھ رہی تھی اسکی آنکھوں میں ایک انجانی چمک تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اسکی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

ان تینوں کو ابھی سوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی۔ کہ اچانک اسحاق کی آنکھ کھل گئی۔ اسحاق کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ ان تینوں کے گرد مٹر گشت کر رہا ہو لیکن غور سے دیکھنے پر بھی اسے کچھ نظر نہ آیا تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا اور اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے اٹھا اور اپنے قدم رفع حاجت کے لیئے باتھ روم کی طرف بڑھا دیئے۔

باتھ روم سے فراغت کے بعد وہ دوبارہ سونے کی غرض سے اپنے بستر کی جانب بڑھا بستر کے قریب پہنچ کر وہ سونے ہی والا تھا کہ یکا یکی دروازے پر دستک ہوئی ٹھک۔۔۔۔۔ٹھک۔۔۔۔۔ٹھک؟؟؟ ٹھک۔۔۔۔۔ٹھک۔۔۔۔۔؟؟؟

"رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟" اسحاق منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا دروازے کی جانب بڑھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا مگر باہر دور دور تک اندھیرے کا راج تھا ہوٹل گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا پورے ہوٹل کی لائٹس گل کر دی گئی تھیں اسحاق نے اپنے قریب و جوار کا جائزہ لیا لیکن اس ایسا کوئی شخص نظر نہ آیا جس نے دروازے پر دستک دی ہو۔

اسحاق دوبارہ دروازہ بند کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے لگا جیسے کوئی دھیمی چال چلتا ان کے کمرے کے قریب سے گزرا ہو اس نے اپنا ارادہ ترک کیا اس کے ذہن میں مختلف اقسام کے وسوسے جنم لینے لگے اس کے دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہوگئی اچانک اسے دبی دبی چیخ کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب کے کمرے سے آرہی تھی اسکے دل میں تجسس نے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا، وہ بچپن سے ہی ایڈونچر پسند تھا۔ اور ہر چیز کا بغور جائزہ لیتا تھا۔

اس نے اپنے پلٹتے قدم واپس لیئے اور کمرے سے باہر نکل آیا کمرہ کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد اس نے اپنے قدم اس کمرے کی جانب بڑھا دیئے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے تک آپہنچا اور دروازے کے ساتھ اپنے کان لگا دیئے آواز کسی عورت کی تھی جو دبی دبی آواز میں سسکیاں لیتی ہوئی رو رہی تھی۔ اسحاق نے اپنے خوف کو بالائے طاق رکھ کر جھٹ سے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا دروازہ چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا کھلتا چلا گیا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا رونے اور سسکنے کی آوازیں اچانک بند ہو گئیں۔

اسحاق کے دل میں ایک بار پھر خوف نے تسلسل جمانا شروع کر دیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا لیکن کمرے میں اس کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے دل میں تجسس نے گھر کرنا شروع کر دیا۔ تجسس کی بنا پر اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر روشن کر لیا۔ موبائل کی ٹارچ کی روشنی بامشکل ہی کمرے کے اندھیرے پن کو روشن کرنے میں ناکافی تھی لیکن وہ اس کم روشنی میں ہی کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

وہ کمرے میں چہار سو جائزہ لے رہا تھا۔ کہ اچانک اس کے ہاتھ سے اس کا سیل فون چھوٹ کر کمرے کے فرش سے ٹکرا کر آف ہو گیا۔ اور ایک سایہ اس کی سمت بڑھنا

شروع ہوگیا،وہ چیخ کر گرا اور دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔

☆......☆......☆

ٹھک ـــــ ٹھک ـــــ ٹھک ـــــ؟؟؟

ٹھک ـــ ٹھک ـــ ٹھک ـــ؟؟؟

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور احتشام کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھل گئی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی زور زور سے دروازے پر دستک دے رہا ہو وہ دروازہ کھولنے کی غرض سے اٹھا اور منہ ہی منہ میں نا جانے کیا بڑبڑاتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا مگر دروازے کے باہر کوئی نہ تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا تاکہ دروازہ کھٹکھٹانے والے کا سراغ لگا سکے مگر دور دور تک کوئی نہ تھا۔ ہوٹل مکمل طور پر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا، ہر طرف گھپ اندھیرے کا راج تھا۔

وہ ہر طرف سے مایوس ہوکر واپس پلٹا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا لیکن ابھی وہ چند قدم ہی چلا ہوگا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے اس کے نام سے پکارا ہو۔ اس نے رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا دیکھا مگر اسے دور تک کوئی نظر نہ آیا اس نے اسے اپنا وہم سمجھا اور سر کو جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیا ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت تیزی سے اس کے قریب سے گزرا ہو۔ اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہ تھا۔

وہ اس بات پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ اسے پائل کی جھنکار سنائی دی۔ پائل کی جھنکار ایسی تھی جیسے کوئی عورت پاؤں میں پائل پہنے دھیمی دھیمی رقص کر رہی ہو اور آواز قریب کے کمرے سے آرہی تھی۔ وہ چند ثانیے پائل کی جھنکار پر غور کرتا رہا اور پھر اپنے قدم اس کمرے کی طرف بڑھا دیئے۔

کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو دروازہ چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ اندر مکمل طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ احتشام نے تجسس کے مارے اپنی پتلون کی جیب سے موبائل نکال کر اس کی لائٹ روشن کر لی اور ادرگرد جھانکنے لگا۔ مگر بے سود کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا وہ مایوس ہوکر واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے سناٹے میں ایک آواز سنائی دی آواز ایسی تھی جیسے کوئی چیز اپنی جگہ سے کھسکی ہو۔

اس نے ایک مرتبہ پھر گھوم کر پیچھے دیکھا تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا احتشام اندر تک ہل کر رہ چکا تھا۔ احتشام اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اپنے لمبے اور نوکیلے دانت اس کی شہ رگ میں پیوست کر دیئے اور اسکے گرما گرم خون سے اپنی پیاس بجھانے لگا۔ اس بلا نے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک بوند تک چوس لی تھی۔

تازہ گرما گرم خون پینے کے بعد اس میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور پھر اس نے وحشیانہ طریقے سے اس کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ اس نے اسکا سارا گوشت نوچ کھایا اور بالآخر اس کا بغیر گوشت پوست کے ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ لیکن اس کی وحشیانہ بھوک و پیاس ابھی تک نہ بجھی تھا۔ اور وہ اک نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

قدیر کمرے میں مزے سے سو رہا تھا کہ اچانک اسکی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ لیکن اسکی آنکھ کیوں کھلی اسکی وجہ قدیر کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا ہر طرف سناٹے کا راج تھا تاریکی ہر سو مسلط تھی۔ سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھا کر گلاس کو پانی سے بھرا اور پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ پانی پینے کے بعد، وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا بستر پر دراز ہوکر آنکھیں موند لیں۔ اور سونے کی ناکام کوشش میں لگ گیا۔

وہ بستر پر آنکھیں موندھے لیٹا تھا۔ کہ اچانک اسے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ چیخ کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی اور کسی عورت کی تھی۔ قدیر کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جاگا اور وہ پریشان ہوگیا کہ رات کے اس پہر کس بد نصیب کی چیخ تھی۔ وہ ہمدردی کے جذبے سے اٹھا اور

دروازے کے قریب پہنچ کر آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ایک عورت کمرے میں بیٹھی اس کو باہر نکلتا دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس بدصورت عورت کی ہنسی بہت پراسرار تھی۔ اور وہ آنے والے لمحات کا تصور کرکے خوشی سے جھوم اٹھی۔

قدیر کمرے سے نکل کر باہر راہداری میں آگیا پھر ادھر ادھر جھانکنے لگا اور آواز کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے کمرے سے باہر آتے ہی آواز بھی بند ہوگئی۔ ہر طرف مکمل سناٹے کا راج تھا، رات اپنے پر پھیلائے خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ معلوم پڑتا تھا کہ رات اپنی سیاہی میں کل کائنات کو اپنے اندر سمو لے گی۔ ایسی خاموشی میں کہیں دور سے جھینگروں کی آواز اس خاموشی کو کم کرنے میں اپنی ناکام کوششوں میں لگی ہوئی تھی

-

وہ کمرے سے نکلنے کے بعد ریلنگ کے قریب کھڑا ہوگیا اور آواز کی سمت کا تعین کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی انجانی قوت اسکے قریب کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی ہو۔ اس نے بہت غور کیا مگر اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا اور کمرے میں جانے کی غرض سے جیسے ہی گھوما اپنے پیچھے کھڑے انجانے وجود کو دیکھ کر اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اور وہ ہوش وحواس سے بےگانہ ہوتا چلا گیا۔

اور جب قدیر کو ہوش آیا تو خود کو ایک تاریک کمرے میں بند پایا، اندھیرا اتنا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اور اس تاریکی میں دو روشن آنکھیں ودیر کو مسلسل گھورے جارہی تھیں۔ اور قدیر ان آنکھوں کی تاب نہ لا کر کسمسا کر ہوش وحواس کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ اسکے ہوش میں آتے ہی اچانک کمرہ آنکھوں کی بینائی کو اچک لے جانے والی روشنی سے منور ہوتا چلا گیا۔

کمرے میں اچانک اس قدر روشنی ہوجانے سے قدیر نے چند لمحات کے لیئے اپنی آنکھوں کو بھینچ لیا۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو خود کو اس انجانے کمرے میں دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کمرے میں اردگرد جھانکنے لگا اور پھر جیسے ہی وہ پیچھے گھوما اپنے سامنے اس قدر خوفناک وجود کو دیکھ کر اسے خوف محسوس ہونے لگا اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب گھسٹتا چلا گیا۔ اسی طرح گھسٹتے گھسٹتے وہ دیوار سے جا لگا اور وہ خوفناک وجود بھی اسی کی جانب بڑھنے لگا۔

چند لمحوں بعد وہ بلا اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ وہ بلا قدیر کے اس قدر قریب پہنچ چکی تھی کہ قدیر اسکے سانسوں کی گرمائش کو اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔

اس خوفناک بلا کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر قدیر کے خون نے جوش مارا اور قدیر اس بلا سے نمٹنے کے لئے خود کو مکمل طور پر مقابلے کے لیئے تیار کرنے لگا۔

چند لمحوں کی ذہنی کشمکش کے بعد وہ ذہنی طور پر مقابلے کے لئے اس قدر تیار ہو چکا تھا۔ کہ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنے آپ کو اس بلا کے مقابلے میں اتر جانے کے لئے تیار کر لیا۔ اور پھر بجلی کی تیزی سے اپنا داہنا پنچ کو نہایت برق رفتاری سے اس بلا کے پیٹ میں جڑ دیا۔

وہ بلا اس غیر متوقع حملے سے خود کو نہ بچا پائی اور اپنے بائیں ہاتھ کو پیٹ پر درد کے مقام پر رکھ لیا۔ اور اپنے بکھری سانسوں کو بحال کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک بار پھر قدیر کی جانب بڑھنے لگی۔ اور اب وہ اسکی جانب سے مکمل طور پر ہوشیار تھی۔ اور محتاط انداز میں اسکی جانب بڑھنے لگی۔

اور پھر اس نے برق رفتاری سے قدیر کو دبوچ لیا اور اسکی شہ رگ کو تلاش کرنے کے بعد اسکی شہ رگ پر اپنے لمبے لمبے دانت گاڑنے ہی والی تھی کہ معاً اس کا ہاتھ قدیر کی گردن میں پڑے تعویز سے ٹکرا گیا، اور تعویز کے ٹکراتے ہی وہ اچھل کر کافی دور جا گری۔ اس بلا کے زمیں سے ٹکراتے ہی زمین زلزلے کی مانند ہلنے لگی اور پھر چند لمحات بعد ساکت وجامد ہوگئی۔

زمینی زلزلہ رکتے ہی وہ بلا نہایت خوفناک انداز میں اٹھی اور قدیر کی جانب ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ قدیر کے قریب پہنچ کر اس بلا نے ایک لمبی جست لگائی اور قدیر کو دبوچتے ہوئے کافی دور گھسیٹ کر دور لے گئی۔ مزید اس کے اچانک حملے سے گھبرا گیا اور اسکا سانس دھونکنی کی مانند

چلنے لگا۔

چند سیکنڈ تک وہ خود کو ایک بار پھر مقابلے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ وہ خوفناک بلا اور قدیر آپس میں گتھم گتھا تھے کہ قدیر نے اچانک موقع پا کر اس بلا کے پیٹ پر مضبوطی سے اپنی ٹانگیں جما کر پورے زور سے بلا کو خود سے پرے دھکیل دیا۔ اور خود کمرے سے باہر دوڑ لگا دی کمرے سے باہر نکل کر وہ ایک جانب دوڑنے لگا کہ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگنے سے دھڑام کی آواز پیدا کرتا ہوا نیچے گرا، اور قلا بازیاں کھاتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اور جیسے ہی دوبارہ اٹھ کر بھاگنے لگا تو خود کے سامنے اس بلا کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

بلا نے قدیر کو دیکھتے ہی قہقہے لگانے شروع کر دیئے "ہا ہا ہا......ہا ہا ہا......تم مجھے جل دے کر کہاں بھاگو گے مہاراج.........؟؟؟"۔

قدیر ایک بار پھر اس بلا کو اپنے سامنے دیکھ کر دوسری طرف کو دوڑنے لگا۔ وہ اس بلا کے قہقہے سن کر گھبرا گیا اور ایک بار پھر اوندھے منہ گرا۔ اس بار وہ گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑا ہوتے ہی دفعتاً اس کے کانوں میں بھاری اور رعب دار آواز گونجی "اے بالک! اس طرح مصیبتوں سے گھبرا کر بھاگنے سے مشکلات ٹل نہیں جاتیں مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے ہی ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ تمہارے گلے میں جو برگزیدہ بزرگ کا بخشا ہوا تعویز پڑا ہے اسے اتار کر اس بلا کی گردن میں ڈال دے تیری مشکل حل ہو جائے گی" اور پھر آواز اچانک بند ہو گئی۔

قدیر کے دماغ میں اس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ "مشکلات سے گھبرانے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے"

قدیر نے جلدی سے اپنی گردن میں پڑا ہوا اس برگزیدہ بزرگ کا بخشا ہو تعویز گردن سے نکال کر اس بلا کی جانب دوڑ لگا دی بلا اس کو اپنی جانب آتا دیکھ کر خوش ہو گئی۔

قدیر بھاگتا ہوا اس بلا کے قریب گیا۔ بلا اس کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر سرشار ہو گئی اور اس کی شہ رگ پر اپنے دانت گاڑنے کے لئے اپنا منہ اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور اپنے لمبے دانت اس کی شہ رگ میں گاڑنے ہی والی تھی کہ قدیر نے جلدی سے مٹھی میں دبا تعویز بلا کی گردن میں ڈال دیا۔ تعویز گردن میں ڈالنے کی دیر تھی کہ وہ بلا ایسے اچھلی جیسے بے خبری میں ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

تعویز اس کی گردن میں جا کر اس کے جسم سے چمٹ گیا اور اس کی چیخ و پکار سے در و دیوار تک ہلتے محسوس ہوئے۔ اور وہ بلا چند سیکنڈ میں راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اس بلا کے راکھ ہوتے ہی ہوٹل کے در و دیوار بھی ہلنے لگے۔ دفعتاً ایک بار پھر قدیر کے کانوں میں وہی آواز گونجی۔

"اے بالک! بھاگ اس ہوٹل سے یہ ابھی زمین بوس ہو جائے گا"

قدیر نے وہ آواز سنتے ہی باہر کی جانب بھاگنے لگا۔ چند سیکنڈ کے عرصے میں وہ ہوٹل کی چار دیواری سے باہر تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ہوٹل زمین بوس ہو گیا اور چند لمحات میں اس کا سارا ملبہ بھی غائب ہو گیا۔

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سناٹے نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ اچانک قدیر کو اپنے ساتھیوں کا خیال آیا تو وہ تڑپ اٹھا وہ یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر وہ آواز گونجی.........؟؟؟

"بالک! تیرے دوست اس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ان کے غم میں افسردہ نہ ہو اور جلد از جلد گھر جا تیری ماں تیری راہ تک رہی ہے۔ جا گھر جا اور اپنے دوستوں کو بھول جا وہ اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔" اور پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ آواز کے بند ہوتے ہی قدیر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ چند لمحوں بعد جب اس کا غم ہلکا ہو گیا تو اس نے اپنے قدموں کو ایک جانب ڈال دیا۔

یہ بات رہ رہ کر اس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ جب انہوں نے اس ہوٹل میں قیام کیا تھا تو تین تھے اور اب صرف ایک بچا تھا۔ اسے اپنے دوستوں کی موت کا بہت زیادہ غم تھا۔ "لیکن اب روت دھوت کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

کربناک انجام

ملک این اے کاوش۔سرگودھا

اچانک بڑے گیٹ پر ایک منحنی مجذوب نمودار ہوا اور باہر نکلتے لحیم شحیم نوجوان کو اپنے ہاتھوں سے جھٹکا دیا تو نوجوان ہوا میں اڑتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا تو اس کی فلک شگاف چیخ سے قرب و جوار دہل گیا۔

قانون قدرت سے انحراف انسان کو نشان عبرت بنا دیتا ہے، دل گرفتہ حقیقت

تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے اس نے اپنے سامنے کھڑے بدصورت جانور نما انسان کا سر قلم کر دیا اور اس کے دھڑ کے درجنوں ٹکڑے کر دیئے وہ بری طرح ہانپ رہا تھا دوڑ دوڑ کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا تب ہی اس نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا اس بدصورت جانور نما انسان کے بکھرے ہوئے اعضاء حرکت کرنے لگے، خون کی بوندیں اکٹھی ہونے لگیں اور پلک جھپکتے میں وہ بدصورت انسان اس کے سامنے ایک بار پھر اپنی تمام تر خوفناکیت کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اس بدصورت بلا کا مقابلہ کرنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی اس کا پورا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ بمشکل تمام وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اٹھتے ہوئے تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی تب ہی اس بدصورت بلا نے غراتے

ہوئے اس پر حملہ کیا تو اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

☆......☆......☆

اس کا نام شہروز خان تھا۔ مسلسل تیسری بار وہ ایم این اے بنا تھا۔ سیاست میں اس کے خاندان کا برسوں پرانا تجربہ تھا۔ اس کا باپ زمان خان وزیر قانون کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس کا دادا دوبارہ تیسری بار وزیر اعلیٰ بنا تھا۔ اس کی ماں بھی ایم این اے تھی۔ بس اس کی اکلوتی بہن کو سیاست سے بے پناہ نفرت تھی وہ ایک سوشل ورکر تھی۔

اس کی بہن کا نام زلیخا تھا۔ زلیخا ایک پرائیویٹ چینل میں ایک پروگرام کی میزبانی کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ماڈلنگ میں اس نے نام کمایا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس میں رتی برابر بھی غرور وتکبر نہ تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی خدمت کو اپنا فریضہ سمجھتی تھی۔

شہروز خان کو شروع سے ہی پیسے اور حسن سے بہت پیار تھا کتنی ہی کھلتی کلیوں کو اس نے مسلا تھا۔ لیکن ایک واقعہ نے اس کے شب وروز میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا شہروز ہمیشہ جوان رہنا چاہتا تھا وہ اپنی زندگی کو بھرپور انجوائے کرنا چاہتا تھا حال ہی میں اس کی شادی ایک وزیر کی پوتی سے ہوئی جس سے اس کی دو بیٹیاں تھیں وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ہی اس کے سر کے بالوں میں سفیدی بڑھنے لگی تو اس کی پریشانی میں ویسے ویسے اضافہ ہونے لگا۔

اس نے ایک ساتھ ایسی سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کرلیا جن میں سدا جوان رہنے سے متعلق بے شمار تراکیب فارمولے اور دیسی وانگریزی علاج بتائے گئے تھے مگر اس کا دل ان باتوں سے متاثر نہ ہوسکا ایک سہ پہر وہ شہر کی مشہور لائبریری میں پہنچ گیا وہاں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے لائبریرین سے علیحدگی میں بات کرنے کا کہا تو لائبریرین اسے اپنے علیحدہ آفس میں لے گیا۔

''میں تم سے ایک نہایت ہی اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔'' شہروز خان نے لائبریرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو لائبریرین نے حیرت وپریشانی کے ملے جلے تاثرات میں اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

''امید ہے یہاں ہونے والی گفتگو کے بارے میں کبھی کسی کو بھنک تک نہیں پڑے گی؟''

''آپ اعتماد رکھیں۔'' لائبریرین نے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''مجھے کوئی ایسی کتاب دو جس میں سدا جوان رہنے کا کوئی نایاب فارمولا موجود ہو۔'' شہروز خان بولا تو لائبریرین نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''میں ہمیشہ جوان رہنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟''

شہروز خان کی سوالیہ نگاہیں لائبریرین پر مرکوز تھیں لائبریرین کے چہرے پر دھنک کے رنگ آتے جاتے اسے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔'' لائبریرین سوچتے ہوئے بولا۔

''مجھے موت سے ڈر لگتا ہے، میں ابھی مرنا نہیں چاہتا، میں برسوں جینا چاہتا ہوں۔'' شہروز خان نے دل کی بات کی۔

''ایسے کاموں میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔'' لائبریرین بولا۔

''مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔'' شہروز خان بولا۔

''میں پانی کی طرح پیسہ بہادوں گا مگر میں اپنی خواہش کو ہر صورت عملی جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔''

''اس کام میں پیسہ نہیں ایمان داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔'' لائبریرین بولا تو شہروز خان کو اپنی رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' شہروز خان نے حیرت کا مجسمہ بنے ہوئے پوچھا۔

''کالے علم کی بدولت آپ اپنی خواہش پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس ایسی طاقتیاں

آجائیں گی کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت آپ کا بال تک بیکا نہیں کرپائے گی مگران سب کے لئے ایمان کی دولت سے ہاتھ دھونا لازم وملزوم ہیں۔''

لائبریرین کی بات سن کر شہروز خان سوچ میں پڑ گیا کافی دیر سوچنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔

''کیا تمہارے پاس کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں یہ سب کچھ موجود ہو؟''

''جی ہاں...... میرے پاس ایک بہت ہی بوسیدہ کتاب موجود ہے۔'' لائبریرین نے بتایا۔

''وہ کتاب بنگال کے مشہور جادوگر پنڈت شیواجی ملہوترا کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے انہوں نے اس کتاب کے اندر دنیا کے ہر مسئلے کا حل لکھا ہے وہ کتاب صدیوں پرانی ہے اور ہماری لائبریری کو بڑی مشکل سے ملی ہے وہ کتاب ہم آپ کو دے سکتے ہیں ورنہ کسی کو بھی اس کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے مجھے وہ کتاب منگوادو۔'' شہروز خان بولا۔

لائبریرین نے انٹرکام پر کسی کو فوراً وہ کتاب لانے کا آرڈر دیا۔ اس کی بات کے درمیان میں آفس بوائے چائے اور لوازمات ان کے سامنے میز پر سجا کر دبے قدموں پلٹ گیا۔

''ابھی کتاب آجائے گی۔'' لائبریرین نے بتایا۔

''اتنے تک آپ چائے لیں۔''

''یہ بات کبھی بھی تمہاری زبان سے باہر نہ نکلے۔'' شہروز خان نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں سر یہ بات آپ کے اور میرے درمیان راز ہے۔'' لائبریرین نے کہا عین اسی وقت ایک خوبصورت جوان لڑکی نے آفس کا دروازہ کھولا۔

''کیا میں اندر آسکتی ہوں سر......؟'' لڑکی نے اجازت طلب کی۔

''ہاں آؤ......'' لائبریرین نے کہا اور وہ لڑکی اندر داخل ہوگئی۔

شہروز خان کی نگاہیں جیسے ہی اس پر پڑیں اس کی ہوس بھری نگاہیں اس نوجوان لڑکی پر جم گئیں اس لڑکی نے برائے نام لباس پہن رکھا تھا جو اس کے جسم کے انگ انگ کو عیاں کررہا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں کالے کپڑے میں لپٹی ہوئی کتاب تھی۔ اس کتاب کو کالے کپڑے میں لپیٹ کر پھر اس کتاب کے اوپر باریک زنجیر پھیر کر اسے تالہ لگایا گیا تھا۔

''تم جاسکتی ہو شمین۔'' لائبریرین نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو لڑکی دبے قدموں لوٹ گئی۔

''ہماری لائبریری میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں خفیہ لاکرز میں رکھا جاتا ہے۔'' لڑکی کے جانے کے بعد لائبریرین نے بتایا۔

''ان کتابوں کو اسی طرح زنجیروں میں رکھا جاتا ہے ان کتابوں کو صرف مجھے کھول کر دیکھنے کی اجازت ہے یہ کتابیں ہم ہر کسی کو نہیں دے سکتے بلکہ خاص لوگوں کو دی جاتی ہیں کتاب پہنچانے والے کو معلوم نہیں کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ ہر کتاب کا ایک مخصوص نمبر ہوتا ہے بس اس نمبر کے ذریعے وہ کتاب لاتے ہیں۔ لائبریری کے اصول وضوابط کے مطابق آپ کو کتاب حاصل کرنے کے لئے ہمارا فارم پر کرنا ہوگا۔''

''لاؤ دو مجھے۔'' شہروز خان نے مسکراتے ہوئے کہا اور لائبریرین سے فارم لے کر اسے پر کیا۔

''میں تمہاری اس لائبریری کے لئے خصوصی گرانٹ دوں گا تاکہ تم کتابوں کا مزید ذخیرہ خرید سکو۔''

اتنا کہہ کر شہروز خان نے پچاس لاکھ کا چیک لکھ کر اسے تھمایا تو لائبریرین کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے شاید اس سب کی توقع نہیں تھی۔

''میری مدد کے لئے یہ میری طرف سے خصوصاً تمہارے لئے تحفہ ہے۔ اگر اس کتاب سے استفادہ حاصل ہوا تو تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ پورے ملک میں تمہاری لائبریری کی برانچیں ہوں گی۔''

اتنا کہہ کر شہروز خان اپنی جگہ سے اٹھا۔ لائبریرین نے کتاب پر لپٹی زنجیر کے تالے کی چابی اسے تھمائی

اور کتاب کو پیک کر کے اس کے ساتھ چل پڑا۔

”آپ کا مشکور رہوں کہ آپ نے عزت بخشی۔“ لائبریرین نے شہروز خان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”خوش رہو۔“ شہروز خان نے اس کے ہاتھ سے کتاب تھام کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے چل پڑی۔ لائبریرین نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر تسلی کی کہ چیک موجود ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆......☆

رات کی تاریکی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دسمبر کی یخ بستہ راتوں کے باوجود شہروز خان کو اپنے کمرے میں شدید گھٹن کا احساس ہوا تو اس نے کمرے کی اکلوتی کھڑکی جو کہ باہر صحن کی طرف کھلتی تھی کھول دی کھڑکی کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھڑکی کھولے وہاں کھڑا رہا اور پھر کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ پر آ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں یک لخت بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر رکھی اس کتاب پر جم گئیں جو وہ لائبریری سے لایا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے وہ بہتر ہے یا نہیں، کتنے ہی سوال یکے بعد دیگرے اس کے دماغ میں جنم لے رہے تھے مگر اسے کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کون سا قدم اٹھائے دیوار پر لگے کلاک پر نظر پڑی تو اس نے ڈھائی بجے کا ٹائم دکھایا۔ کافی دیر خیالات سے الجھنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو اٹھایا۔ کالے کپڑے میں لپٹی کتاب کے اوپر بندھی زنجیر کے تالے کو اس نے کھول دیا پھر اس کالے کپڑے کو بھی اتارا تو کتاب کا نام ”جادو نگری“ لکھا ہوا اسے دکھائی دیا۔ اس کے نیچے مصنف کا نام بھی تحریر تھا۔ شہروز خان نے کتاب کو کھولا تو دوسرے صفحے پر اسے ”کالی دنیا میں خوش آمدید“ لکھا ہوا دکھائی دیا۔

پھر نیچے ایک تحریر تھی جس کو پڑھ کر اسے کافی حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ اس میں لکھا تھا۔

”کالی دنیا کے مہاراج شیطان دیوتا کا پجاری بننے کے لئے سب سے پہلے شیطان دیوتا کا تصور ذہن میں رکھ کر اسے سجدہ کرنا لازم ہے اور زبان سے اس بات کا اقرار کرنا کہ میں شیطان دیوتا کو اپنا بھگوان تسلیم کرتا ہوں لازم ہے۔ اس کے بعد ایک نہایت ہی خوب صورت دوشیزہ کی پہلے عصمت دری کرنا اور پھر اس کے خون سے غسل کرنا اور اس کے باقی ماندہ خون کو پی کر، گوشت کو کھانا ہوگا۔ اس کے بعد کالی دنیا کے اسرار خود بخود عیاں ہوتے جائیں گے۔“

یہ تحریر پڑھ کر شہروز خان کو اپنی رگوں میں دوڑتا لہو منجمد ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ لیکن اسے سدا جوان رہنے اور لمبی عمر پانے کا شوق تھا اور یہی شوق اسے تاریکیوں کی طرف لئے جا رہا تھا۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس عمل کو آزمائے گا تب ہی اسے لائبریری میں دکھائی دینے والی لڑکی نوشین یاد آ گئی جسے پہلی نگاہ دیکھتے ہی وہ اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کام کی ابتداء اسی حسینہ سے کی جائے اس سوچ کے آتے ہی اس کے لبوں پر پہلی بار شیطانی مسکراہٹ جلوہ گر ہوئی۔ پہلی بار اس کے چہرے پر خدا کی برستی لعنت دکھائی دی۔

☆......☆......☆

لائبریری سے چھٹی کے بعد جیسے ہی نوشین گھر کے لئے روانہ ہوئی۔ شہروز خان نے گاڑی اس کے قریب روکی تو نوشین نے حیرت سے اسے دیکھا اور پہلی نگاہ میں پہچان گئی۔

”سر آپ۔“ نوشین نے پوچھا۔

”ہاں وہ میں یہاں سے گزر رہا تھا تو تم پر نگاہ پڑ گئی۔“ شہروز خان نے سفید جھوٹ بولا۔

”چلو آؤ میں تمہیں گھر پر ڈراپ کر دوں گا۔“

”تھینکس سر۔“ نوشین بولی۔

”چوک میں رکشے مل جاتے ہیں میں چلی جاؤں گی۔“

”کم آن پلیز۔“ شہروز خان بولا تو چار و ناچار نوشین کو اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

وہ بے چاری کہاں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر اس نے زندگی کی کتنی بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ تو شیطان کے چنگل میں بری طرح سے پھنس رہی تھی۔

”یہ آپ کہاں جا رہے ہیں میرا گھر اس طرف نہیں ہے۔“ نوشین یکدم تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

”اوہ کم آن بے بی اتنی بھی کیا جلدی ہے گھر جانے کی۔“ شہروز خان نے خبیثانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایکسکیوزمی سر، پلیز مجھے اتار دیں۔“ نوشین نے احتجاج کرتے ہوئے کہا لیکن تب تک شہروز خان اپنی شہر سے باہر والی حویلی میں پہنچ چکا تھا۔

اس نے گھنٹی بجائی تو ملازم نے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے گیا اور گیراج میں روکی۔ ملازم دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس نے جیب سے پیسوں کی ایک گڈی نکالی اور اسے تھمائی تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

”جاؤ تم آج اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا وقت گزارو صبح آ جانا۔“ شہروز خان نے کہا۔

”بہت شکریہ صاحب۔“ ملازم خوشی سے باغ باغ ہو کر بولا۔

نوٹوں کی گڈی کو جیب میں ٹھونس کر وہ وہاں سے دبے قدموں نکل گیا نوشین حیران و پریشان یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے اس وقت پر پچھتاوا ہو رہا تھا جب وہ شہروز خان کی بات مان کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔

”پلیز مجھے گھر جانے دیں۔“ اس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

لیکن شہروز خان اس کی بات کو پس پشت ڈالے مسکراتا ہوا اترا اور جا کر گیٹ کو اندر سے بند کر دیا پھر نوشین کو زبردستی گاڑی سے نکال کر کوٹھی کے اندر لے گیا۔ نوشین کی عزت کی اس نے دھجیاں اڑا دیں۔ نوشین کے ہاتھ پاؤں مارنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر نوشین کو اس درندہ صفت نے رسیوں میں جکڑ کر الٹا لٹکا دیا۔ نوشین جہاں اس سب پر حیران و پریشان تھی وہیں خوف زدہ بھی تھی کہ آخر شہروز خان کرنا کیا چاہتا ہے۔

نوشین اور شہروز خان دونوں کپڑوں سے عاری تھے۔ اسی حالت میں شہروز خان سجدے میں گر گیا اور شیطان کو یاد کرنے لگا۔ تبھی نوشین نے ایک حیران کن منظر دیکھا ایک سفید کبوتر شہروز خان کے جسم سے نکل کر پھڑ پھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا نوشین کو کیا خبر کہ اس درندے کے جسم سے ایمان کی نورانیت نکل کر جا چکی تھی۔ اب وہاں ایک غیر مسلم سجدے میں گرا ہوا تھا۔ جو شیطان کو اپنا خدا مانتے ہوئے حقیقی رب سے واسطہ ہر تعلق توڑ کر کھلے عام جنگ پر تیار ہو گیا تھا مگر وہ مورکھ اس بات سے واقف نہ تھا کہ اللہ رب العزت سے تو شیطان نہیں جیت سکا وہ تو شیطان کا ایک پیروکار تھا سجدے میں گرے شہروز خان کی سماعت سے کسی کے الفاظ ٹکرائے۔

”ہم تمہاری آمد پر خوش ہوئے ٹائم کا ضیاع کئے بنا اس حسینہ کے خون سے غسل کرو اور پھر زمین پر گرنے والے لہو کو چاٹ لینا...... اس کے گوشت سے اپنی پیاس بجھانا تمہیں ایک ایسی راحت ملے گی جو زندگی میں کبھی نہ ملی ہو...... جلدی کرو اور اپنے کام کو منطقی انجام تک پہنچاؤ۔“

آواز میں حکم بھی تھا اور فاتحانہ فخر بھی۔ شہروز خان جلدی سے اٹھا اور تیز دھار چاقو جو وہ ساتھ لایا تھا اٹھا کر نوشین کی طرف بڑھنے لگا خوف و حیرت سے نوشین کی بری حالت تھی۔

”پلیز سر خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیں میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی......“ رسیوں میں جکڑی الٹی لٹکی نوشین نے منت کرتے ہوئے کہا۔

”کسی کو کچھ کہنے کے قابل رہو گی تو کہو گی ناں۔“ شہروز خان نے نوشین کو بالوں سے کس کر پکڑتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے شہروز خان نے چاقو نوشین کی گردن پر چلا دیا۔ شدت تکلیف سے نوشین تڑپ کر رہ گئی وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کی شہ رگ سے خون فوارے کی مانند نکلنے لگا شہروز خان اس کے گرم خون

سے نہانے لگا۔ نجانے کب نوشین کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا، نوشین کے خون سے غسل کرتے وقت کتنا ہی خون اس کے اندر گیا تھا ایک سکون سا اسے محسوس ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے کمرے کے فرش پر پھیلا ہوا خون کسی کتے کی مانند چاٹنا شروع کردیا پھر اس نے نوشین کی شہ رگ کو چاٹنا شروع کردیا دوسرے ہی لمحے کسی بھوکے بھیڑیئے کی طرح وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا شروع کردیا جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اسی فرش پر اوندھے منہ وہ لیٹ گیا۔ ایک عجیب سا سرور اسے محسوس ہورہا تھا دنیا کا ہر نشہ اس نے کیا تھا مگر جو کیف و مستی کا عالم آج تھا وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

نجانے کب وہ نیند کی وادیوں میں گم ہوگیا، رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی چھت سے ابھی تک نوشین کی ادھڑی ہوئی لاش لٹک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے باہر کو ابل آئی تھیں شہروز خان سرعت سے اٹھا اور ٹائم دیکھا چار بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے جلدی سے فرش صاف کیا اور نوشین کی لاش کو اتارا اسے بیڈ کے لحاف میں لپیٹ کر گاڑی کی ڈگی میں ڈالا اور گاڑی لے کر روانہ ہوگیا گھر کو اس نے تالا لگا دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ملازم کے پاس گھر کی چابیاں موجود ہیں۔

شہروز خان نوشین کی لاش سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا اس نے گاڑی کی بریک گندے نالے کی پل پر جاکر لگائی اور مکمل اطمینان کرلینے کے بعد نوشین کی لاش کو ڈگی سے نکال کر نیچے اچھال دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی میں بیٹھ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور پھر گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اپنے گھر کی راہ لی۔

☆......☆......☆

وقت کے ساتھ ساتھ شہروز خان نے کالی شکتیوں پر کافی عبور حاصل کرلیا۔ وہ ہر کام نہایت احتیاط سے کرتا تھا۔ اسی نے اپنی شہر سے باہر والی حویلی کو شیطانی قلعہ بنادیا تھا اپنے کمرہ خاص میں اس نے ایک بہت بڑا بت رکھا ہوا تھا۔ اب وہ اپنا زیادہ تر وقت اسی حویلی میں گزارنے لگا تھا۔ اس بات کو اس کی ساری فیملی نے بہت قریب سے محسوس کیا تھا۔

''کیا میں شہروز خان میں کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں دیکھ رہا......؟'' ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے شہروز خان کے دادا نے سب کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں بھی کافی پریشان ہوں کہ اب وہ ذمہ داریوں سے غافل ہوکر اپنی شہر سے باہر والی حویلی میں زیادہ وقت بِتانے لگا ہے۔'' اس کے باپ زمان خان نے جواب دیا۔

''بہو کیا تم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہیں کی......؟'' شہروز خان کے دادا نے اس کی ماں کو مخاطب کرکے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بھیا سیاست سے اکتا گئے ہوں گے اور اب سکون کی خاطر وہاں ڈیرہ لگالیا ہوگا۔'' شہروز خان کی بہن زلیخا نے لقمہ دیا۔

''تم خاموش رہو۔'' زمان خان نے بیٹی کو غصے سے کھاجانے والی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''مخالف پارٹیاں پہلے ہی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔'' دادا نے دھیمے سے مگر سب کو سنائی دینے والے لہجے میں کہا۔

''فوری طور پر نوٹس لو قبل اس کے کہ مخالف پارٹیاں کوئی پوائنٹ پکڑلیں۔ حالات کی سنجیدگی کو سمجھو اور فوراً اس کے پیچھے جاؤ اور پتہ لگاؤ کہ آخر وہ وہاں کرکیا رہا ہے۔''

''میں آج ہی نکل جاؤں گا۔'' زمان خان نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

جواباً شہروز خان کے دادا نے سر ہلایا اور سب ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

☆......☆......☆

شہروز خان اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے ایک نہایت ہی عجیب وغریب اور ناقابل یقین منظر دیکھا کمرے کے ایک کونے میں رکھا بت یوں ہل رہا تھا جیسے شدید زلزلہ

آگیا ہو۔ شہروز خان حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بت کو گرنے سے بچانے کے لئے اس کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے دو چار قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ کسی نے اس پر تھپڑوں کی بارش کردی وہ درد سے کلبلا اٹھا اور فرش پر جاگرا۔ اب کی بار تو رہی سہی کسر پوری ہوگئی اور لاتوں، مکوں اور گھونسوں کی بارش شروع ہوگئی۔ مارنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جو کوئی بھی تھا بہت بے رحم تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس نے سرشام ہی ملازم کو چھٹی دے دی تھی جس کی وجہ سے اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ مارنے والا ابھی تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے تب ہی بمشکل تمام وہ اپنی تمام تر قوت یکجا کرکے بھاگا حتیٰ کہ وہ بھاگتا بھاگتا حویلی سے باہر آیا مگر باہر نکلتے ساتھ ہی اسے رکنا پڑا۔

اس کے سامنے بیساکھی کے سہارے پر ایک مجذوب کھڑا تھا۔ اس کی حالت سے اس کی خستہ حالی دکھائی دے رہی تھی۔ اس مجذوب کو دیکھ کر یوں ڈر گیا جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ وہ بری طرح سے کانپنے لگا تھا۔

''کہاں گیا تیرا شیطان کیا تجھے بچانے نہیں آئے گا......؟'' مجذوب نے لاٹھی پر سے اپنا زور کم کرتے ہوئے کہا۔

''م...... مجھے معاف کردو......'' شہروز خان نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

''کس بات کی معافی......؟'' مجذوب نے سوال داغا تو شہروز خان کا سر شرم سے جھک گیا۔

''کہاں گئے تیرے وہ شیطان جو تجھے امر کرنے کے دعویدار تھے۔ سبز باغ دیکھ کر تم نے اپنا ایمان تک کھودیا اور اب تم ایمان کے بغیر ہو اور ایمان کے بغیر انسان کی اہمیت حیوان کی سی ہوتی ہے جسے نہ تو اچھے برے کی کوئی پہچان ہوتی ہے اور نہ اس سے کسی اچھائی کی امید رکھی جاسکتی ہے اور ایسا ہی تم نے کرکے دکھایا ہے کتنے ہی بے گناہوں کو بلاوجہ تم نے اپنی شیطانی خواہشات کی بھینٹ چڑھادیا۔ بھاگو مت واپس چلے جاؤ تمہیں خوشخبری سنادوں کہ تم امر ہوچکے ہو...... قیامت تک موت تمہیں چھو بھی نہیں پائے گی۔ مگر تم پر ایک ایک منٹ کڑا گزرے گا...... ہر گزرتے سیکنڈ کے ساتھ تم موت کی طلب کروگے مگر اب موت تمہیں قیامت تک نہیں آئے گی۔ اس حویلی سے تم باہر بھی نہیں نکل پاؤ گے مقید ہوکر رہ جاؤ گے۔ تم دنیا کے ہزار رنگ دیکھو گے ہر بدلتا رنگ تم پر سخت ثابت ہوگا جاؤ دفعہ ہوجاؤ۔''

اتنا کہہ کر مجذوب نے بیساکھی کا بھرپور وار شہروز خان پر کیا تو دوسرے ہی لمحے شہروز خان ہوا میں اڑتا ہوا برق رفتاری سے حویلی کے ایک پلر سے جا ٹکرایا درد کی شدت کے باعث ایک دلخراش چیخ اس کے حلق سے نکلی اس کے ساتھ ہی گیٹ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

شہروز خان گرتا پڑتا بمشکل تمام اپنے کمرے تک پہنچا اور ''اگلا منظر دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی بت فرش پر گر کر چور چور ہوچکا تھا۔ اسے اچانک چاروں اطراف سے ان گنت لوگوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں آوازیں آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگیں اور اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہونے لگے وہ زور زور سے چیخنے چلانے لگا مگر بے سود تب ہی وہ چکرا کر گر پڑا اور دنیا و مافیا سے بے گانہ ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

زمان خان کی گاڑی حویلی کے سامنے رکی ہی تھی نا چاہتے ہوئے بھی اسے گاڑی سے اترنا پڑا۔ زمان خان نے تھری پیس زیب تن کیا ہوا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور گلاسز اتار کر حیرت سے اپنی خاندانی حویلی کو گھورنے لگا۔ حویلی پر نحوست برس رہی تھی۔ ایک عجیب سا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کرگیا۔ اس نے باہر گاڑی سے باہر کھڑے ہوکر قدرے جھک کر ہارن بجایا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے حویلی

میں کوئی موجود ہی نہ ہو تب ہی کسی نے پیچھے سے زمان خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مڑا۔ سامنے حویلی کا پرانا غلام کھڑا تھا۔

"صاحب آپ یہاں کیوں آئے......؟" ملازم نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو جواباً زمان خان نے اسے گھورا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" زمان خان نے ناگواری محسوس کرتے ہوئے الٹا سوال داغا۔

"یہاں موت کی ہولی کھیلی جاتی ہے صاحب۔" ملازم نے خوف زدہ انداز میں جواب دیا۔

"واپس چلے جایئے وگرنہ ایسا نہ ہو کہ کہیں چھوٹے صاحب آپ کو بھی ذبح کر کے اس بت پر آپ کا خون انڈیل دیں۔ اب وہ انسان نہیں رہے بلکہ انسانی روپ میں ویمپائر ہیں۔"

ملازم کی بات سن کر زمان خان طیش میں آ گیا اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا، توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے وہ اوندھے منہ گرا اور اس کے چہرے پر ہلکی سی خراش آ گئی جس سے خون کی ایک چھوٹی سی لکیر نمودار ہوئی۔

"بدتمیز نمک حرام انسان۔" زمان خان غصے سے دھاڑا۔

"آخر دکھا دی نہ اپنی اوقات، ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ اور دوبارہ حویلی کے قریب بھی بھٹکنے کی کوشش مت کرنا......؟"

"یہاں رہنا بھی کون چاہتا ہے صاحب......؟" ملازم نے ادب سے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

"جایئے شوق سے اندر جایئے۔ اللہ آپ پر رحم کرے۔"

ملازم دعائیں دیتا ہوا وہاں سے الٹے قدموں لوٹا۔ زمان خان تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا جالی دار گیٹ سے اندر کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گیٹ پر زور دینے سے گیٹ کھلتا چلا گیا جیسے جیسے گیٹ چرچراہٹ کی آواز سے کھل رہا تھا ویسے ویسے زمان خان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

کتنی ہی دیر تک زمان خان گیٹ کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ آگے جائے یا نہیں مگر جوان بیٹے کی کشش کھینچ رہی تھی پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسے اکیلے نہیں آنا چاہئے تھا بلکہ سیکورٹی کو ساتھ لانا چاہئے تھا۔ آخر تمام تر ہمت کو یکجا کر کے وہ آگے بڑھا ابھی اس نے تین چار قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ ایک دلدوز چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز کو بھلا وہ کیسے نہ پہچانتا یہ آواز اس کے لخت جگر کی تھی۔ آواز میں درد کی شدت اس کی برداشت سے باہر تھی زمان خان سرعت سے اندر کی طرف بھاگا۔

غلام گردش سے ہوتے ہی اسے رکنا پڑا کیونکہ اس کے سامنے اس کا بیٹا شہروز خان کھڑا تھا اس کے چہرے پر صدیوں کی تھکان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلاک کا خوف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اس کی خستہ حالی پر زمان خان کا دل بھینچ کر مٹھی میں آ گیا تھا۔

"بابا۔" شہروز خان باپ کو دیکھ کر اس کی طرف لپکا اور آ کر باپ کے سینے سے لگ کر دھواں دھار رونے لگا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو بابا۔" تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے...... وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔"

بیٹے کی بات سن کر زمان خان غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ "کس کی اتنی جرأت ہے جو میرے لخت جگر کو اس نے یہاں قید کر کے رکھا ہے؟" زمان خان نے پوچھا۔

"وہ بہت ظالم ہے بابا۔" شہروز خان نے باپ کے سینے سے الگ ہو کر کہا۔

"وہ مجھے بہت اذیتیں دیتا ہے۔ میں کئی دنوں سے یہاں بھوکا پیاسا ہوں ملازم کو بھی اس نے بھگا دیا ہے۔"

"چلو میرے ساتھ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کون ہے؟" زمان خان نے کہا۔

شہروز خان باپ کے ساتھ چپکا باہر کی طرف آنے لگا۔ گیراج سے گزر کر جیسے ہی وہ گیٹ کی طرف بڑھے اگلا منظر دیکھ کر زمان خان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گیٹ کے دونوں پٹ خود بخود آپس میں بغل گیر ہو گئے۔ شہروز خان باپ سے چپک گیا۔

"وہ آ گیا ہے پاپا پلیز مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" شہروز خان نے باپ کے بازو کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

"ہمت کرو میرے بیٹے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" زمان خان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں گیٹ کے پاس پہنچ گئے زمان خان نے گیٹ کو تھوڑ زور لگایا تو وہ کھل گیا زمان خان گیٹ سے باہر نکل گیا اور دوسری طرف کھڑے ہو کر بیٹے کو پکارا۔

"آ جا بیٹا فکر مت کرو میرے بچے میں ہوں تمہارے ساتھ۔" زمان خان نے اسے تسلی دینے لگا تو شہروز خان اس کی طرف بڑھا۔

جیسے ہی شہروز خان نے گیٹ سے دایاں پاؤں باہر نکالنا چاہا کسی نے اسے اٹھا کر اتنی زور سے زمین پر پٹخا کہ اس کی سماعت شکن چیخ نے زمان خان کو دہلا کر رکھ دیا۔ تب ہی زمان خان نے ایک نہایت ہی بھیانک منظر دیکھا۔

شہروز خان کو کوئی دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر اندر لئے جا رہا تھا وہ مسلسل مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا تھا اسے گھسیٹنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زمان خان نے سرعت سے آگے بڑھا ہی تھا کہ آگ کے اچانک نمودار ہونے والے آلاؤ نے اس کا راستہ روک لیا۔

"اللہ کے لئے میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔" زمان خان بے بسی و بے چارگی کے عالم میں گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے گلا پھاڑ کر چلایا۔ اس کے سامنے اس کے بیٹے کو اندر لے جایا گیا اور اس کے بعد حویلی شہروز خان کی سماعت شکن چیخوں سے گونج اٹھی گویا اسے زدوکوب کیا جا رہا تھا۔ زمان خان اپنی بے بسی و بے چارگی پر دھواں دھار رو رہا تھا۔

تب ہی نجانے اس کے دماغ میں کیا آیا کہ وہ فوراً گاڑی کی طرف بڑھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے گیئر میں ڈال دیا۔

☆......☆......☆

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم......؟" زمان خان کا باپ سرمد خان حیرت سے بولا جبکہ باقی اہل خانہ نے بھی اسے حیرت سے گھورا۔

"آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور میں کیا ایسی فرسودہ باتیں کر کے تم ہماری برسوں کی محنت پر پانی پھیرنے پر تلے ہوئے ہو۔ مخالفین تمہیں پاگل ثابت کر کے تمہیں اور ہم سب کو کنگال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"بھاڑ میں جائے یہ سب مجھے اپنے بیٹے کی سلامتی عزیز ہے۔" زمان خان نے بے چارگی سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"لیکن بابا یہ ممکن ہے یہ سب حقیقت ہے بھلا انہیں ایسا بے ہودہ مذاق کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" زمان خان کی اہلیہ نے خاوند کی بے بسی پر تڑپ کر کہا۔ اسے اپنے بیٹے کی یاد ستانے لگی۔

"نجانے میرا لعل کن مصائب سے دوچار ہے۔ خدارا از سر نو نوٹس لے کر تحقیقات کروایئے۔"

بہو کی بات سن کر سرمد خان کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ زمان خان نے اپنے باپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔

"ہماری مدد کیجیے بابا شہروز خان ہمارا اکلوتا وارث ہے۔" زمان خان نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"تیاری کرو ہم فوراً وہاں جا کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیں گے۔" سرمد خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہم اپنے ساتھ پولیس کی بھاری نفری لے کر جائیں گے۔ میں رابطہ کر لیتا ہوں۔ دشمن کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ تم لوگ تیاری

کردہمیں فوراً کلنا ہے۔"

سرمد خان بات مکمل کر کے ٹیلی فون کے پاس جا بیٹھا کریڈل کان سے لگا کے وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔

درجنوں پولیس اہلکار پوزیشن سنبھالے حکم کے منتظر تھے۔ زلیخا نے میڈیا کو بلا لیا تھا جو کہ کوریج کے لئے تیار تھے پوری قوم اور دوسرے ممالک والے بھی میڈیا کوریج کے ذریعے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ زمان خان اور اس کی فیملی کو ایک طرف سخت سیکورٹی میں انتظار کرنے کا کہا گیا۔

اعلیٰ پولیس افسران بھی موقع پر موجود تھے یہی آس پاس کے علاقوں سے سینکڑوں لوگ جمع ہو آئے تھے جنہیں پیچھے ہی پولیس اہلکار روک کے کھڑے تھے اعلیٰ پولیس افسران، پولیس اہلکاروں کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے کہ تب ہی سب نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔

اچانک اندر سے شہروز خان چیختا چلاتا ہوا ان کے سامنے باہر آیا اور لوگوں کے مجمع کو دیکھ کر ان کی طرف لپکا جبکہ اس کی فیملی نے خاص کر اس کی ماں، اہلیہ اور بچے تڑپ کر رہ گئے۔

"مجھے بچالو پلیز۔" شہروز خان چلایا۔

"میں اس تکلیف دہ زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں...... مجھے مار ڈالو...... خدا کے لئے مجھے گولی مار دو......" شہروز خان مدد کے لئے سب کو پکار رہا تھا۔ شاید وہ کافی سہا ہوا تھا تب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی ایکشن لیا جاتا سب نے ایک بار پھر نیا منظر دیکھا۔

ایک مجذوب بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا باہر آیا۔ اس کی حالت بے شک قابل رحم تھی مگر اس کا چہرہ چاند کے چودھویں کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شہروز خان کے لئے بلاک کی نفرت تھی۔

اس نے آنے کے ساتھ ہی شہروز خان کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا شہروز خان اس کے ہاتھوں میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے اور چلانے لگا۔

سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ شہروز خان اچھی خاصی صحت کا مالک جوان مرد تھا جبکہ اس کا مدمقابل ایک بوڑھا شخص جو معمولی دھکے سے گر کر مر جائے گا مگر شہروز خان اسے دیکھ کر خوف سے چیخ چلا رہا تھا۔

میڈیا اپنے کام کو مکمل ایمانداری سے سرانجام دے رہی تھی۔ پولیس کمشنر نے پولیس اہلکاروں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کا نشانہ لے کر اسے شوٹ کر دیں ایک ساتھ درجنوں شوٹرز نے اس مجذوب کا نشانہ لے کر فائر کیا مگر اگلا منظر دیکھ کر سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے شوٹرز کی آٹومیٹک گنوں سے نکلنے والی گولیاں گیٹ کے پاس جا کر یوں رک گئیں جیسے کوئی ان دیکھی طاقت انہیں آگے نہ جانے دے رہی ہو۔ ایک ساتھ کئی بار کوشش کر کے فائر کئے مگر درجنوں گولیاں گیٹ کے پاس جا کر رک گئی تھیں۔

کسی کو بھی اس ناقابل فراموش منظر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف اس مجذوب نے شہروز خان کو بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا گیٹ کے پاس لے آیا اور اسے مخاطب کیا۔

"بتا ان سب کو کہ تو کس گناہ کی وجہ سے سزا کاٹ رہا ہے، دروغ گوئی کر کے اپنے انجام کو اور بھیانک مت بنا لینا؟" اس کے بعد شہروز خان نے جو حقیقت بیان کی اسے سن کر سب کی حیرت ہویدا ہو گئی خاص کر اس کی فیملی کا سر شرم سے جھک گیا۔

"کیا یہی تمہاری پرورش ہے......؟" شہروز خان کی بات مکمل ہونے کے بعد مجذوب نے غضب ناک انداز میں وہاں موجود ہر کس و ناکس کو پکارا۔

"سرابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ زندگی تو پلک جھپکنے سے بھی کم ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگ اس زندگی میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کا ہوش بھی نہیں رہتا ہے...... اسے امر ہونے کی چاہ چڑھی تھی یہ امر ہو گیا اور قیامت تک اسی حویلی میں اپنے کئے

انجام بھگتے گا...... اپنی شیطانی خواہشات کا آغاز اس نے اسی حویلی سے کیا تھا اور انجام بھی اسی حویلی میں ہوگا...... یہ روز مرے گا روز جئے گا مگر تم میں سے کوئی اس کی مدد نہیں کر پائے گا کیونکہ یہ قہر خداوندتعالیٰ کا شکار ہوا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ اور دوبارہ یہاں آنے کی غلطی مت کرنا کیونکہ تم میں سے کوئی بھی حویلی میں داخل نہیں ہو پائے گا۔ دنیا میں بھی یہ عذاب بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔"

اتنا کہہ کر مجذوب نے شہروز خان کو بالوں سے پکڑ کر نیچے گرایا اور گھسیٹتا ہوا اندر لے جانے لگا۔ اس کی فیملی مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔

"فائر......" پولیس کمشنر نے حکم دیا ایک ساتھ سینکڑوں فائر ہوئے مگر گولیاں حویلی کے گیٹ کے پاس پہلی والی گولیوں کے پاس جا کر رک گئی۔

"اندر کود و......" ایک بار پھر حکم ہوا۔

درجنوں پولیس اہلکار گیٹ اور چاردیواری کی طرف بڑھے مگر ایک بار پھر آگ کے گولے نے سب کا راستہ روک لیا۔ مجذوب ان سب باتوں سے بے نیاز شہروز خان کو گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔

"خدا کے لئے میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔" شہروز خان کی ماں بے بسی کے عالم میں روتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے ہمیں پتہ بھی نہیں لگتا ہم کہتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر سیٹ ہو جائیں گے پھر جاب لگتی ہے تو کہتے ہیں گھر بنا کر شادی کر کے سیٹ ہو جائیں گے بچے ہو جائیں تو ان کی تعلیم اور ان کی شادیوں کے بعد سوچتے ہیں سیٹ ہو جائیں مگر پھر پوتے پوتیوں کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

درحقیقت ہم سیٹ کب ہوتے ہیں؟

جب مر کر قبر میں جاتے ہیں اور ہمیں قبر میں لٹایا جاتا ہے تو اوپر کھڑا آدمی کہہ رہا ہوتا ہے۔" اس کا سر دائیں طرف سیٹ کرو...... ہاں اب یہ سیٹ ہے۔"

پھر خواہشات کہاں گئیں...... تن جسے سنوارنے کے لئے ہم ہر حد کراس کر جاتے ہیں وہ مٹی میں مل جاتا ہے...... بچ کیا جاتا ہے ہماری روح...... ہمارا ضمیر...... جسے سنوارنے کی ہم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔

وقت کے جھروکوں نے کتنے رنگ روپ بدلے کتنے چہرے آئے کتنے گئے۔ دن مہینوں کا روپ دھارتے دھارتے سالوں میں بدل گئے اور سال صدیوں میں ضم ہو گئے نجانے کتنی صدیاں بیت چکی ہیں کتنے چہرے بدل چکے ہیں؟ آج بھی شہروز خان اپنی حویلی میں سزا بھگت رہا ہے لوگوں نے حویلی کے پاس سے گزرنا بھی بند کر دیا ہے حکومت نے باڑ لگا کر حویلی کو چاروں طرف سے بند کر دیا ہے۔

آج بھی حویلی کے گیٹ کے سامنے سینکڑوں گولیاں منجمد حالت میں دکھائی دیتی ہیں شہروز خان کی چیخیں آج بھی حویلی میں گونجتی ہیں مگر اس کی مدد کرنے کوئی بھی نہیں آتا۔

شہروز خان آج بھی چیختا چلاتا ہوا حویلی سے باہر آتا ہے۔ وہ پہلے دن کی طرح آج بھی جوان ہے۔ وہ ہر گزرنے والے کو مدد کے لئے پکارتا ہے مگر جیسے وہ اس کی سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے قبروں میں دفن ہمارے اپنے بھی ہمیں پکارتے ہیں ہمیں اپنے ساتھ درپیش حالات سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہم سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ اگر ایک بار ان کی بات سن لیں تو کبھی بھی برائی کی طرف دھیان نہ دیں۔ وقت کے ولی بن جائیں...... دنیا سے برائی کا نام ہی ختم ہو جائے مگر یہ سب کچھ ہو جائے تو دوزخ کہاں جائے۔

اب بھی وقت ہے سدھرنے کا ہمارے سامنے دو راستے ہیں ایک دایاں ایک بایاں، اب یہ تو ہم پر منحصر ہے کہ کس راستے کا انتخاب کرتے ہیں؟

جان لیوا

قسط نمبر:2

راشد نذیر طاہر

برس ھا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کرکے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میری بات پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آسکی، چنانچہ اس نے الجھن آمیز انداز میں میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا کہہ رہے ہو...... دوبارہ بولو......''

''انہیں ماں جی نے مارا ہے......'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

پولیس والے نے ناک بھنوں چڑھا کر مجھے گھورا، اس چکر میں اس کا چہرہ عجیب اور مضحکہ خیز ہوگیا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا انداز ایسا تھا جیسے میرے اس جملے کا ان سے مطلب پوچھ رہا ہو۔

ان بے چاروں نے بھی صرف کندھے اچکا دیے...... اب اس نے ایک کنکھار لیتے ہوئے اپنا گلہ صاف کیا اور پھر نیچے ہو جانے والی پتلون کو مطلوبہ جگہ پر لاتے ہوئے مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

''دیکھو میاں...... اچھا چھوڑو...... پہلے مجھے اپنا نام بتاؤ۔''

''میں...... شکیل ہوں۔''

''اچھا......'' اس نے سر ہلایا۔

''تو شکیل...... میرے بچے...... میرا نام دلاور ہے...... انسپکٹر دلاور اور میں تمہارا چاچا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس حادثے نے ضرور تمہارے ذہن پر اثر کیا ہوگا، لیکن تم اپنے ابا جی کے بھائی کو ضرور قاتل کے بارے میں صحیح آگاہی دو گے...... اب بتاؤ تمہارے ابا جی کو کس نے مارا تھا؟''

میں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''میں نے جو دیکھا، وہ آپ کو بتا دیا ماں جی نے خنجر نکالا تھا اور کھینچ کر ابا جی کے سینے پر دے مارا۔ انہیں تڑپنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔''

''مجھے تم پر بہت افسوس ہے شکیل بیٹے......''

دلاور کا لہجہ مغموم تھا۔

''میں اس دکھ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن تم اپنے اوسان بحال کرکے ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے تو میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں گا ورنہ تمہارے باپ کا قاتل آزاد گھومتا رہے گا اور اسے کبھی اس جرم کی سزا نہ مل سکے گی۔''

''آپ میری بات پر یقین کریں انسپکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔

''ابا جی کو انہوں نے ہی قتل کیا ہے۔''

''اچھا چلو......'' دلاور نے سر ہلایا۔

''اگر میں تمہاری بات مان لوں...... تو تم خود ہی سوچو کہ تمہاری ماں کا رو رو کر اتنا برا حال کیوں ہو رہا ہے۔

؟ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اسے بھی کچھ نہ ہو جائے۔ کیا تمہارے اور بہن بھائی ہیں؟"

"نہیں......" میں نے بتایا۔

"دو بہنیں تھیں چند سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"اوہ......" اس کے منہ سے نکلا۔

"بڑی دردناک کہانی ہے۔ اچھا...... کوئی اور رشتہ دار وغیرہ۔"

"ہاں...... قاسم ماموں ہیں۔"

"ہوں......! وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"شہر میں گھر ہے...... ماں جی کے پاس ان کا پتا ہے۔"

"میں معلوم کر لوں گا۔" ولاور نے کہا۔

"لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا، خنجر پر سے بھی انگلیوں کے نشانات لئے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ کسی خیال کے تحت اس طرف کھڑا ہو گیا جہاں ابا جی کی لاش پڑی تھی۔ اس نے احتیاط سے اپنے جوتوں کو خون سے بچایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"خنجر اسی جگہ پر پیوست ہوا تھا؟"

"جی ہاں......" میں نے جواب دیا۔

"اور ماں جی دروازے میں کھڑی تھیں......"

"خوب......" اس نے جیسے میرا جملہ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ موجود کھڑکی پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

پھر وہ آپ ہی آپ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"اگر تمہاری ماں دروازے میں کھڑی تھی، تو قاتل نے کھڑکی استعمال کی ہوگی یہ دروازہ بھی کافی چوڑا ہے ممکن ہے کہ قتل کرنے والے نے تمہاری ماں کے قریب ہی کھڑے ہو کر وار کیا ہو۔ بے چاری بوڑھی عورت کو کیا معلوم...... اور شاید تم بھی اسے نہ دیکھ سکے...... خیر...... یہ دشمنی کا کیس ہے...... تمہارے والد جو کام کرتے تھے، اس میں دشمنیاں بھی ہو جاتی ہیں...... کام دکھا دیا کسی نے...... خدا رحم کرے۔"

میں خاموش ہی رہا، کتنی عجیب بات تھی وہ میری گواہی کو کسی خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھا حالانکہ میں وہی کچھ بتا رہا تھا جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا قتل کا چشم دید گواہ ان کے سامنے موجود تھا، اور وہ لوگ اسے یکسر نظر انداز کر کے اپنی ہی کارگزاریوں میں مصروف تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ میں اب ماں جی کے کمرے کی طرف آ گیا، جہاں اب بھی دو عورتیں ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی انہیں دلاسہ دے رہی تھیں۔ ماں جی بھی ان سے باتیں کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ مجھے دیکھ کر وہ عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ شاید اپنے اپنے گھر جانا چاہتی تھیں۔

پھر ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔

"تم اپنی ماں کا بہت خیال رکھنا...... ہم اب جا رہے ہیں، لیکن صبح ہوتے ہی واپس آ جائیں گے۔"

"جی اچھا......!" میں نے سر ہلا دیا۔

"اس حادثے نے آنکھوں سے نیند چھین لی ہے، لیکن پھر بھی تھوڑا سا آرام بہت ضروری ہے، تم خود بھی لیٹ جاؤ اور اپنی ماں کو بھی یہی مشورہ دو...... رو رو کر بے چاری ہلکان ہو چکی ہے۔"

"ارے اب یہ آنسو تو میرا مقدر ہی بن گئے ہیں......" ماں جی بول اٹھیں۔

"میرا تو گھر ہی اجڑ کر رہ گیا۔ پہلے میری معصوم بچیاں گئیں اور اب سر کا تاج بھی خاک میں مل گیا...... آہ...... میں اب کس کے سہارے زندگی گزاروں گی؟"

ان میں سے ایک عورت پھر ان کی طرف بڑھی اور کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری زندگی اب شکیل ہے خالہ...... نصیب اور مقدر کو کوئی ٹال نہیں سکتا...... جو لکھا تھا وہ تو ہونا ہی تھا...... اب سوائے صبر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہائے...... اس آگ نے میرے گھر کو جلا ڈالا...... شکیل بھی تو تن تنہا ہی رہ گیا...... باپ کا سایہ تو سر سے اٹھ ہی گیا۔ ہائے میں بھی کتنی

بدنصیب ہوں۔"

ہم دونوں سو نہیں سکتے تھے، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی میں خاموش تھا اور ماں جی مجھے سینے سے لگائے ہوئے ہولے ہولے سسکیاں بھر رہی تھیں۔

کافی دیر بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

"شکیل......"

"جی......"

"تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تمہارے باپ کو میں نے مارا ہے؟"

میں نے نظر بھر کر ان کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر بولا۔

"جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہی بولا تھا۔"

"ارے...... تو اب بھی وہی بات کہہ رہا ہے؟"

وہ چونک کر بولیں۔

"اور کیا کہوں ماں جی......" میں قدرے جھنجھلا گیا۔

"تم نے ہی خنجر انہیں کھینچ کر مارا تھا۔"

"غضب خدا کا۔" وہ لرز اٹھیں۔

"میں نے تو کبھی گھر میں مرغی بھی ذبح نہیں کی اور تم اپنے باپ کے خون کا الزام مجھ پر تھوپ رہے ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اور اب میں اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے میرے بچے۔" وہ روہانسی لہجے میں بولیں۔

"وہ جیسا بھی تھا تمہارا باپ تھا...... صدمے سے تم بھی میری طرح نڈھال ہو۔ شاید اسی لئے تم یہ بات کہہ رہے ہو۔"

"ہو سکتا ہے ماں جی......" میں آہستہ سے بولا۔

"لیکن تمہیں یہ تو یاد ہوگا کہ رات میں تم نے دودھ کا گلاس پیا تھا یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ نے وہاں آ کر باقاعدہ ابا جی سے بات کی تھی۔" میں نے بتایا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ابا جی سے ہونے والی گفتگو لفظ بہ لفظ سنا دی، وہ پریشان ہو کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور میری شکل دیکھنے لگیں۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔" میں نے الٹا سوال کیا۔

"میں جان بوجھ کر تو ابا جی کے قتل کے الزام میں آپ کو پھنسانے سے رہا۔ ان کے بعد اب صرف تم ہی میری زندگی کا سہارا ہو اگر تمہیں بھی پولیس والے اٹھا کر لے گئے تو میں اس بھری دنیا میں کہاں جاؤں گا...... میرا کون ہوگا؟"

"ارے...... کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو......؟" وہ گھبرا اٹھیں۔

"کبھی مجھے قاتل ثابت کرتے ہو اور کبھی میری ممتا کا رونا روتے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ کس نے ہماری زندگی کا چراغ بجھا دیا...... اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں نہ جانے باقی سفر کیسے طے ہوگا؟"

میں چپ رہ کر ان کی طرف دیکھتا رہا، ایک بار پھر وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ جب ماں جی نے اپنے ہاتھ سے ابا جی پر خنجر پھینکا تھا۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی، گھبرا کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆......☆

ابھی صبح بھی ٹھیک طرح سے بیدار نہیں ہوئی تھی کہ قاسم ماموں کی شکل دکھائی دی۔

انہیں اس واقعہ کی اطلاع دے دی گئی تھی، ان کا پریشان چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بڑی عجلت میں یہاں پہنچے ہیں۔

ماں جی ان سے گلے لگیں تو ایک بار پھر آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے اور گویا آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔

قاسم ماموں نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے، لیکن انہیں کون اس حقیقت سے آگاہ کرتا......؟ میں نے

تہیہ کرلیا تھا کہ اب وہی کہوں گا جو انسپکٹر دلاور نے مجھ سے کہا تھا۔

اس کے خیال میں قاتل نے ماں جی کے عقب سے حملہ کیا تھا، اور پھر موقع پر ہی فرار ہوگیا تھا۔

قاسم ماموں نے صبر کی تلقین کی، بہت دلاسے دیئے اور پھر مجھے بھی اپنے پہلو سے لگا کر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔

اس اندوہناک صورت حال نے انہیں بھی قدرے حواس باختہ کردیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

شام تک پولیس والوں نے لاش کو مردخانے پہنچادیا۔ اب تجہیز وتدفین کا مرحلہ باقی تھا۔

میت گھر میں آئی تو ایک بار پھر حویلی ماتم کدہ بن گئی، اب تو میں بھی زار وقطار رورہا تھا۔

تدفین میں رات ہی ہوگئی تھی، قاسم ماموں نے مجھے اپنے ساتھ ساتھ ہی رکھا تھا۔ تمام انتظامات انہوں نے ہی کیے تھے۔

گھر پر واپسی ہوئی تو یہاں محلے کی عورتوں کے علاوہ ممانی بھی موجود تھیں...... قاسم ماموں کی کوئی اولاد نہیں تھی، جبکہ ان کی شادی کو تقریباً آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

ممانی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ یہاں پہنچی تھیں کھانے سے فارغ ہوتے ہی محلے کی عورتیں باری باری رخصت ہونے لگیں۔

ایسے میں ممانی بھی اٹھ کر قاسم ماموں کے قریب آگئیں اور آہستہ سے بولیں۔

"آپ کب چلیں گے؟"

قاسم ماموں نے انہیں گھور کر دیکھا، پھر فوراً ہی نرم آواز میں بولے۔

"میرا خیال ہے کہ تم اختر کے ساتھ ہی واپس چلی جاؤ۔"

"کیوں......؟ آپ نہیں چلیں گے؟"

"نہیں......!" وہ بولے۔

"میں کل ہی واپس آؤں گا۔"

ممانی کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے آثار ابھرے، لیکن پھر وہ کچھ بولے بغیر ہی سر ہلا کر وہاں سے چلی گئیں۔

شاید وہ ماں جی کو الوداع کہنے گئی تھیں، تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے بھائی کے ساتھ روانہ ہوگئیں۔

گھر ایک بار پھر خالی ہوگیا تھا...... فضا اور بھی زیادہ سوگوار ہوگئی اب میں قاسم ماموں کے ساتھ ماں جی کے پاس آیا۔

وہ اپنے پلنگ پر خاموش بیٹھی ہوئی تھیں قاسم ماموں ایک طویل سانس لے کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

ماموں جی نے خالی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"تم دونوں نے کھانا کھالیا؟"

"ہاں باجی......!" قاسم ماموں نے سر ہلایا۔

"میں بھی تم سے یہی پوچھنے والا تھا۔"

"میں نے بھی دو چار لقمے زہر مار کرلئے تھے۔" وہ بولیں۔

"بے چاری محلے والیوں نے بہت خیال رکھا تھا میرا۔"

"زہر مار کیوں باجی......؟" قاسم ماموں تڑپ اٹھے۔

"جانے والے تو دنیا سے چلے گئے، دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ مقدر کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ آج بھائی صاحب کے انتقال کو دو دن گزر گئے اور گزرنے والا وقت ہی یادوں پر مرہم لگایا کرتا ہے یہ قدرت کا قانون ہے کہ اگر کوئی آسرا یا کوئی سہارا نہ ہو تو وقت ہی ساتھ دیتا ہے۔ تمہیں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود کو سنبھالنا ہوگا اپنی خاطر نہیں تو کم از کم شکیل کی خاطر...... تمہارے گھر کی اب یہ آخری نشانی ہے...... اگر تم اب بے لئے جینا نہ چاہو تو کوئی بات نہیں لیکن اس کی خاطر تمہیں جینا پڑے گا اس لئے خود کو سنبھالو...... ورنہ خود سوچو کہ اگر تمہیں کچھ ہوا تو شکیل کا

اس دنیا میں کون ہے؟"

وہ جذباتی انداز میں بولتے چلے گئے۔

"تم ہو نا......؟" ماں جی پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

"ہاں میں ہوں......" وہ بولے۔

"لیکن میں تم دونوں کی زندگی کا خواہش مند ہوں جس طرح مجھے شکیل عزیز ہے، اسی طرح تم بھی ہو...... اور میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ اب تم دونوں کو یہاں ہرگز نہیں رہنے دوں گا۔ میں تمہیں اور شکیل کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اب تم لوگ میرے گھر پر رہو گے میرے ساتھ۔"

☆......☆......☆

قاسم ماموں کا گھر...... کسی بادشاہ کے محل سے کسی طور بھی کم نہیں تھا، وہ ایک بزنس مین تھے اور یہ خوب صورت بنگلہ ان کی دن رات کی محنت کا نتیجہ تھا۔

اس بنگلے میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، گاڑی، بینک بیلنس اور نوکر چاکر...... سب ہی کچھ ممانی کے نصیب میں تھا، لیکن دنیا کی تمام آسائشوں کے باوجود ان کی گود ابھی تک خالی تھی۔ بنگلے کا وسیع لان شام کے وقت چھوٹے بچوں کی چہکار سننے کے لئے ترستا رہتا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ ممانی کو اس بات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی وہ بہت زیادہ فیشن ایبل تھیں اور ان کا اکثر وقت مختلف قسم کی پارٹیوں کو اٹینڈ کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ رات کو دیر سے گھر آنا ان کا روز کا معمول تھا۔

قاسم ماموں اور ان کی بیوی کے درمیان قائم رہنے والا مسلسل کھنچاؤ صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

مجھے اور ماں جی کو سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ ہی ایک کمرہ دے دیا گیا تھا جو کہ ان کوارٹرز میں تو شامل نہیں تھا، البتہ یہ گھر کا وہ حصہ تھا جہاں سے صرف لان کی وسیع گھاس اور درخت دکھائی دیتے تھے۔

شروع شروع میں ہم دونوں ان لوگوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہمیں اپنے کمرے میں ہی کھانا دیا جانے لگا۔

یہ یقیناً ممانی کی ایما پر ہوا تھا، میں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہمارا یہاں آنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

لیکن قاسم ماموں سے کچھ کہنے کی جرأت شاید ان میں نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ممانی صاحبہ لاکھ تیز طرار سہی...... لیکن قاسم ماموں کے سامنے ان کے لبوں کو تالا لگ جایا کرتا تھا۔

. حالانکہ قاسم ماموں اکثر گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے، وہ زیادہ تر کاروبار کے سلسلے میں ہی مصروف رہا کرتے تھے۔

قاسم ماموں نے فوری طور پر میرا داخلہ کالج میں کروادیا تھا ورنہ تو خود مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں حویلی کی زندگی میں میٹرک کرنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکوں گا یہ قاسم ماموں کی اپنی مرضی تھی کہ انہوں نے مجھے کالج میں داخلہ دلوادیا تھا۔

ان کے گھر میں چار ملازم تھے۔ ایک جوڑا میاں بیوی کا تھا، جو کہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانے پکانے کے کاموں کے لئے مختص تھے جبکہ ایک ڈرائیور تھا جسے قاسم ماموں نے ممانی صاحبہ کے لئے رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو رات کو اپنی ڈیوٹی ختم ہوجانے کے بعد اپنے گھر کے لئے روانہ ہوجاتا تھا۔ ایک بوڑھا مالی بھی تھا، جو مستقل ہی یہاں رہائش پذیر تھا۔ یہی نسبت ان میاں بیوی کو بھی حاصل تھی۔ انہوں نے بھی سرونٹ کوارٹرز میں اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جوان دونوں کے بجائے اپنی دادی کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ملنے کے لئے آجایا کرتا تھا۔

بوڑھے مالی کا نام رحیم بابا تھا...... اکثر ان سے سلام دعا ہوجایا کرتی تھی اور وہ بہت محبت سے سلام کا جواب دیا کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ بات چیت بھی بڑھی تو یہ بات سن کر میں چونک اٹھا کہ وہ کسی زمانے میں اباجی مرحوم کے گہرے دوست رہ چکے تھے۔ اور انہیں بہت نزدیک سے جانتے تھے۔

میں نے تہیہ کیا کہ کسی دن فرصت سے رحیم بابا کی معیت میں بیٹھوں گا، تاکہ اباجی کی جوانی کے واقعات

سے آگہی حاصل کرسکوں یوں بھی مجھے گزرے ہوئے وقت کی داستانیں سننے میں بہت لطف آتا تھا۔

ابھی تک ابا جی کے قتل کا مسئلہ اندھیرے میں تھا، ہمیں قاسم ماموں کی زبانی اس بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا۔

قاسم ماموں کا کہنا تھا کہ پولیس والوں نے اپنی ''ازلی لاپرواہی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاتل کے لئے تگ ودو نہیں کی اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کیس اپنی اہمیت کھوتا جارہا ہے۔

ویسے قاسم بھائی نے ماں جی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کیس کو جلد ہی دوبارہ اٹھائیں گے۔

''میرا ایک دوست خفیہ پولیس میں آفیسر ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''اتفاق سے وہ ان دنوں ملک سے باہر گیا ہوا ہے، لیکن وہ جیسے ہی واپس آئے گا، میں بھائی صاحب کے کیس میں اسی سے مدد لوں گا میں ابھی صرف پولیس والوں کا طریقہ کار دیکھ رہا ہوں، میں اس وقت یہ کیس اٹھاؤں گا جب انہوں نے اسے فائلوں میں دفن کردیا ہوگا۔''

''ماموں...... ایک بات پوچھوں۔؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ہاں...... ضرور......''

''پولیس والوں کو اس خنجر پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشان بھی تو ملے ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں......؟ تم ان نشانات کا کیا کرو گے؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں......'' ماں جی بول اٹھیں۔

''شکیل کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ......''

''ماں جی......'' میں نے انہیں ٹوک دیا۔

''خدا کے لئے خاموش رہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔''

''اسے چھوڑو باجی...... تم مجھے بتاؤ...... کیا بات ہے؟'' قاسم ماموں اب ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''رہنے دو قاسم......'' وہ مسکرائیں۔

''اگر میں نے بتادیا تو شکیل برا مان جائے گا۔''

''تو ماننے دو برا......'' وہ بھی ہنسے۔

''میں اسے منالوں گا۔''

''دراصل بات یہ ہے کہ شکیل شروع دن سے ہی مجھے قاتل سمجھ رہا ہے۔'' ماں جی نے اگل دیا۔

''اسے آج بھی اسی بات پر یقین ہے کہ میں نے ہی اس کے باپ کو مارا ہے۔''

''ارے...... لیکن کیوں......؟'' ان کی حیرت قابل دید تھی۔

وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئے، جبکہ میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''یہ کہتا ہے کہ اس نے مجھے باقاعدہ خنجر مارتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ماں جی بولیں۔

''اور میں اس وقت بہت غصے میں تھی۔''

''شکیل...... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' وہ اب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''ہوسکتا ہے ماموں کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہو...... کیونکہ میں اس وقت شاید اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔''

''ہوں......!'' انہوں نے سر ہلایا۔

''ممکن ہے...... ہاں تو...... تم فنگر پرنٹس کا پوچھ رہے تھے...... ہے ناں......؟''

''جی ہاں ماموں......!'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔

قاسم ماموں چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔

''قاتل کافی چالاک تھا...... وہ پوری منصوبہ بندی کرکے وہاں آیا تھا، اس نے یقیناً اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے کیونکہ خنجر پر کسی قسم کی انگلیوں وغیرہ کے نشان نہیں ملے تھے۔ پولیس والوں نے مجھے

اس بارے میں بھی بتایا تھا۔'' ان کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔

☆......☆......☆

قاسم ماموں کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر جارہے تھے، ان کا یہ دورہ کاروباری سلسلے میں تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے فکر لاحق ہوگئی کہ ممانی جان ہمارے لئے کوئی نیا فسادنہ کھڑا کردیں، کیونکہ قاسم ماموں کی غیر موجودگی میں وہ اپنی ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار کرسکتی تھیں۔

بہرحال جو ہونا تھا وہ تو ہونا ہی تھا کسی قسم کے بھی وسوسوں کو اپنے دل کی آماجگاہ بنانے سے کیا فائدہ تھا۔

اس بات کو ماں جی بھی سمجھتی تھیں چنانچہ جس دن ماموں کی روانگی ہوئی تھی، اسی دن شام کے وقت ماں جی نے مجھ سے کہا۔

''شکیل بیٹا...... ذرا احتیاط سے کام لینا...... تم خالدہ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع مت دینا۔''

ممانی کا نام خالدہ تھا۔

''میں کیسے موقع دوں گا ماں جی......'' میں نے جواب دیا۔

''وہ ہم لوگوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔''

''ہاں...... مجھے خبر ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

''لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود سے کوئی موقع ڈھونڈ نکالے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ہم یہاں رہیں۔''

''ہمیں بھی کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے ماں جی۔'' میں نے منہ بنایا۔

''ہمارا بھی گھر بار ہے...... ہم حویلی میں رہ سکتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

''وہ جگہ تو اب رہنے کے قابل نہیں رہی، جو لوگ تمہارے باپ کو قتل کرسکتے ہیں۔ وہ ضرور تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤں ماں جی......'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... بولو۔''

''میں خود بھی ان دشمنوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

''اور میں سوچ کر بیٹھا ہوں کہ ان سے بدلہ ضرور لوں گا۔ اگر بدلہ نہ بھی لے سکا تو کم از کم اباجی کو قتل کرنے کی وجہ ضرور پوچھوں گا۔''

''کیا تم ابھی تک مجھ پر شک کررہے ہو؟'' انہوں نے مجھے گھورا۔

''نہیں ماں جی......'' میں نے کہا۔

''میں یہ جرأت کیوں کروں گا۔''

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے باپ کا قاتل کون ہے؟'' انہوں نے اچانک ہی کہا تھا۔

اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں میں نے یہ بات محسوس کی کہ ماں جی کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے سے تھے۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے چہرے کی بناوٹ کو ہی متاثر کردیا تھا...... لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ ماں جی ہیں۔

پھر آہستہ سے انہوں نے اپنے لب کھولے اور بولیں۔

''جان لیوا نے ان کا خاتمہ کیا ہے۔''

''جان لیوا......'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''یہ کون ہے......؟''

''ہے ایک......!'' وہ پھر مسکرائیں۔

''وہ صرف ان ہی کے لئے جان لیوا ہے جو اسے دکھ پہنچائیں، اسے ایذا دیں اور اس پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔''

میں اب بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا ان کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات سے میں کسی قدر خوف محسوس کررہا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر سر کو جھٹکا اور نارمل انداز میں بولا۔

''لیکن آپ اسے کیسے جانتی ہیں......؟''

یہ سن کر انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولیں۔

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”جان لیوا کی......“ میں نے سادگی سے بتایا۔

”کون جان لیوا......؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”ارے......“ میں بھی حیران تھا۔

”ابھی تو آپ نے خود یہ نام لیا تھا۔ اب آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے میرے بچے......“ ان کے لہجے میں تشویش تھی، بیٹھے بیٹھے بہکی ہوئی سی باتیں کرنے لگتے ہو...... میں تو اتنی دیر سے خاموش ہوں...... میں نے تو تم سے کچھ بھی نہیں کہا۔“

میں حیرت سے ان کی شکل ہی تکتا رہ گیا اس وقت ان کے چہرے سے وہ تاثرات بھی غائب ہو چکے تھے، جن سے میں خائف ہو رہا تھا۔

میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

ماں جی نے ایک بار پھر مجھے پریشانی میں ڈال دیا تھا، ان کا ایک بات کہنا، اور پھر اس سے انکار کرنا...... میرے لئے الجھن کا باعث تھا۔

یہ گرچہ چھوٹی سی بات تھی، لیکن اس سے قبل ایک سنگین معاملے میں بھی ماں جی کا یہی رویہ رہا تھا۔

میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ میں اباجی کے قتل کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ لیکن پھر اس وقت ماں جی کی پراسرار بے ہوشی اور اس کے بعد ان کی لاعلمی کا بھی یہی حال تھا۔

انہوں نے آج کسی جان لیوا کا ذکر کیا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی انہوں نے اس بات کو جھٹلا دیا۔

وہ آخر کس کی بات کر رہی تھیں......؟ وہ کون ہو سکتا ہے......؟ یہ نام تو میں نے پہلی بار سنا تھا۔

میں اسی ادھیڑ بن میں کمرے سے باہر نکل آیا، سامنے لان میں شام کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میری نظر رحیم بابا پر پڑی، جو پائپ کے ذریعے پودوں اور درختوں کو دھو رہے تھے اور پانی دے رہے تھے۔

میں بے خیالی کے سے عالم میں ان کی طرف قدم بڑھانے لگا انہوں نے خود بھی مجھے دیکھ لیا تھا...... چنانچہ میں قریب پہنچا تو وہ بول اٹھے۔

”آؤ...... شکیل بیٹا آؤ...... بیٹھو......“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک بینچ کی طرف اشارہ کیا، میں ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیوں شکیل میاں...... کیا بات ہے......؟“ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا تھا۔

”جی...... کچھ نہیں......“ میں جلدی سے بولا۔

”بس یونہی دل سے گھبرا گیا تھا تو میں باہر نکل آیا۔“

”ہوں...... اچھی بات ہے......“ انہوں نے سر ہلایا۔

”ٹھہرو...... !میں ذرا اس کام سے فارغ ہو جاؤں، تو پھر کوارٹر میں چل کر بیٹھیں گے۔ !بات یہ ہے کہ اب بیگم صاحبہ کے آنے کا وقت ہو رہا ہے، تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ لان میں بیٹھ کر شام کی چائے پینے کی عادی ہیں۔“

میں نے سر ہلا دیا...... ”یہ بات تو واقعی ٹھیک تھی...... میں نے ممانی کو اکثر شام میں یہاں ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا، اور خود میری یہ کوشش ہوتی تھی کہ میرا ان سے سامنا نہ ہو، ماں جی تو ویسے ہی سارا سارا دن کمرے میں ہی گزار دیتی تھیں۔

چنانچہ میں نے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں رحیم بابا...... ہم کوارٹر میں ہی چل کر بیٹھیں گے۔“

”ہاں ضرور...... بس میں ابھی اس کام سے فارغ ہوتا ہوں۔“

پھر وہ عجلت سے کام لیتے ہوئے ذرا ہی دیر میں فراغت حاصل کر چکے تھے، پائپ لپیٹنے کے بعد انہوں نے اسے اس کی جگہ پر رکھا اور پھر مجھے ساتھ لے کر اپنے کوارٹر میں چلے آئے۔

یہاں پلنگ بچھا ہوا تھا، اور دو کرسیاں بھی

موجود تھیں۔

”بیٹھو بیٹا......“ انہوں نے کہا۔

میں نے ایک کرسی سنبھال لی۔ وہ میرے سامنے پلنگ پر دراز ہو گئے اور غور سے مجھے دیکھنے لگے۔

”ہاں...... !اب بتاؤ بیٹا...... تمہیں کیا پریشانی ہے......؟“

”کچھ نہیں بابا...... میں تو بس یونہی......“

”مجھ سے مت چھپاؤ......“ انہوں نے میری بات کاٹی۔

”میں تمہارے والد کے برابر ہوں...... اور تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ان کا دوست بھی رہ چکا ہوں۔“

”جی ہاں...... آپ نے مجھے بتایا تھا......“ میں نے سر ہلایا۔

”اور میں نے یہی سوچا تھا کہ کسی دن آپ سے اس زمانے کے واقعات سنوں گا...... میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ دونوں کی دوستی کس طرح ہوئی تھی۔“

”میں کسی دن یہ سب کچھ بتاؤں گا......“ وہ بولے۔

”کیونکہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے فی الحال تو میں تمہاری پریشانی جاننا چاہتا ہوں...... آخر وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں بے چین کر دیا ہے۔ مجھے بتاؤ۔“

”میں آپ کو کیا بتاؤں...... مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ میرے لہجے میں الجھن تھی۔

”کوشش کرو......“ ان کا لہجہ نرم تھا۔

”جو کچھ تمہارے ذہن میں ہے، اس کے لئے الفاظ کو ترتیب دو اور کہہ ڈالو۔“

ان کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنا ہم راز بنانے کا فیصلہ کر لیا اور زبان کھول دی۔

میں نے اپنی کہانی دونوں بہنوں کے انتقال والے حادثے سے شروع کی اور اس کا اختتام جان لیوا کے نام پر ہوا۔ جو تھوڑی دیر پہلے ماں جی کی زبان سے برآمد ہوا تھا۔

رحیم بابا غور سے سن رہے تھے، انہوں نے مجھے کہیں بھی ٹوکنے کی کوشش نہیں کی، یہ بھی محض اتفاق تھا کہ جیسے ہی میں خاموش ہوا دروازے پر کسی نے دستک دی۔

رحیم بابا فوراً ہی اٹھے اور بولے۔

”یہ نصیر ہو گا۔ شام کی چائے لے کر آیا ہو گا۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھے، جلد ہی ان کی واپسی ہوئی تو ان کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔

”میں نے تمہاری چائے بھی لے لی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کپ میری طرف بڑھا دیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے رحیم بابا کچھ سوچ رہے تھے، پھر انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”تم کچھ بھول تو نہیں رہے؟ کوئی اور خاص بات...... یا کوئی اہم واقعہ......“

”میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں......“ میرا جواب تھا۔

میں جھیل میں اور اس کے بعد جنگل والے چشمے پر نہانے گیا تھا...... یہ بات بھی میں نے بیان کر دی کیونکہ جب میں نے اس پراسرار ہیولے کا ذکر اباجی سے کیا تھا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو گئی تھی۔

”اس چمک سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”کیا بتاؤں...... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس ہیولے سے واقف ہوں......“ میں نے بتایا۔

”اگر وہ ان کے لئے کوئی نئی بات ہوتی تو وہ حیرت کا اظہار کرتے...... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔“

”ہوں......“ رحیم بابا نے طویل سانس لی۔

”میں اس سلسلے میں کچھ کرتا ہوں۔“ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔

”میرا اور تمہارے باپ کا ساتھ یونہی نہیں تھا، میں بھی اسی لائن کا تھا۔ ایک طویل عرصہ میں نے بھی

تمہارے اباجی کی طرح کام کرتے ہوئے گزارا ہے، لیکن پھر میں نے عملیات کی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔“

”ارے......“ میں چونکا۔

”تو آپ بھی......؟“

”ہاں بیٹا......“ انہوں نے سر ہلایا۔

”میں بھی اسی دور سے گزر چکا ہوں اور میں تمہارے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کیا تم نے اپنے دادا مرحوم کو دیکھا تھا؟“

”جی......جی......نہیں......“ میں نے کہا۔

”میری پیدائش کے سال بھر بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا، یہ بات مجھے ماں نے بتائی تھی۔“

”اچھا......“ وہ سر ہلا کر بولے۔

”میں تو ان سے بھی مل چکا ہوں......“ وہ بہت مضبوط اور چوڑے چکلے جسم کے مالک تھے، انتہائی طاقتور اور دلیر......خیر......یہ تذکرے پھر کبھی ہوں گے فی الحال تو گھمبیر معاملہ وہ ہے جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔ تمہاری خاطر مجھے ایک بار پھر عملیات کی دنیا میں قدم رکھنا پڑے گا سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ سب چکر کیا ہے...... جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا، اور کس وجہ سے ہوا مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہارے دادا کو بھی اسی طرح اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ انہیں بھی کسی نے قتل کردیا تھا۔“

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا ماں جی اکثر اباجی کے خاندان کی باتیں کرتی تھیں، لیکن انہوں نے کبھی براہ راست یہ بات نہیں کی تھی کہ میرے دادا کو بھی قتل ہی کیا گیا تھا۔ رہ گئے اباجی وہ تو کبھی مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہی نہیں تھے اور نہ کبھی انہوں نے اپنے باپ دادا کے بارے میں مجھے کوئی بات بتائی۔

رحیم بابا کے ذریعے ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی...... نہ جانے کیوں میرے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

وہ خاموش ہوکر کچھ سوچ رہے تھے، پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے رحیم بابا نے کہا۔

”ٹھیک ہے...... میں آج رات کو حساب کتاب کا زائچہ کھولتا ہوں...... تم مجھے اپنی والدہ کا نام بتاؤ۔“

”جمیلہ خانم......“

”ہوں......بس ٹھیک ہے......میں کل تمہیں اس بارے میں ضرور کچھ بتا سکوں گا۔ اور تم فکر مت کرو......سب ٹھیک ہوجائے گا......ہاں......“

☆......☆......☆

رات کے نہ جانے کس پہر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی، یہ میری خاص عادت تھی کہ میں جب سونے کے لئے لیٹتا تھا تو پھر دوسرے دن صبح ہی بستر سے اٹھتا تھا، مجھے درمیان کا کبھی ہوش نہیں رہتا تھا۔

لیکن آج کافی دیر سے سونے کے باوجود میری نیند ٹوٹ چکی تھی...... میں نے ادھر ادھر دیکھا، ماں جی اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھیں...... ان کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں گونجتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

نائٹ بلب کی روشنی میں کمرے کا منظر نیلگوں دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا ہو...... لیکن ماں جی تو خراٹے لے رہی تھیں کوئی خواب بھی ایسا یاد نہیں آرہا تھا کہ جس کی بنا پر آنکھ کھل گئی ہو۔

بہرحال میں نے سر کو جھٹکا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں...... جب بے چینی کی کیفیت حد سے بڑھ گئی تو میں تنگ آکر کمرے سے باہر نکل آیا۔

رحیم بابا کے کوارٹر میں روشنی دکھائی دے رہی تھی ممکن تھا وہ بھی سو رہے ہوں، میں نے ان کی طرف جانا مناسب خیال نہیں کیا۔

دل کا عجیب سا عالم تھا...... نہ جانے کیوں یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ میں پورے گھر کی چہل قدمی کروں۔

رات کے اس پہر یہ حرکت کسی طرح بھی مناسب نہیں تھی، میں تو اس بات سے بھی واقف تھا کہ

ممانی صاحبہ تو دن دیہاڑے بھی ہم دونوں کا گھر کے کسی اور حصے میں آنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔

ان سب باتوں کے باوجود میرے قدم آگے بڑھتے رہے، لان کے سامنے سے گزرتے ہوئے درختوں کی سائیں سائیں میرے کانوں سے ٹکرائی تو میری نگاہ اسی جانب اٹھ گئی۔

رات اور دن کا بھی کیا تضاد ہے۔ یہ وہی لان تھا، جس میں دن کے وقت بیٹھنا دل کی طمانیت کا باعث ہوتا ہے، لیکن رات کے اس پہر یہ لان کسی ویران کھنڈر کا سماں پیش کر رہا تھا۔

میں پودوں اور درختوں کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ سامنے برآمدہ تھا جس کے دائیں جانب ڈرائنگ روم تھا اور اسی گلی کے اختتام پر قاسم ماموں کا کمرہ تھا۔

ان کے کمرے کے ساتھ ہی ایک راہ داری تھی جو گھوم کر واپس سرونٹ کوارٹرز کی طرف آتی تھی۔

میں نے سوچا کہ اسی جانب سے گزر کر واپس چلا جاؤں گا چنانچہ میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ابھی قاسم ماموں کی واپسی نہیں ہوئی تھی میں تو اس بات سے بھی واقف نہیں تھا کہ وہ کس شہر گئے ہیں بہرحال ان کا یہ دورہ کافی طویل تھا یہ بات مجھے ماں جی نے بتائی تھی۔

میں قاسم ماموں کے متعلق سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، لیکن جیسے ہی میں ان کے کمرے کے قریب سے گزرا مجھے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی میں چونک اٹھا۔

قاسم ماموں تو گھر میں موجود ہی نہیں تھے، پھر ممانی صاحبہ کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی آواز صاف پہچانی تھی۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔

کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی کھڑکی تھی، جس پر پردہ جھول رہا تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ہلکا سا کھلا ہوا تھا، اور کمرے سے اٹھنے والی آوازیں اسی درز کی وجہ سے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا، یہ بھی ممکن تھا کہ ممانی فون پر قاسم ماموں سے باتیں کر رہی ہوں۔

لیکن پھر ایک مردانہ قہقہے نے میرے اس خیال کو رد کردیا بلاشبہ یہ کوئی مرد ہی تھا، جو اس وقت کمرے میں موجود تھا اور ممانی اسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔

میں آگے بڑھا اور پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی میں نے کھڑکی کی درز پر اپنے کان لگا دیئے۔

اسی وقت مردانہ آواز ابھری۔

”دیکھو ڈارلنگ...... میں اب اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔“

”میں جانتی ہوں......“ یہ ممانی کی آواز تھی۔

میرے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں بھی اب جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور کافی حد تک شعور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے میں نے اور بھی دم سادھ لیا۔

”تم کیا جانتی ہو، یہ مجھے نہیں معلوم......“ مرد کی آواز سنائی دی۔

”لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تم مجھے یونہی ترساتی رہو گی اور زندگی ہمیں خدا حافظ کہہ دے گی۔“

”تو کیا میں اتنے عرصے سے تمہارے ساتھ ٹائم پاس کر رہی ہوں؟“ ممانی کا لہجہ تیز تھا۔

”قاسم کی غیر موجودگی میں تمہیں یہاں بلاتی ہوں تو میری عزت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ کیا اس بات کے لئے یہ ثبوت کم ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں؟“

”تو پھر کس بات کا انتظار ہے......“ مرد نے کہا۔

”تم صرف اشارہ کرو...... اسی دن تمہارے منہ بولے شوہر کی لاش ملے گی...... ہاں...... تمہاری قسم......“

”منہ بولا شوہر......“ ممانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ارے بھئی...... ہم دونوں باقاعدہ میاں بیوی ہیں قاسم سے میرا نکاح ہوا ہے۔“

”تم نے اب تک اس کے کتنے بچے پیدا کردیئے؟“ مرد ہنسا۔

"میں تو اسے منہ بولا شوہر ہی کہوں گا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟" ممانی نے جواب دیا۔

"یہ کمی تو خود اس میں ہے..... اس نے بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا..... ویسے ایک بات ضرور ہے میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس نے اولاد کے علاوہ مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے اور مجھے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے۔"

"میں جانتا ہوں....." مرد نے کہا۔

"مجھے ابھی موقع دو..... میں تمہاری وہ خواہش پوری کردوں گا جو قاسم نہیں کرسکا..... باقی تو میں بھی تمہارا ہر طرح سے خیال رکھنے کو تیار ہوں۔"

"بہت بے شرم ہو....." ممانی کی آواز آئی۔

"اتنی بے صبری مت کرو..... بس تھوڑا سا انتظار اور کرلو..... کیونکہ گرم گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔"

"اچھا..... میں صبر کرلیتا ہوں..... لیکن آج یہ بتادو کہ میں تمہیں قاسم سے چھٹکارا کب دلواؤں؟"

"تم کیا کرو گے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"نہیں..... پہلے بتاؤ۔"

"میں اسے حادثاتی موت کا شکار بناؤں گا۔" مرد نے کہا۔

"وہ کار ہمیشہ تیز رفتاری سے چلاتا ہے..... اگر کار کے بریک فیل ہوجائیں تو اسے سنبھالنا قاسم کے لئے ناممکن ہوجائے گا یوں وہ جہنم رشید ہوگا اور تمہیں اس سے چھٹکارا مل جائے گا، اس حادثاتی موت میں نہ تو کسی کا نام آئے گا اور نہ ہی کسی پر شک ہوگا۔"

یہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے..... میں مرد کو نہیں جانتا تھا لیکن ممانی کے بارے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ان کا یہ روپ اتنا بھیانک ہوگا یہ عورت قاسم ماموں سے اس حد تک پرخاش رکھتی تھی کہ شوہر ہوتے ہوئے بھی وہ ایک غیر مرد کے ساتھ خلوت میں مصروف تھیں۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے....." ممانی بولیں۔

"لیکن اس پر عمل ہوجائے تب ہی کچھ بات بنے گی۔"

"ضرور ہوگا جان من....." مرد کی آواز میں جوش تھا۔

"اب میں تمہیں کل آکر بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہوگا..... رات بہت ہوچکی ہے اب میں جارہا ہوں اور ستون کل بھی رات میں دروازہ کھول دینا..... اوکے۔"

میں نے وہاں سے ہٹنے میں کافی تیزی دکھائی تھی، میں ایک تاریک ستون کی آڑ میں چلا گیا تھا..... میں نے دم سادھ لیا، دل کی دھڑکنیں بھی بے ربط سی ہورہی تھیں۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک درمیانے قد کا آدمی باہر نکل آیا، میں ایسے زاویے سے آڑ میں تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا..... البتہ میں اسے بہ خوبی دیکھ رہا تھا ۔راہداری میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی کمرے کا دروازہ بند ہوا تو وہ شخص بھی سائے کی مانند دکھائی دینے لگا۔

وہ کافی محتاط انداز میں آگے بڑھا جب اس نے کافی فاصلہ طے کرلیا تو میں نے ایک بار پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس بار ممانی کی شکل دکھائی دی۔

ان کا رخ بھی صدر دروازے کی طرف تھا، میرا اس طرف جانا ابھی مناسب نہیں تھا چنانچہ میں اسی جگہ دبکا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ممانی کی واپسی ہوئی اور انہوں نے کمرے میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا۔

وہ یقیناً اپنے "مہمان" کو رخصت کرکے واپس پلٹی تھیں، کیونکہ..... صدر دروازے کو لاک بھی تو کرنا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور ستون کی آڑ میں نکل آیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، عورت اس حد تک جاسکتی تھی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

قاسم ماموں کس قدر اچھے انسان تھے ..... خاموش طبیعت، ملنسار اور دوسروں کا خیال رکھنے والے تھے..... یہ عورت ان کے لئے برا سوچ رہی تھی۔؟

ممانی کے ساتھ اس وقت جو کوئی بھی تھا، میں اسے نہیں جانتا تھا لیکن میں نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ اس کے تعلقات ممانی صاحبہ سے کافی پرانے تھے۔ یہ چکر نہ جانے کب سے چل رہا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا..... قاسم ماموں کو یہ سب کچھ بتانا بہت ضروری تھا..... کیونکہ سب سے زیادہ ہولناک بات یہ تھی کہ بند کمرے میں ان کی موت کے منصوبے بنائے جارہے تھے۔

یہ سب کچھ کتنا عجیب تھا..... میں تو اتفاق سے اس طرف نکل آیا تھا..... اگر میں نہ آتا تو شاید اندر ہی اندر کھچڑی پکتی رہتی اور نہ جانے قاسم ماموں کے ساتھ کیا ہوتا.....

قاسم ماموں اور ممانی صاحبہ کے درمیان میں کیا چل رہا تھا اس کا مجھے قطعی علم نہیں تھا، البتہ ایک انجان آدمی سے ممانی صاحبہ کا گٹھ جوڑ میں دیکھ چکا تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف آہی رہا تھا کہ لان کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔

میں نے لان پر ایک سرسری سی نظر ڈالی..... مجھے یوں لگا تھا جیسے لان میں کوئی موجود ہے..... رات کے اس سناٹے میں اس لان میں کون ہوسکتا ہے؟ یہ ضرور میرا وہم تھا..... چنانچہ میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

رحیم بابا کے کمرے میں اب بھی روشنی ہورہی تھی..... کیوں نا ان سے ملاقات کی جائے.....؟ میں نے سوچا۔

کمرے میں ہونے والی روشنی سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں..... لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ معمول کی طرح آج لائٹ آف کئے بغیر ہی سوگئے ہوں۔

چنانچہ میں ان کے دروازے پر دستک دینے کی خواہش کو رد کرتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

ہاں جی بے خبر سورہی تھیں..... میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا..... کئی خیالات میرے ذہن میں گردش کررہے تھے۔

اور پھر نہ جانے کب ان خیالوں کی دنیا سے نکل کر میں نیند کی آغوش میں گم ہوگیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن دوپہر کے وقت میں نے رحیم بابا کو گھیر لیا وہ اس وقت لان میں ہی موجود تھے..... اور ایک بڑی سی قینچی کی مدد سے فاضل گھاس کو کاٹ کر ہموار کررہے تھے۔

انہوں نے میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولے۔

"تم بہت اچھے موقع پر آئے ہو بیٹا..... اس وقت کافی بہتر طریقے سے بات ہوسکتی ہے..... یوں سمجھو کہ ابھی ابھی میں نے تمہیں یاد ہی کیا تھا۔"

"اوہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ضرور کچھ معلوم کرلیا ہے۔"

"ہاں....." انہوں نے سر ہلایا۔

"لیکن میں زیادہ نہیں جان سکا..... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کافی عرصے پہلے اس لائن کو خیر باد کہہ چکا ہوں۔"

"تو پھر کیا معلوم کیا ہے آپ نے؟" میں نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"میں ضرور بتاؤں گا..... لیکن پہلے تم ایک وعدہ کرو....." انہوں نے کہا۔

"وعدہ.....؟ کیسا وعدہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس بات کا وعدہ کہ تم میری باتوں کو سن کر پریشان نہیں ہوگے اور نہ ہی کسی قسم کا ڈر یا خوف تمہارے قریب آئے گا..... پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو۔"

"تو کیا آپ کوئی خطرناک بات کرنے والے ہیں؟" میں پریشان سا ہوگیا۔

"ارے..... تم تو ابھی سے ڈر گئے....." وہ میرے گال پر تھپکی دے کر بولے۔

"اگر میں نے بتادیا تو تمہارا کیا حال

ہوگا......؟"

"کچھ نہیں ہوگا بابا......" میں نے خود کو سنبھالا۔

"آپ مجھے بتائیں......"

"اچھا......" انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔

"شکیل بیٹا...... بات دراصل یہ ہے کہ حویلی سے جب تم یہاں آئے ہو، تو کوئی اور بھی تمہارے ساتھ یہاں آ گیا ہے۔"

"کون...... کیا آپ ماں جی کی بات کر رہے ہیں......؟"

"نہیں......" ان کا لہجہ واقعی کافی پراسرار تھا۔

"وہ کون ہے...... اس بارے میں مجھے بھی معلوم نہیں ہوسکا...... لیکن میرا حساب کتاب کا زائچہ کہہ رہا ہے کہ یہ وہی ہے جس نے تمہارے خاندان کے لوگوں کو ہلاک کیا ہے...... وہی...... جس نے آقال کی نسلیں اجاڑ دیں...... اور...... وہی جس نے آخرکار تمہارے باپ کی جان لے لی...... وہ یہاں پر بھی تمہارے ساتھ آچکا ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا...... نہ جانے کتنی دیر گزر گئی کہ میں گویا پتھر کا بت بنا ہوا رحیم بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا......؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں میرے بچے......" وہ بولے۔

"کیونکہ میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوا، یہ الگ بات ہے کہ میں اسی چکر میں رات بھر جاگتا رہا۔ کیونکہ عرصہ دراز سے ان چیزوں سے دور ہونے کی بنا پر مجھے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن پھر جو کچھ سامنے آیا اس میں مجھے یہی معلوم ہوا کہ وہ اوپری شے تمہارے ساتھ ساتھ چل کر یہاں آ گئی ہے۔"

"وہ کون ہے بابا......؟ اور کہاں ہے......؟"

"یہ بات تو مجھے نہیں معلوم......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیونکہ اس سلسلے میں میرا علم اندھیرے میں رہا...... تمہاری والدہ نے اس دن جو کچھ کہا تھا وہ اسی شے کے زیر اثر رہ کر کہا تھا۔"

"اوہ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم دونوں کی باری ہے......؟" میں آہستہ سے بولا۔ اور پھر خوف زدہ انداز میں رحیم بابا کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں میرے بچے......" وہ فوراً بولے۔

"تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، میں موجود ہوں...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... تم مجھے اپنے والد کی جگہ ہی سمجھو...... میرا تو اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے، میں تمہاری خاطر کچھ ایسا ضرور کرسکتا ہوں...... کہ تم محفوظ رہ سکو...... تمہیں کوئی گزند پہنچے اتنے سے عرصے میں تم مجھے اتنے عزیز ہوچکے ہو کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم میرے ہی جگر کے ٹکڑے ہو...... میرے ہوتے ہوئے تمہیں خوف زدہ یا پریشان ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن رحیم بابا......" میں نے کہنا چاہا۔

"اگر آپ بھی اس میدان میں کود پڑے تو کہیں وہ آپ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ مجھے یہ خدشہ ہے۔" یہ سن کر وہ مسکرائے اور بولے۔

"تم اس کی فکر مت کرو...... میرا طریقہ کار ایسا ہے کہ میں ذرا مختلف انداز میں کام کرتا ہوں...... تم ان باتوں کو چھوڑ دو...... اور بالکل فکر مت کرو...... میں تمہارے لئے کچھ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے، عین اسی وقت میرے منہ سے نکل گیا۔

"رات کو مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس باغیچے میں کوئی موجود ہے۔ میں رات کافی حد تک ڈر گیا تھا۔"

"رات میں......" وہ چونکے۔

"تم رات کے وقت یہاں کیوں آئے تھے۔"

"جی......" میں گھبرا سا گیا۔

"بس یونہی...... نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے سوچا کہ باہر نکل کر ذرا ٹہل لگا لوں۔"

"ہوں......" انہوں نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ انہیں رات کے واقعہ کے بارے میں بتا دوں...... لیکن پھر قاسم ماموں کی عزت کی خاطر میں نے اپنی زبان پر قابو رکھا، کیونکہ مجھے سب سے پہلے انہیں اس بارے میں اطلاع دینا تھی...... میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ رحیم بابا کو بتانا مناسب ہوگا کہ نہیں...... چنانچہ میں نے اس بات پر پردہ ڈالنا ہی بہتر خیال کیا تھا۔

میں وہاں سے اٹھنے لگا تو رحیم بابا نے کہا۔

"میں ایک بار پھر تمہیں آگاہ کر رہا ہوں...... تم قطعی پریشان مت ہونا۔ اگر آدھی رات میں بھی کوئی مسئلہ ہو تو میں حاضر ہوں۔ فوراً ہی میرے پاس چلے آنا...... پھر میں دیکھ لوں گا...... ہاں......"

☆......☆......☆

آج کی رات میرے لئے بہت اہمیت کی حامل تھی کیونکہ آج اس شخص نے آکر ممانی صاحبہ کو قاسم ماموں کے خلاف منصوبے سے آگاہ کرنا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ آج بھی ضرور آئے گا، کیونکہ اس نے رخصت ہوتے وقت ممانی صاحبہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ رات میں صدر دروازے کو کھول دیں۔

اور پھر یوں بھی رات میں ہوتا ہی کون تھا......

؟رحیم بابا اپنے کمرے میں بند ہوجاتے تھے، جبکہ خانساماں نصیر اور اس کی بیوی شبو بھی سرونٹ کوارٹر والے حصے میں ہی موجود ہوتے تھے...... کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ رات کے وقت کھلم کھلا ادھر ادھر گھوم سکیں...... کوٹھی کی لائیٹس بند ہوجانے کے بعد ہی اپنے اپنے کمروں کا رخ کر لیتے تھے...... قاسم ماموں نے چوکیدار کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی...... اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس قسم کا کوئی بندہ رکھا تھا...... گھر میں تین نوکر تھے، بس وہی کافی تھے۔

ماں جی جلدی سوگئی تھیں، لیکن مجھے جاگنا تھا تاکہ وقت مقررہ پر پہنچ کر ساری معلومات حاصل کرسکوں...... مجھے ان باتوں کا بالکل تجربہ نہیں تھا، لیکن اپنے عزیز ماموں کی خاطر میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

آج نیند مجھے بہت تنگ کر رہی تھی، میں جانتا تھا کہ اگر میں بستر پر لیٹ گیا تو پھر میرا اٹھنا مشکل ہوجائے گا اور میں کچھ بھی نہ جان سکوں گا، چنانچہ میں اٹھا اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

باہر کا منظر بہت دلکش لگ رہا تھا، سامنے لان تھا، چاندنی کی روشنی میں نہا کر پودے اور درخت عجیب سا سماں باندھ رہے تھے، اور پھر خنک سی ہوا میرے چہرے پر پڑ کر مجھے نیند کے جھونکوں سے روشناس کروا رہی تھی۔

ایسے میں مجھے رحیم بابا کی باتیں یاد آ گئیں......

کیا ان کی یہ بات درست تھی کہ حویلی سے کوئی شے ہمارے ساتھ یہاں آ گئی ہے؟ اگر واقعی ایسا تھا، تو اس کا مقصد کیا تھا......؟

اباجی کو میرے سامنے ماں جی نے خنجر سے ہلاک کیا تھا، مجھے اب اس بات کا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس وقت ماں جی کے ذریعے کسی اور نے یہ کام کیا تھا۔ کیونکہ نہ تو ماں جی کی انگلیوں کے نشانات اس خنجر پر موجود تھے اور نہ ہی انہیں یہ یاد تھا کہ اباجی کو قتل کرنے والی وہ خود ہیں وہ تو خود بے چاری بے حال ہوگئی تھیں ورنہ قتل کرنے والا اس قدر زبردست ایکٹنگ نہیں کرسکتا...... یہ حقیقت تھی کہ وہ اباجی کے کاموں کے خلاف تھیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ انہیں اس کام سے باز رکھنے کے لئے اتنا بڑا قدم اٹھالیتیں آخر قتل کرنا اتنا آسان تو نہیں ہوتا...... اور وہ بھی اس طرح کی بڑی مہارت سے ایک ہی وار میں مقابل کو زیر کرلیا جائے...... یہ سب کچھ ماں جی کے بس کا روگ تو نہیں تھا۔

لیکن وہ جو کوئی بھی تھا وہ اگر دشمنی نکالنا چاہتا تھا، تو اس کے پاس پورا موقع تھا کہ وہ مجھے بھی اسی وقت فنا کردیتا۔ لیکن میں زندہ سلامت تھا، اس نے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچائی تھی...... اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ ہمارے خاندان کا برسہا برس سے دشمن ہے تو پھر مجھے زندہ چھوڑ دینے کا آخر کیا مقصد تھا؟ میں بھی تو اسی دشمن کا

خون تھا۔

اور پھر بقول رحیم بابا کے کہ وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں آچکا ہے..... یہ بات بھی کسی حد تک درست لگ رہی تھی، کیونکہ اس دن ماں جی نے بے خودی کے سے عالم میں کسی جان لیوا کا ذکر کیا تھا..... لیکن اگر وہ یہاں آچکا تھا تو اس کا کیا مقصد تھا.....؟

میں اس معاملے میں جس قدر سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا..... یہ سب کچھ کیا تھا..... کیوں ہو رہا تھا..... آخر مقصد کیا تھا..... میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

ان ہی خیالات میں الجھ کر وقت گزرتا چلا گیا.....

اچانک ہی ایک ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی..... رات کے سناٹے میں گونجنے والی یہ آواز یقیناً صدر دروازے کے کھلنے کی آواز تھی..... شاید وہ آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس بار میں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ دوسری طرف سے گھوم کر قاسم ماموں کے کمرے کی طرف پہنچتا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ آدمی اس وقت ممانی صاحبہ کے کمرے میں موجود تھا..... کیونکہ میں دروازے کی چرچراہٹ سنتے ہی کمرے سے باہر نکلا تھا اور پھر درختوں کی آڑ سے میں نے ایک سائے کو عمارت کے ذیلی حصے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا، اس سائے کو میں صاف طور پر پہچان چکا تھا..... یہ ممانی صاحبہ کا وہی "ہمدرد" تھا۔

میں کافی دیر تک ستون کی آڑ میں کھڑا رہا، مجھے اب یقین ہو چلا تھا کہ وہ دونوں اب باتوں میں مصروف ہو چکے ہوں گے چنانچہ میں ایک بار پھر اس کھڑکی کے قریب پہنچ گیا، جس کی درز آج بھی کھلی ہوئی تھی۔

کھڑکی کا پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا.....

میں نے سر کو خم کر کے اپنی سماعت کی تمام قوتیں اندر سے اٹھنے والی آوازوں پر صرف کر دیں۔

ان دونوں کے درمیان گفتگو کا دور شروع ہو چکا تھا..... میں نے سنا وہ آدمی بول رہا تھا۔

"کل تم پارٹی میں جا رہی ہو.....؟"

"نہیں.....!" ممانی صاحبہ کی آواز ابھری

"کیوں.....؟" آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

"بس..... میری مرضی۔"

"لیکن تم تو اس کے لئے بڑی بے چین ہو رہی تھیں..... کل بھی تم نے تذکرہ کیا تھا کہ تم اپنی اس کزن کو بہت لائق کرتی ہو، اور وہ تمہارے بغیر پارٹی کرے گی ہی نہیں تو پھر آج کیا ہو.....؟"

"وقار..... میرا موڈ اچانک ہی بدلتا ہے....." ممانی کی آواز میں شوخی سی جھلک رہی تھی۔

"میرا بھروسہ مت کرنا۔"

"اوہ..... تو ان صاحب کا نام وقار ہے۔" میں نے دل میں سوچا، اور دوبارہ ان کی باتوں پر کان لگا دیئے۔

"اوہو....." وقار نے کہا تھا۔

"یہ بات ہے..... چلو پھر..... موقع لگا تو ہم بھی اپنا موڈ بدل لیں گے، اس وقت شکایت مت کرنا۔"

"میں تمہارا گلہ دبا دوں گی.....!" ممانی صاحبہ کے لہجے میں غصہ در آیا۔

غصہ تو اس وقت مجھے بھی آ رہا تھا، کیونکہ یہ لوگ فضول سی باتوں میں لگے ہوئے تھے، جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اب یہ دونوں نہ جانے کب اصل موضوع کی طرف آتے..... میرا یہاں اس طرح کھڑے رہنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔

لیکن میں مجبور تھا، یہ کام تو مجھے کرنا تھا، ورنہ ان شیطان صفت لوگوں کی چالوں کے بارے میں کیسے معلوم ہوتا؟

"شازیہ نے مجھے بھی بلایا ہے....." وقار نے گویا ممانی صاحبہ کو اطلاع دی۔

"ہوں..... تم ضرور جاؤ..... کس نے روکا ہے....."

"لیکن جب تم وہاں نہیں ہوگی تو پارٹی کیا خاک ہوگی.....؟"

"ارے.....!" اچانک ہی وقار بولتے بولتے رک گیا۔

"میری بات سنو.....!" وقار نے صرف اتنا کہا اور پھر اس کے بعد جو کچھ اس نے بولا ہوگا وہ اتنا مدہم تھا کہ میں سن نہ سکا۔

نہ جانے کیوں میں بے چین ہو گیا، آخر وہ کیا بات تھی، جو وقار نے اس قدر تنہائی کے عالم میں بھی ممانی صاحبہ کے کان میں بولی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟" اس کی بات سن کر ممانی صاحبہ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مجھے ایسا محسوس ہوا ہے....." وقار کی آواز آئی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے....." ممانی نے جواب دیا تھا۔

"ایسا کچھ ہو نہیں سکتا..... کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے..... خیر..... میں دیکھتی ہوں۔"

میں ابھی تک ان دونوں کی باتیں سمجھ نہیں سکا تھا..... وقار نے کیا محسوس کیا تھا..... اگر میں اس وقت ہی سمجھ گیا ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔

میرے کان اور میرا ذہن تو بس اسی طرف مائل تھا، چنانچہ مجھے اس وقت ہوش آیا جب قاسم ماموں کے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔

میری سٹی گم ہو گئی، ممانی صاحبہ دروازے سے باہر آ چکی تھیں اور اس عورت کی خون خوار آنکھیں جیسے میرے جسم میں گڑی جا رہی تھیں۔

"تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟" وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکاریں۔

میں نے جو کچھ سوچا تھا، جو چاہا تھا اور جو ارادہ کیا تھا خیالوں کا وہ تاج محل مجھے پل بھر میں راکھ کا ڈھیر بنتا ہوا دکھائی دیا۔

چور جب سینہ ٹھونک کر بات کرے، تو پھر اس وقت کیا ہوتا ہے..... اس عورت کو میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا، لیکن اس کے چہرے پر نہ خوف تھا اور نہ ہی کسی قسم کی پریشانی، بلکہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا تھا۔

میں نے جی کڑا کیا اور بولا۔

"میں تو یہاں سے گزر رہا تھا ممانی مجھے آپ کے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی تو میں یہاں رک گیا۔"

"میرے کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں؟" انہوں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر وہ چونک کر بولیں۔

"کہیں تمہیں نیند میں چلنے کی عادت تو نہیں ہے؟"

"میں تو آج سویا ہی نہیں ہوں ممانی۔" میں نے سچ بولا تھا۔

"کیونکہ آج مجھے نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔"

"ہوں.....! تو تم دوسروں کی نیند اڑانے کے لئے نکلے ہو۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اور سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تم اس طرف آئے کیوں تھے؟ تمہارے ماموں نے تمہیں ایک کمرہ اور کھانا پینا دے رکھا ہے، تو کیا وہ کم ہے.....؟ بتاؤ؟"

"بتا دوں گا....." میں نے سر ہلایا۔

"لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ کمرے میں کون ہے، اور آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"اپنی زبان کو سنبھالو لڑکے....." وہ بپھر گئیں۔

"تم جانتے ہو کہ تمہارے ماموں گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اور کون ہوگا، جس سے میں باتیں کروں گی.....؟ ہاں البتہ میں فون پر ضرور ان سے باتیں کر رہی تھی۔"

"لیکن میں فون پر ہونے والی گفتگو میں دوسری طرف کی بات کیسے سن سکتا ہوں؟" میرا سوال معقول تھا۔

ممانی کے چہرے پر ہلکا سا تغیر ظاہر ہوا، لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں نے مرد کی آواز بھی سنی ہے۔" میں بولا۔

”اگر وہ ماموں ہی تھے تو میں فون کے ذریعے ان کی آواز کیسے سن سکتا ہوں۔“

”یا تو تمہارے کان بجے ہیں یا پھر تم کوئی ڈھونگ رچانے کے چکر میں ہو...... آؤ...... تم آؤ میرے ساتھ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کمرے کی طرف کھینچا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

اب میں نے چاروں طرف نظر ڈالی تو مجھے کمرہ خالی دکھائی دیا...... یہاں واقعی کوئی نہیں تھا۔

میں ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا...... عین اسی وقت میری نگاہ سامنے موجود بیڈ کے نیچے جاکر رک گئی۔ یہ تو سو فیصد ہی یقینی بات تھی کہ وہ آدمی اس کمرے میں موجود تھا، لیکن کسی کے چھپنے کے لئے بیڈ کے نیچے کافی بہترین جگہ ہوتی ہے چنانچہ میرے قدم اسی طرف اٹھنے لگے۔

لیکن اسی وقت ممانی نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

”اے...... تم کہاں جارہے ہو......؟“

”میں اس بیڈ کے نیچے دیکھوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم پولیس والے ہو......؟“ ان کا لہجہ تیز تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے...... اور آئندہ اس طرف کا رخ بھی مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے ممانی......“ میں سر ہلا کر رک گیا۔

”میں جارہا ہوں اس کمرے میں واقعی کوئی نہیں ہے...... میرا مطلب ہے کہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا...... ہوسکتا ہے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں لیکن جو یہاں نہیں ہے میں آپ کو اس کا نام بھی بتا سکتا ہوں۔“

”نام......؟“ وہ چونک کر بولیں اور مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

”جی ہاں...... نام......“ میں مسکرایا۔

جو یہاں نہیں ہے...... اس کا نام وقار ہے۔“

وقار کا نام میرے منہ سے سنتے ہی گویا انہیں 440 وولٹ کا کرنٹ لگ گیا تھا، لیکن میں ان کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا۔

”ٹھیک ہے...... میں جارہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

”سنو......!“ ممانی نے عقب سے مجھے پکارا۔

میں پلٹ کر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لیکن یہ چہرہ ممانی کا تو ہرگز نہیں تھا جو غضب ناک ہوکر جیسے مسخ ہوگیا تھا۔

دفعتاً وہ دہاڑ کر بولیں۔

”آئندہ یہ نام تمہاری زبان پر نہیں آئے...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”وہ تو اب ہے بھی نہیں ممانی۔“ میں نے منہ بنایا۔

”کیونکہ آپ میرے ماموں جیسے شخص کو دھوکا دے رہی ہیں۔“

مجھے اس عورت پر واقعی غصہ آرہا تھا۔

”میں گدی سے تمہاری زبان کھینچ لوں گی......“ وہ غرا کر بولیں۔

”میں اب تمہیں ایک پل کے لئے بھی اپنی اس چھت کے نیچے برداشت نہیں کرسکتی، لیکن میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں صبح تک کی مہلت دے رہی ہوں...... جیسے ہی سورج کی پہلی کرن پھوٹے تم اپنی ماں سمیت یہاں سے دفع ہوجاؤ...... اور مجھے کبھی اپنی صورت بھی مت دکھانا...... جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں ابھی دھکے دے کر نکال باہر کروں...... جاؤ......!“

اس کی آواز تھراہٹ سے گویا کمرے کی دیواریں لرز اٹھیں...... میں سناٹے میں آگیا۔

کسی تھکے ہوئے جواری کی طرح میرا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجرم کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے میں خود ہی شرمساری کا نمونہ بن کے رہ جاؤں گا۔

میں اب کوئی معصوم بچہ نہیں تھا، میں کالج لائف میں قدم رکھ چکا تھا، چنانچہ عملی طور پر نہ سہی لیکن میرے مشاہدے کے مطابق یہ عورت بہ کائیاں اور شاطر تھی۔

کاش مجھے اس کے بارے میں ذرا بھی اندازہ ہوتا تو پھر میں کوئی اور راستہ اختیار کرتا...... دراصل میں آپ لوگوں کو یہ بتاتا چلوں کہ اس زمانے میں مجھے اسرار و سراغ رسی کی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا اسکول کے زمانے میں کئی ناول پڑھ ڈالے تھے۔ شاید اسی بنا پر میرا ذہن کسی حد تک کام کررہا تھا۔

بہر حال ان سب باتوں کے باوجود میں ناکام رہا تھا...... اگر غور کیا جائے یہ محض اتفاق ہی تھا کہ مجھے ممانی اور وقار کے تعلقات کا علم ہوگیا تھا...... اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان دونوں کو کس طرح اندازہ ہوا کہ میں کھڑکی کے قریب موجود ہوں۔ کیونکہ میں کمرے میں داخل ہوکر دیکھ چکا تھا کہ بیڈ کمرے کے وسط میں موجود تھا تو پھر کیا وقار کو کسی نے کان میں پھونک دیا تھا کہ میں ان دونوں کی باتیں سن رہا ہوں......؟

یہ باتیں میرے ذہن سے بالاتر تھیں میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا...... چنانچہ اپنے سر کو جھٹک کر میں کمرے میں آیا اور ماں جی کو اٹھانے لگا۔

جلد ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور چندھیائی ہوئی آنکھوں میں حیرت لئے ہوئے میری طرف دیکھنے لگیں۔

”اٹھ جاؤ ماں جی...... یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔“ میں نے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو......؟“ انہوں نے حیران ہوکر پوچھا۔

نیند ان کی آنکھوں سے اچٹ گئی تھی۔

”ہاں ماں جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں...... ممانی صاحبہ نے حکم جاری کردیا ہے کہ اپنی ماں کو لے کر یہاں سے رخصت ہوجاؤ۔“

”ارے تو کیوں...... ایسی کیا آفت آگئی...... کیا وہ یک بیک پاگل ہوگئی ہے؟“ وہ اب بھی حیرت میں تھیں۔

اب میں مجبور تھا کہ انہیں ساری کہانی سنا ڈالوں، چنانچہ میں نے من و عن ان کے سامنے سب کچھ بیان کردیا، وہ منہ کھولے ہوئے سن رہی تھیں میں خاموش ہوا تو وہ بولیں۔

”یہ...... یہ تم کیا سنا رہے ہو......؟ ارے...... جب بے چارے قاسم کو علم ہوگا، تو اس کا کیا حال ہوگا...... یہ عورت اتنی بدذات ہے...... میرے خدایا......“ ماں جی کے لہجے میں تاسف تھا۔

”یہ سب کچھ تو اب بعد میں دیکھا جائے گا ماں جی......“ میں نے کہا۔

”میں سامان سمیٹ رہا ہوں...... آپ بھی اپنی چیزیں دیکھ لو۔“

”قاسم نہ جانے کہاں ہوگا......“ وہ پھر بڑبڑائیں۔

”ورنہ وہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ ہونے دیتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ ایک ناگن کو اپنے گھر میں پال رہا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے میں موجود سامان کا جائزہ لینے لگا۔

صبح تک ہماری روانگی کی تیاری مکمل ہوچکی تھی، میں ایک سامان بردار گاڑی میں اپنا سامان رکھوا ہی رہا تھا کہ نصیر اور اس کی بیوی کے ساتھ ساتھ رحیم بابا بھی وہاں آکر کھڑے ہوگئے۔

ان سب کی آنکھوں میں حیرت کے دیئے جل اٹھے تھے رحیم بابا نے فوراً پوچھا۔

”یہ کیا ہورہا ہے بھئی...... کہاں کی تیاری ہے؟“

میں دھیرے سے مسکرایا اور ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پہنچی وہیں پہ خاک...... جہاں کا خمیر تھا...... میں اپنی ماں جی کے ساتھ دوبارہ حویلی جارہا ہوں۔“

”حویلی...... مگر کیوں...... قاسم میاں تو تمہیں خود وہاں سے لے کر آئے تھے۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے سائیڈ پر لے گئے اور آہستہ سے بولے۔

”بتاؤ...... کیوں جارہے ہو...... کیا بات ہوگئی......؟“

”رحیم بابا......“ میں دبی آواز میں بولا۔

”اس وقت نہ تو موقع ہے اور نہ محل کہ میں آپ کو تفصیل بتاؤں...... کیا آپ حویلی آسکتے ہیں۔“

”ضرور آؤں گا...... ہوسکتا ہے کہ میں آج ہی چکر لگاؤں۔“ وہ فوراً بولے۔

”نہیں......“ میں نے کہا۔

”آپ آج رہنے دیں...... موقع دیکھ کر ایک دو دن میں ایسا وقت نکالیں کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو کہ آپ وہاں آئے ہیں۔“

”اچھا......“

”جی ہاں...... مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں...... فی الحال تو مجھے یہاں سے نکلنا ہے...... ایسا نہ ہو کہ ممانی صاحبہ اٹھ جائیں۔“

”اوہ......“ رحیم بابا کے منہ سے نکلا۔

”تو ان سے کوئی بات ہوئی ہے۔“

”یہی سمجھ لیں......“ میں نے مختصراً جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ماں جی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

میرے آباؤ اجداد کی یہ حویلی...... آج مجھے پہلے سے بھی زیادہ ویران اور پراسرار دکھائی دے رہی تھی۔

گزرے ہوئے وقت کی کئی تلخ یادوں کے باوجود میں پھر اسی جگہ موجود تھا۔ حالانکہ قاسم ماموں نے کہا تھا کہ میں اب کبھی تم لوگوں کو یہاں نہیں آنے دوں گا۔

لیکن نصیب کا لکھا ہوا کون مٹا سکتا ہے......؟ اور ابھی تو میری داستان شروع بھی نہیں ہوئی تھی...... ابھی تو صرف آغاز تھا...... صرف اور صرف آغاز...... میری زندگی جس ڈگر پر جانے والی تھی، اس کا مجھے قطعی علم نہیں تھا......

بہرحال میں نے ایک مزدور کی مدد سے گھر کے سامان کو دوبارہ سیٹ کیا تھا، ویسے میں اب تہیہ کرچکا تھا کہ کم از کم قاسم ماموں کے گھر میں دوبارہ قیام ہرگز نہیں کروں گا...... مجھے جس طرح کی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ ایسی نہیں تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جائے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اپنے عزیز ترین ماموں کے ساتھ غلط ہونے دوں گا۔

میں نے رحیم بابا کو یہاں اسی لئے بلایا تھا کہ انہیں موجودہ سنگین حالات سے آگاہ کرسکوں وقار نامی اس شخص کی باتوں کی روشنی میں قاسم ماموں کی جان کو بھی خطرہ لاحق تھا۔

جو عورت رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بھی تن کر کھڑی ہوجائے وہ کس قدر دلیر ہوگی......؟ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وقار اس وقت بیڈ کے نیچے ہی چھپا ہوا تھا اسی لئے ممانی صاحبہ فوراً ہی مجھ پر بھڑک اٹھی تھیں کیونکہ انہیں اندازہ ہوچکا تھا کہ اگر میں نے بیڈ کی تلاشی لے لی۔ تو بھانڈا پورے کا پورا پھوٹ جائے گا...... ورنہ تو اپنی ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری سے اس نے کسی حد تک مجھے زیر کر ہی لیا تھا۔

ماں جی کا ہے بہ گاہے اپنا سامان ترتیب دیتے ہوئے ممانی صاحبہ کی ”شان میں قصیدے“ پڑھنے لگتی تھیں مجھے کبھی غصہ آتا اور کبھی بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر عود کر آتی...... اور میں کر بھی کیا سکتا تھا؟

اس حویلی میں جو کچھ بھی ہوا تھا، جیسے بھی حادثات اور واقعات پیش آئے تھے، لیکن ایک بات ضرور تھی...... اور وہ یہ کہ یہاں سے کوئی ہمیں نکال نہیں سکتا تھا...... کسی کی مجال نہیں تھی کہ ہمیں حویلی کے کسی بھی حصے میں جانے سے روک دیتا...... یا پھر کوئی اور روک ٹوک ہوتی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے خود بہ خود حویلی کی ان دیواروں پر پیار آنے لگا...... ہاں...... اپنا کچھ بھی ہو...... وہ اپنا ہی ہوتا ہے...... کسی غیر کی چھت کے نیچے رہنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے ہی چار ڈنڈے زمین میں گاڑ کر ان کے اوپر چادر باندھے اور پڑا رہے۔

بس یہاں ایک مشکل کا سامنا تھا، اور وہ یہ کہ جیب تقریباً خالی تھی...... قاسم ماموں نے اپنے طور پر ماں جی کو کچھ رقم دے رکھی تھی لیکن وہ کب تک چل سکتی

تھی...... چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ نوکری تلاش کروں گا...... تاکہ گھر کے اخراجات کا بوجھ اٹھاسکوں۔

میں نے ماں جی سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے کہا۔

”تم نوکری ضرور کرنا...... لیکن پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو...... اگر تم نے ابھی سے نوکری کرلی تو پھر بعد میں تم پڑھائی پر دھیان نہیں دے سکو گے۔“ ان کی بات ٹھیک تھی، لیکن مسئلہ تو گھر کے اخراجات کا تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

”تعلیم تو واقعی ضروری ہے، لیکن ماں جی گھر کا خرچہ کیسے چلے گا پھر......؟“

”تم اس کی فکر مت کرو...... میں نے سوچ لیا ہے۔“ وہ بولیں۔

”کیا......؟“

”یہ گھر اتنا بڑا ہے ہم اس کا وہ حصہ کرائے پر دے دیں گے جو تمہارے باپ کے مصرف میں تھا...... ہم دو ماں بیٹے ہی تو رہ گئے ہیں اتنے بڑے گھر کا کیا ہم اچار ڈالیں گے...... بولو......؟“

”واقعی...... یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں......“ میں قائل ہوگیا تھا۔

”ہاں...... اسی لئے کہہ رہی ہوں کہ تم صرف پڑھائی پر دھیان دو......“ انہوں نے کہا۔

”مجھے سلائی کڑھائی کا کام بھی خوب آتا ہے...... میں گھر میں خالی بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی ہوں...... یہ کام شروع کردوں گی تو ذرا دل بہلے گا...... پھر اس کی بدولت چار عورتوں کا بھی گھر میں آنا جانا ہوجائے گا۔ یوں میرا بھی وقت اچھا گزر جائے گا...... پھر تم بھی اب جوان ہوچکے ہو...... تھوڑے عرصے بعد میں تمہاری شادی کردوں گی، تو ایک بہو بھی گھر میں آجائے گی بس پھر تو مت پوچھو کہ گھر میں کتنی رونق ہوگی......“ میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے جو بندہ مجھے یاد آیا تھا وہ سدو تھا...... وہ...... سدو...... جو میرے بچپن سے میرا دوست تھا...... قاسم ماموں کے گھر جانے کے بعد اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، لیکن دوبارہ یہاں آتے ہی مجھے اس کی یاد ستانے لگی...... چنانچہ میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

حسب عادت وہ اپنے گھر پر موجود نہیں تھا، ویسے مجھے خود بھی یقین تھا کہ وہ گھر پر ملے گا بھی نہیں...... لیکن صرف دل کی تسلی کے لئے میں نے اپنا وقت ضائع کرنا ضروری سمجھا تھا۔

اب میں نے اسے ان ”اڈوں“ پر ڈھونڈا جہاں اس کے ملنے کی امید تھی۔ جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد آخرکار وہ ایک پرچون والے سے گپیں ہانکتا ہوا دکھائی دے گیا۔

وہ اس سے باتوں میں اتنا مگن تھا کہ میری قربت کا اسے احساس بھی نہیں ہوا...... چنانچہ میں نے ازراہ مذاق اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”ابے...... کون ہے بے...... جمال ہو تم......؟ سکندر......؟ راجہ......؟ ارے بھائی تو پھر کون ہو......؟ شکیل تو ہو نہیں سکتے...... کیونکہ وہ تو اتنا بے وفا نکلا کہ اس نے پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی......“

”ایسا تو مت کہو بے چارے کو......“ میں نے اپنی آواز قدرے بھاری کرلی۔

”تم جانتے ہو کہ وہ کس حال میں یہاں سے گیا تھا الٹا تمہیں اس کا حال چال معلوم کرنا چاہے تھا...... بے وفا تو تم ہو۔“ میرے ہاتھ اب بھی اس کی آنکھوں پر تھے۔

”ارے...... تو وہ لاٹ صاحب کون سا اپنا پتا دے گئے ہیں۔“ سدو کی آواز تیز تھی۔

”میں کیا پورے شہر کی خاک چھانوں...... ارے...... مگر تم کون ہو......؟“

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹالئے، وہ تیزی سے گھوما تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے جذبات ابھر آئے، آنکھوں

میں چنک سی دوڑ گئی، وہ فوراً ہی مجھ سے لپٹ گیا۔

''ارے...... میرے دوست تم...... تم کہاں چلے گئے ہو......؟''

''میں واپس آگیا ہوں...... سدو......!''

''سچ......؟'' وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

ایسا لگ رہا تھا، جیسے اسے خزانہ مل گیا ہو۔

''ہاں...... بالکل سچ......!''

''واپس کب جاؤ گے......؟''

''اب کبھی نہیں جاؤں گا سدو......!'' میں ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''اپنا گھر پھر اپنا ہوتا ہے...... دوسرے کا کیا سہارا لینا۔''

''آؤ...... ہوٹل پر چلتے ہیں۔'' سدو نے میرے گلے میں ہاتھ ڈالا۔

''بیٹھ کر چائے بھی پئیں گے اور باتیں بھی کریں گے...... چلو......!''

''کون سے ہوٹل......؟''

''ارے وہی کاکڑ ہوٹل......'' وہ ہنسا۔

''اپنا پرانا اڈہ...... یاد ہے...... کتنی بار ہم لوگ وہاں پر چائے پینے کے بعد کھسک لئے...... ہاہا......''

''ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔

''لیکن ایسا صرف اس وقت ہوتا تھا جب میری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے...... یاد ہے......؟''

''ارے چھوڑ یہ باتیں......'' وہ کان کھجا کر بولا۔

''اب تو میرے پاس پیسے ہر وقت ہوتے ہیں...... کیونکہ میں نے اب بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا ہے۔''

میری ہنسی نکل گئی۔

''ٹیوشن...... اور وہ بھی تم......؟''

''ہاں...... کیوں......؟'' وہ ناک چڑھا کر بولا۔

''کیا میں نراجاہل ہوں......؟''

''نہیں...... تم تو پڑھے لکھے ہو......'' میں سنجیدگی سے سر ہلا کر بولا۔

''لیکن وہ ضرور قابل رحم ہوں گے جن کو تم ٹیوشن پڑھاؤ گے...... ان بے چاروں کا کیا ہوگا......!''

''چھوڑ نا یار ابھی......'' وہ کھسیا کر بولا۔

''تو تو آتے ہی شروع ہوگیا۔''

''اچھا چلو...... ہوٹل میں چل کر باتیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دونوں کاکڑ ہوٹل کی ایک میز گھیر کر بیٹھ گئے...... سدو نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''اب بتاؤ...... تم واپس کیوں آئے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے سدو۔'' میں نے طویل سانس لی۔

''میں تمہیں ضرور بتاؤں گا...... لیکن ابھی نہیں...... ذرا صبر کرو...... میں سب کچھ بتادوں گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے۔''

''سدو کی جان بھی حاضر ہے......'' وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

اتنی دیر میں چائے آگئی، میں نے کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور چائے کی چسکی لینے کے بعد بولا۔

''یہ ٹیوشن کا کیا چکر ہے......؟ تم اتنے شریف کب سے ہوگئے......؟''

''بس کیا بتاؤں......؟'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''ایسا کچھ ہوا کہ سارے الٹے سیدھے چکر چھوڑنے پڑے...... اب نہ کیرم ہے نہ فٹ بال گیم، نہ تاش اور نہ کوئی حرامی پن سب کچھ ختم ہوگیا پیارے۔''

''ارے...... مگر کیسے......؟''

سدو نے بڑے اسٹائل سے گردن اکڑالی اور اپنی قمیص کے کالر پر انگلی مار کر بولا۔

''تمہارے بھائی کو...... محبت ہوگئی ہے۔''

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہا، پھر بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔

''محبت...... اور وہ بھی تمہیں......؟''

''ہاں...... کیوں......؟ کیا میں محبت نہیں کرسکتا......؟ کیا محبت کرنے سے مجھے ہائیڈروبیہ ہوجائے گا۔''

''یہ بات نہیں ہے......'' میں نے اسے سمجھایا۔

''تم تو واقعی محبت کرسکتے ہو...... لیکن سوال یہ ہے کہ تم سے کون کرے گا؟''

''کرے گا نہیں...... بلکہ کرے گی......!'' اس نے میری اصلاح کی۔

''بلکہ کرے گی بھی نہیں...... یوں بولو کہ کرتی ہے۔''

''ارے......!'' میں چونک اٹھا۔

''جلدی بتاؤ...... کون ہے وہ بدنصیب...... ہم...... میرا مطلب ہے کہ خوش نصیب...... کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے؟''

''ہماری ہی گلی میں رہتی ہے اور ہر وقت مجھے یاد کرتی ہے......'' سدو نے بتایا۔

''اب تم آگئے ہو تو تمہیں بھی بھابھی سے ملوادوں گا۔''

''بھابھی......؟''

''ہاں ہاں...... تمہاری بھابھی......'' اس نے مجھے گھورا۔

''اوہ...... اب سمجھا......'' میں نے شرارت بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''تم صحیح بات کافی دیر میں سمجھتے ہو...... ارے اف......!'' کہتے کہتے اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیوں......؟ کیا ہوا......؟''

''یار ٹیوشن کا ٹائم ہوگیا ہے...... ظاہر میرا انتظار کررہا ہوگا...... اب میں رات تک بک ہوں...... سنو...... میں جارہا ہوں...... کل تمہارے گھر پر ہی آؤں گا۔ لوکے...... بائے۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا، میں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا۔

''چائے کے پیسے بھی میں ہی بھگتوں گا...... کیا خاک بدلا ہے سدو۔'' میں زیر لب بڑبڑایا۔ پھر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

دوسرے دن صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ماں جی نے مجھے بتایا۔ ''رحیم بھائی آئے ہیں...... تمہیں بلا رہے ہیں۔''

''رحیم بابا......؟'' میں چونکا۔

''کیا وہ باہر کھڑے ہیں؟''

''اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں......'' وہ بولیں

''کیا میں ایسے آدمی کو باہر کھڑا رکھوں گی جس کو ہمارا خیال ہو...... میں نے انہیں کمرے میں بیٹھا دیا ہے اور چائے بھی پیش کردی ہے۔''

''واہ ماں جی......'' میں خوش ہوکر بولا۔

''تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔ میں بس ابھی آیا۔''

ماں جی چلی گئیں، تھوڑی دیر بعد میں بھی اٹھا اور دوسرے کمرے میں آگیا، جہاں رحیم بابا میرا انتظار کررہے تھے۔

انہوں نے فوراً ہی اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور بولے۔

''بیٹا...... سچ پوچھو تو تم نے اس گھر کو ویران کردیا ہے، یوں لگتا ہے جیسے عرصہ دراز سے خالی پڑا ہے...... اب وہاں میرا دل ہی نہیں لگ رہا۔''

''اچھا......!'' میں مسکرادیا۔

پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''قاسم ماموں آگئے......؟''

''نہیں...... لیکن وہ آکر فوراً ہی تمہارے بارے میں پوچھیں گے......''

''انہیں ممانی کچھ نہ کچھ بتادیں گی......'' میں نے کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ماموں کو مجھ سے بدگمان کریں گی۔''

''آخر ہوا کیا ہے...... مجھے بتاؤ......'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

جواباً میں نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کردی۔ رحیم بابا کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جارہا تھا۔

اور پھر انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا، پھر کافی دیر بعد وہ بولے۔

''اف خدا...... اس گھر میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔''

''جی ہاں...... اور مجھے اسی لئے وہاں سے نکالا گیا ہے کہ کہیں میں ماموں کو یہ سب کچھ نہ بتادوں۔''

''لیکن تم اپنے ماموں سے مل تو سکتے ہو......'' وہ بولے۔

''کیا اس صورت میں انہیں معلوم نہیں ہوگا؟''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی ماموں آئیں گے۔'' ممانی انہیں ضرور ایسی پٹی پڑھائیں گی کہ انہیں مجھ سے نفرت ہوجائے گی...... اس کے بعد اگر میں ان سے ملنے کی کوشش بھی کروں گا تو وہ مجھ سے نہیں ملیں گے......!''

''ہوں......!'' رحیم بابا نے سر ہلایا۔

''تو پھر اس کا کیا حل ہے؟''

''یہ کام آپ کر سکتے ہیں......؟''

''کیسے......؟''

''بس جب ماموں آئیں، تو کسی طرح انہیں مجھ سے ملوادیں...... میں انہیں خود ساری تفصیل بتادوں گا۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ وہ عورت انہیں بھڑکا دے گی۔'' انہوں نے اعتراض کیا۔

''پھر تم ان سے کیسے ملوگے......؟''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں......'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''کیا وہ آپ کے کہنے پر کہیں آسکتے ہیں......؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا......'' وہ بولے۔

''وہ میری عزت تو بہت کرتے ہیں، لیکن میں ایک ملازم ہوں اور وہ مالک...... میرے کہنے پر وہ کیسے کہیں جاسکتے ہیں۔''

''یہ بات بھی ٹھیک ہے......'' میں نے کہا۔

''اچھا...... مجھے ایک بات بتائیں...... کیا آپ وقار نامی کسی شخص کو جانتے ہیں۔''

''وقار...... ہاں...... میں جانتا ہوں......'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ......'' میں بے چین ہوگیا۔

''بتائیں کون ہے وہ......؟''

''اس نام کے ایک آدمی سے میں واقف ہوں...... وہ قاسم صاحب کا قریبی دوست بھی ہے اور بزنس میں حصہ دار بھی ہے...... اس کا گھر بھی اسی علاقے میں ہے...... یوں سمجھ لو کہ وہ قاسم صاحب کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے...... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''اس لئے کہ رات کے وقت گھر میں جو شخص آتا ہے...... اس کا نام...... وقار ہی ہے۔'' رحیم بابا نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔

''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں بابا۔'' میں نے کہا۔

''یہ...... یہ تم کہہ رہے ہو بیٹا......!''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں......!'' میں نے کہا۔

''یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ قاسم ماموں نے سانپ کو آستین میں پال رکھا ہے۔''

''اب...... کیا کرنا چاہئے......؟''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں......'' میں نے جواب دیا۔

''خیر...... !آپ قاسم ماموں کو واپس آنے دیں...... پھر کوئی فیصلہ ہوگا۔''

''تمہاری باتیں سن کر میرا دل گوارا نہیں کر رہا کہ

میں وہاں جاؤں۔'' رحیم بابا بولے۔

''میں جانتا ہوں......!'' لیکن آپ کو وہاں جانا ہوگا...... تاکہ ہم دونوں مل کر کوئی حل نکالیں اور ماموں کی جان بچاسکیں...... ورنہ وہ لوگ انہیں مارڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور کسی نہ کسی دن وہ وار کر جائیں گے۔''

''تم کہتے ہو تو میں چلا جاتا ہوں...... لیکن میں دل پر پتھر رکھ کر وہاں دن گزاروں گا۔ یہ سب کچھ سن کر اب میں بھی وہاں نہیں رہنا چاہتا۔''

''اگر آپ وہاں نہیں رہنا چاہتے تو یہاں آجائیں......'' میں نے خلوص سے کہا۔

''لیکن صرف اتنا وقت وہاں گزار لیں کہ میں قاسم ماموں کے لئے کچھ کرسکوں...... میں خود پر پھر آپ کو یہاں لے آؤں گا...... آج میرے ساتھ ہی رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے میرے بچے......'' وہ بولے۔

پھر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی میری طرف بڑھادی۔

''یہ...... یہ کیا ہے رحیم بابا......؟''

''یہ میری جمع پونجی ہے بیٹا......'' وہ مسکرائے۔

''انہیں تم رکھ لو۔''

''لیکن یہ آپ مجھے کیوں دے رہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے......'' وہ بولے۔

''انہیں رکھ لو...... شاباش......''

''انہیں آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں......'' میں خفیف سا ہوگیا۔

''میں ہرگز نہیں لوں گا۔''

''ضد نہیں کرتے بیٹے......'' وہ پیار سے بولے۔

''میں نے بہت محنت سے انہیں جوڑا ہے۔ اور مجھے تو اب ان کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ گھر میں دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے بس وہی میرے لئے کافی ہے یہ تمہارے کام آجائیں گے تو میرے دل کو بہت خوشی ہوگی۔''

''اب تم منع کرکے میری خوشی پر پانی مت پھیرو......''

''اچھا...... میں ایک شرط پر لوں گا۔''

''بولو...... کیا شرط ہے......؟''

''میں جب واپس کرنے کے قابل ہوا، تو آپ کو لوٹادوں گا۔''

''چلو......! میں مان لیتا ہوں......'' وہ نہ جانے کیا سوچ کر مسکرائے۔

''لیکن یہ تمہاری شرط نہیں بلکہ ضد ہے۔''

میں نے بھی مسکراتے ہوئے ان سے رقم لی اور انہیں جیب میں رکھ لی۔ اسی وقت رحیم بابا بولے۔

''اب میں تمہارے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں کافی کچھ معلوم کرلیا ہے مجھے یہ بھی اندازہ ہوچکا ہے کہ تمہارا دشمن کون ہے...... اور وہ کیا چاہتا ہے۔''

''اوہ......'' میں چونک اٹھا۔

''تو پھر جلدی بتائیں۔ آپ نے تو مجھے بے چین کردیا۔''

''ضرور بتاؤں گا......'' وہ سر ہلا کر بولے۔

''ابھی میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں، جہاں تمہارے والد صاحب عملیات کرتے تھے۔''

''اچھا...... چلیں میرے ساتھ...... میں آپ کو وہ جگہ دکھادیتا ہوں۔''

میں رحیم بابا کو ابا جی والے حصے میں لے آیا۔ یہاں ہال نما کمرے کی صرف اس حد تک صفائی کی گئی تھی کہ ابا جی کے خون کے نشانات اب فرش پر باقی نہیں تھے، وگرنہ ہر چیز اپنی جگہ پر اسی طرح برقرار تھی۔ ہاں...... مٹی اور دھول نے جم کر ہر طرف اپنا تہہ بنا ڈالی تھی۔

کسی نے بھی یہاں آکر کسی چیز سے چھیڑ خوانی نہیں کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ دلاور نامی اس انسپکٹر نے اس وقت کسی کو بلا کر اس کمرے کی صفائی کرادی تھی۔

گویا قتل کا کوئی نشان یہاں موجود نہیں تھا، اس کے باوجود نہ جانے کیوں میرے وجود میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔

رحیم بابا نے عین اس وقت چونک کر مجھے دیکھا۔

"کیا ہوا......؟"

"جی......" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کچھ نہیں......!"

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے......؟"

"آپ کو...... کیسے معلوم ہوا ہے......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ مسکرائے اور بولے۔

"تم نے جھر جھری سی لی ہے...... اس لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"اوہ......!" میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

"ڈرو نہیں......" انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔

"کیونکہ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرو گے تو واقعی خوف زدہ ہو جاؤ گے، اسی لئے وقت نے ماضی پر پردہ ڈال دیا ہے دیکھ لو...... کس قدر مٹی اور دھول ہے چاروں طرف...... یوں سمجھ لو کہ قدرت کتنی مہربان اور کرم کرنے والی ہے...... اس نے خود ہی اس حادثے پر مٹی ڈال دی...... گویا قدرت اور وقت دونوں تمہارے ساتھ ہیں...... پھر تمہیں ڈرنے یا خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے......؟"

نہ جانے ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ میرا خوف خود بہ خود ہی زائل ہو گیا۔ میں نے سمجھ جانے والے انداز میں رحیم بابا کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں...... میں کسی قدر ڈر گیا تھا۔"

"مت ڈرو......" انہوں نے کہا۔

"کیونکہ انسان کا ڈر اگر حاوی ہو جائے تو اعصاب پر اثر انداز ہو جاتا ہے اور پھر حوصلے پست ہو جاتے ہیں...... ابھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے...... ابھی تو تمہاری زندگی کا آغاز ہوا ہے اور تمہارا سفر بہت طویل ہے...... ہاں تو...... تمہارے اباجی کا قتل اسی کمرے میں ہوا تھا؟"

"جی ہاں......!"

"اچھا......" ان کے منہ سے نکلا۔ وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے، کافی دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

"کیا وہ یہاں پر ہی اپنے عملیات وغیرہ کا کام کرتے تھے......؟"

"جی نہیں...... آگے والے کمرے میں۔"

"ہوں...... میں وہ کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا...... چلیں......" میں نے کہا۔

جلد ہی میں انہیں دوسرے کمرے میں لئے کھڑا تھا...... لیکن یہاں اس قدر تعفن تھا کہ میں نے بے ساختہ اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔

میری نظریں خود بہ خود پنجرے کی طرف اٹھ گئیں...... جس میں اباجی کے پالتو جانور ہوا کرتے تھے...... لیکن وہ بے چارے اب وہاں نہیں تھے...... شاید بھوک اور پیاس کی بنا پر انہوں نے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی تھی اور اب وہاں چند ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... یہ تعفن شاید اسی پنجرے سے اٹھ رہا تھا۔

"زبردست بدبو پھیلی ہوئی ہے یہاں۔" رحیم بابا نے بھی اپنے کندھے پر رکھا ہوا کپڑا منہ پر لپیٹ لیا تھا۔

"ایسی بدبو جیسے کسی مردہ جسم سے اٹھ رہی ہو۔ بے چارے پرندے مر گئے ہیں رحیم بابا۔" میں نے بتایا اور پھر پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں تھے وہ پرندے...... لیکن کسی نے اس وقت توجہ نہیں دی اور وہ بے چارے شاید بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر دم توڑ گئے۔"

"کون سے پرندے تھے اس میں......؟" انہوں نے پوچھا۔

"الو کے بچے تھے......" میں نے بتایا۔ "انہوں نے الو پال رکھے تھے۔"

"اوہ......" رحیم بابا کے چہرے پر معنی خیز قسم کے تاثرات پھیل گئے، پھر انہوں نے جلدی جلدی اس کمرے میں رکھے ہوئے سامان کی تلاشی لی تھی، کئی چیزوں کو وہ الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے تھے۔

یہ سب کچھ والد صاحب کی چیزیں تھیں...... جو وہ یہاں رکھا کرتے تھے۔ ان میں کئی بوتلیں اور ڈبے بھی تھے۔

رحیم بابا غور سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے، پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"چلو بھئی...... میں نے جو کچھ دیکھنا تھا، وہ دیکھ لیا...... بہت بدبو ہے یہاں نکل چلو......"

پھر ہم دونوں باہر نکل آئے تھے...... رحیم بابا پھر وہاں رکے نہیں تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس حصے سے باہر نکل آیا۔

میں اب تک بے چین تھا، چنانچہ باہر نکلتے ہی میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا رحیم بابا۔"

"آرام سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکرا کر بولے۔

"بہرحال وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میری بے تابی کا عالم عروج پر تھا۔ میں جلد سے جلد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ لیکن رحیم بابا کسی سوچ میں گم تھے۔ انہیں جیسے میرے جذبات کا کوئی احساس ہی نہیں تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت خود کو تنہا محسوس کر رہے ہوں۔

ایک بار پھر وہ میرے ساتھ اسی کمرے میں آ کر بیٹھ گئے اور میری نظریں سوالیہ انداز میں ان کے چہرے پر جم گئیں۔

اس وقت بھی وہ خاموش ہی رہے تو میں رہ نہ سکا۔

"رحیم بابا...... آپ خاموش کیوں ہیں......؟ کچھ تو بولیں۔"

"آں...... ہاں......" وہ جیسے خیالات سے چونکے۔

"میں اس وقت چائے کی طلب محسوس کر رہا ہوں...... تم جلدی سے چائے بنواؤ جب تک میں اپنے ذہن میں الفاظ کا ذخیرہ کرتا ہوں...... تاکہ تمہیں بھی کچھ سمجھا سکوں۔"

دل نہیں چاہ رہا تھا کہ رحیم بابا کی زبان کھلنے سے پہلے کوئی کام کروں...... میں سب کچھ جاننے کے لئے بے چین تھا، لیکن مجبوری تھی...... رحیم بابا کے حکم کو ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔

کمرے سے نکل کر میں نے ماں جی کو تلاش کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ گھر میں موجود ہی نہیں ہیں۔

جیسے تیسے میں نے رحیم بابا کے لئے خود چائے تیار کی اور کپ اٹھا کر کمرے میں آ گیا وہ اب بھی گویا پتھر کا بت بنے کسی سوچ میں گم تھے۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے چونک کر پہلو بدلا اور بولے

"معاف کرنا...... میں نے تمہیں تکلیف دی لیکن چائے میری کمزوری ہے...... دن میں نہ جانے کتنی بار میں نصیر سے فرمائش کرتا ہوں۔"

"معاف تو آپ کو کرنا پڑے گا رحیم بابا......" میں زبردستی ہنسا۔

"ماں جی نہ جانے کہاں گئی ہوئی ہیں اور یہ چائے میں نے خود بنائی ہے۔ نہ جانے کیسی بنی ہو گی۔"

"اچھی ہے......" وہ جلدی سے ایک گھونٹ بھر کر بولے۔

"بلکہ بہت مزے کی ہے۔"

"حیرت ہے۔" میں بڑبڑایا۔

"اب تم یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سنو۔" انہوں نے تقریر کرنے والے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

"دیکھو میرے بچے...... دنیا جب سے وجود میں آئی ہے...... تو تب سے ہی ایک جنگ ہوتی چلی آ رہی ہے...... یہ جنگ اچھے اور برے کے درمیان ہو رہی ہے، یعنی خیر اور شر...... خیر کا مطلب یہ ہے کہ اچھائی اور نیکی، جبکہ شر میں برائی اور بدی شامل ہوتی ہے سمجھ گئے؟"

"جی ہاں...... کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"شاباش...... اس دنیا میں رب العزت کے احکامات اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح استعمال ہمیں خیر کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے احکامات کو نظر انداز کرتے ہیں، اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا کر غلط راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ راستہ ہمیں شر یعنی شیطان کی طرف لے جاتا ہے۔ اور شیطان ہمارا ہمیشہ سے ازلی دشمن رہا ہے اس کا کام ہی صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کو بہکائے اور جہنم کا حق دار بنا دے۔"

"جی ہاں...... بالکل......" میں نے سر ہلایا۔

"بس تو پھر میری بات غور سے سنو......" وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"شیطان کسی کو بھی بہکا کر غلط راستے پر ڈال سکتا ہے، اگر عین وقت پر رب العزت سے مدد حاصل کر لی جائے تو بچت ہو جاتی ہے ورنہ جو شخص شیطان کے بہکاوے میں آ جائے پھر وہ گناہوں کے دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے، برا مت ماننا...... لیکن میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ تمہارے اباجی کو بھی شیطان نے اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا...... اور انہوں نے عملیات میں غلط راستہ اختیار کر لیا تھا...... وہ کالا جادو اور سفلی کے ماہر تھے۔"

میں حیرت سے ان کی شکل دیکھ رہا تھا، اگرچہ مجھے ان چیزوں کی زیادہ معلومات نہیں تھی، لیکن میں کتابوں میں جادو ٹونا اور سفلی وغیرہ کے بارے میں کافی کچھ پڑھ چکا تھا۔

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں رحیم بابا......؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میرے بچے۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"مجھے اس بات کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا لیکن میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا...... اسی لئے تمہارے اباجی کا سامان دیکھ کر میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے دادا پردادا بھی کرتے ہوں گے۔" میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

"ظاہر ہے کہ اباجی نے ان ہی لوگوں سے سب کچھ سیکھا ہوگا۔"

"اس بارے میں کچھ کہنا ابھی مناسب نہیں ہے۔" رحیم بابا نے کہا۔

"جو لوگ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں...... ان کے بارے میں رائے زنی کرنے سے کیا فائدہ۔ وہ جب دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کے اعمال بھی ان ہی کے ساتھ چلے گئے۔"

"ہاں...... یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" دفعتاً ماں جی کی آواز کمرے میں گونجی۔ میرے ساتھ ساتھ رحیم بابا بھی چونک اٹھے، ماں جی دروازے میں کھڑی ہوئی شاید ہماری باتیں سن رہی تھیں ان کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔

رحیم بابا انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ وہ دوبارہ بولیں۔

"یہ بات واقعی درست ہے کہ ان کے عمل ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ وہ دنیا سے چلے گئے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" رحیم بابا نے کہا۔

یہ سن کر ماں جی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ آہستہ سے بولیں۔

"وہ لوگ خود نہیں گئے، بلکہ انہیں دنیا سے بھیجا گیا ہے...... ایک ایک کو چن چن کر قتل کیا گیا ہے...... ورنہ ایسے لوگ خود سے کہاں جاتے ہیں۔"

"کیا آپ جانتی ہیں کہ انہیں کس نے قتل کیا تھا......؟" رحیم بابا مسلسل ان کی طرف متوجہ تھے۔

"ہاں......" ماں جی کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔"

"کون ہے وہ......؟"

"جان لیوا......!" وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اس کا نام جان لیوا ہے۔"

(جاری ہے)



موت سے چھٹکارا

شہزاد خان۔ صادق آباد

بزرگ نے نوجوان سے کہا. "طاغوتی طاقتوں کو پچھاڑنے کے لئے میں تمہیں ان سے بچائوں کیونکہ تم بری طرح طاغوتی طاقتوں کے شکنجے میں پھنس گئے ہو اور اگر احتیاط نہ کیا گیا تو......

ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی حیرت انگیز کہانی

اس سے پہلے کہ تیز دھار والی کلہاڑی اس کے چوڑے کندھے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکلتی وہ اپنے سامنے موجود چار فٹ اونچی پکی اینٹوں کی دیوار پر اپنے ہاتھ جماتے ہوئے جمپ لے کر دوسری جانب کود چکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تاحد نگاہ تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ شاید کھیتوں کو تازہ پانی لگایا گیا تھا، اس لیے کودتے وقت اس کے دونوں پاؤں مٹی اور کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ نیچے گرتے ہی اس نے ناک کی سیدھ میں سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ پانی اور کیچڑ کی وجہ سے گو اسے بھاگتے ہوئے دقت ہو رہی تھی لیکن جب جان پر بنی ہو تو ایسی تکلیف کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ آسمان پر چمکنے والا چاند معہ اپنے ستاروں کے مفقود تھا، چند فاصلے تک ہی بغور دیکھنے پر نظر آتا تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا کبھی کبھی کسی جھینگر یا کہیں دور سے کسی بھوکے گیدڑ کے

رونے کی آواز ماحول کو اور خوفناک بنا دیتی تھی۔ اپنے پیچھے سے سنائی دینے والی غیر مانوس آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہزاروں خبیث روحیں مل کر چیختی چلاتی اس کے تعاقب میں بھاگی چلی آ رہی ہوں۔ یہ محسوس کرکے وہ سرپٹ بھاگے چلا جا رہا تھا۔

نسیم نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرکے کالج میں داخلہ لے لیا گو کہ اُس کے والدین غریب تھے مگر اس کے والد نے اُسے کبھی بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا تھا کہ اُس کے اسکول کے خرچ میں اُسے کسی قسم کی پریشانی لاحق ہے۔ جیسے تیسے کرکے اُس نے میٹرک تک اُسے کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ نسیم نے بھی اپنے والد کو کبھی مایوس نہ کیا اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اُسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اُس کے والدین نے اُسے شدید مشکل حالات کے باوجود پڑھایا ہے۔ اس لیے وہ کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ جس سے اُس کے پاس بے شمار دولت آ جائے جس سے وہ اپنے والدین کو عیش و آرام کی زندگی دے سکے۔ لیکن ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا عملی طور پر اُس کو بظاہر کوئی ایسی صورت نظر نہ آ رہی تھی جسے اپنا کر وہ اپنے ارادے کی تکمیل کر سکے۔ ان ہی سوچوں کے ساتھ اس نے کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن اب اُس کی یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کیونکہ کالج کی آزادانہ زندگی میں جب اُس نے آنکھ کھولی تو اُسے اپنے ہر طرف ایسے نوجوان نظر آئے جو اپنے ماں باپ کی دولت کو پانی کی طرح بہا رہے تھے۔

صبح کے وقت کالج گاڑیوں کا شوروم لگتا۔ وہ اپنی پرانی سائیکل پر روزانہ کالج آتا تو اُس کے دوست اور کالج کی دیگر لڑکیاں اُس کی جانب دیکھ کر قہقہے لگاتے اور وہ خود کو چور محسوس کرتا۔ لیکن وہ وائے صبر کے اور اپنی غربت پر کڑھنے کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔

ایک دن چھٹی کے وقت وہ واپس گھر جا رہا تھا کہ اُس نے بازار میں ایک مجمع لگا دیکھا لوگ ایک دائرہ بنائے اندر کی جانب کچھ دیکھ رہے تھے اُس نے بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر سائیکل ایک جانب کھڑی کی اور لوگوں کی بھیڑ میں داخل ہو گیا اندر کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھے سے آدمی نے زمین پر ایک بچے کو لٹایا ہوا ہے اور اُس پر ایک سفید چادر ڈالی ہوئی تھی جس پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں تھے اور وہ اپنے بائیں ہاتھ میں دو عدد گردے تھامے ہوا تھا جن سے گاڑھا گاڑھا خون ٹپک رہا تھا، اُس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھری تھی جو خون سے تربتر تھی۔ وہ اپنا چھری والا ہاتھ فضا میں لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا۔

'میرے بھائیو! میں نے اپنے بیٹے کو جادو کے زور سے بیہوش کر کے اُس کے جسم کے اعضاء آپ کے سامنے نکال لیے ہیں۔ اسی طرح میں ایک ایک کر کے اس کی دونوں آنکھیں، پھر دونوں کان پھر کلیجی پھیپھڑے سب نکال نکال کر دکھاؤں گا گو کہ یہ جادو ہے مگر یہ میرا کمال ہے کہ میں کس صفائی سے یہ کام دکھا رہا ہوں اگر کسی صاحب نے یہ کام یا اس جیسا کوئی اور کام جو جادو سے متعلق ہو سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتا ہے۔" یہ سن کر کمزور دل حضرات تو وہاں سے کھسک لیے جو زیادہ مضبوط دل کے تھے وہ کھڑے رہے کہ اب سارا تماشا دیکھ کر ہی جائیں گے۔

باقی رہ جانے والے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بوڑھا مداری چھری لہراتا ہوا زمین پر لیٹے ہوئے بچے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ وہاں پر موجود بڑی عمر کے لوگوں نے زور زور سے اُسے ایسا کرنے سے باز رہنے کے لیے کہا یہ دیکھ کر بوڑھا رک گیا اور کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے حضرات لیکن میں بھی پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے ہی ایسا کرتا ہوں اگر آپ نہیں چاہتے کہ آپ ایسا منظر دوبارہ دیکھیں تو برائے کرم میری کچھ امداد کر دیجئے میں چلا جاتا ہوں۔"

یہ سن کر لوگوں نے اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کر اس کی طرف کچھ پیسے پھینک دیئے۔ جنہیں بوڑھے نے جلدی سے اکٹھے کر کے اپنی پوٹلی میں باندھ لیا۔ اب لوگ منتشر ہونے لگے تو نسیم بھی اپنی سائیکل کی طرف بڑھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا اور تمام لوگوں کے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے ہمت کرتے ہوئے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"بابا جی! میرا نام نسیم ہے اور میں کالج میں پڑھتا ہوں، مجھے جادو وغیرہ سکھاؤ گے"۔

بابا جی جو اپنے بیٹے کو زمین سے دوبارہ اٹھا کر اُسے سامان وغیرہ پکڑا رہا تھا اُس کی بات سن کر اُس کی طرف پلٹا۔ اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "بیٹا تم جادو سیکھ کر کیا کرو گے تمہارے ابھی پڑھنے کے دن ہیں۔ اور اس کام میں سوائے ذلالت اور بربادی کے کچھ نہیں رکھا ہے جاؤ گھر جاؤ تمہارے گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے"۔ یہ کہہ کر بابا نے اپنا پرانا تھیلا اپنے بیٹے کے کندھے پہ دھرا اور اُسے یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

لیکن نسیم دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ آج بابا سے جادو سیکھنے کی بات پکی کر کے ہی گھر لوٹے گا۔

بابا اور بچہ شہر سے باہر جانے والی کچی سڑک پر ہو لیے۔ نسیم سائیکل کو ہاتھ سے کھینچتے ہوئے اُن کے تعاقب میں لگا رہا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس لیے اب اُس کا چھپ کر پیچھا کرنا کارگر نہیں تھا اس لیے اسے بابا نے دیکھتے ہی ذرا غصے سے کہا۔ "تم کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو بچہ جا چلا جا اپنے گھر ہم غریبوں کو تنگ نہ کر"۔

"مگر بابا جی! آپ نے خود اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی جادو سیکھنا چاہتا ہے تو آپ رقم کے عوض اُسے جادو سکھائیں گے۔ نسیم نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں کہا تھا مگر میں بچوں کو جادو نہیں سکھاتا۔ میری نظر میں تم ابھی بچے ہی ہو"۔ بابا بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ مگر نسیم منتوں پر اتر آیا۔

آخر کار بابا کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور اُس کے تمام حالات سننے کے بعد بابا نے اُسے کہا کہ "وہ پرسوں شام ٹھیک چار بجے اُس کے ڈیرے پہ آ جائے۔ مگر ایک بات کا خیال رکھے کہ اپنے گھر والوں کو نہ بتائے ورنہ وہ جادو نہیں سیکھ پائے گا۔" نسیم نے اُس سے وعدہ کیا اور خوشی خوشی اپنے گھر کی راہ لی۔

پرسوں ٹھیک شام چار بجے اُس نے گھر سے کچھ نقدی وغیرہ لی اور سائیکل پر سوار شہر سے باہر جانے والے راستے پر بگٹٹ بڑھتا چلا گیا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی اُسے دور سے ہی بابا کی جھونپڑی نظر آ گئی۔ جلد ہی وہ جھونپڑی کے نزدیک پہنچ گیا بابا بھی شاید اُس کا انتظار کر رہا تھا اُس کے وہاں پہنچتے ہی بابا نے اُس سے فیس کی مد میں کچھ رقم لی اور اُسے ساتھ لے کر جھونپڑی میں داخل ہو گیا، بابا کا بیٹا شاید کہیں گیا ہوا تھا اس لیے جھونپڑی خالی تھی۔ اُسے ایک طرف بیٹھنے کا کہہ کر بابا نے ایک پرانے سے صندوق سے ایک بوسیدہ کتاب نکالی جس کے اوراق حالات کی گردش سے سیاہ پڑ چکے تھے۔ اُس کی جلد پر دو کوبرا ناگ پھن پھیلائے موجود تھے جن کے سامنے ایک فاختہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اُس کے منہ سے خون کی ایک پتلی سی دھار نکل کر نیچے گر رہی تھی۔

کتاب کا عجیب سا ٹائٹل تھا جو سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ بہرحال اس نے بھی زیادہ غور کرنا مناسب نہ سمجھا اور تجسس سے چہرے پر ہاتھ جمائے بابا کی طرف دیکھتا رہا جو اس کے صفحے الٹ پلٹ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کافی دیر تک ورق گردانی کرنے کے بعد بابا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اُف خدایا! یہ کیا اُس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں اور سفیدی عجیب سا منظر پیش کر رہی تھی۔

نسیم نے ڈر کر بھاگنے کی کوشش کی تو بابا نے ایک گرج دار آواز سے اُسے دوبارہ بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ ڈر کر دوبارہ بیٹھ گیا مگر اُس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر تک بابا اُس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اچانک اس نے آنکھیں جھپکیں تو دوبارہ اس کی آنکھوں میں سیاہ پتلیاں نمودار ہو گئیں، بابا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہنے لگا "مبارک ہو میں نے اپنے گرو سے اجازت لے لی ہے اور وہ تمہیں اپنا چیلا بنانے پر راضی ہو گیا ہے۔

اب تم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تم نے جادو سیکھنا ہے اور اپنے ارادے اور اعصاب کو مضبوط بنانا ہے۔ کیونکہ جادو سیکھنے کے دوران تمہیں بہت سے عجیب و غریب مناظر اور واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کمزور دل حضرات یا تو اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں یا مکمل طور پر پاگل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمہیں پہلے سے بتایا جاتا ہے کہ تم ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا

پڑے۔" بابا نے اُسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

نسیم غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ اُس نے بابا سے پکا وعدہ کیا کہ وہ جیسا کہے گا وہ ایسا ہی کرے گا۔ بابا نے اُسے شاباش دی اور کتاب میں سے ایک جاپ لکھ کر دیا۔ اور کہا کہ "جب گھر والے سو جائیں تو چھت پر جا کر اس جاپ کو مسلسل چار سو دفعہ پڑھنا ہے اس دوران اگر ڈر لگے تو یا گرو! یا گرو! پکارنا ہے۔" بابا نے اسے ایک چٹ تھماتے ہوئے کہا۔

نسیم نے بابا سے چٹ لے لی اور گھر جانے کی اجازت چاہی تو بابا نے اُسے اس شرط پر اجازت دی کہ کل وہ واپس یہاں آ کر اُسے رات کی رپورٹ دے گا تاکہ اُسے مزید سبق دیا جائے۔ نسیم نے وعدہ کیا اور گھر کی راہ لی۔

☆......☆......☆

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے وسط میں آگ جل رہی تھی اور اُس پر ایک ننگ دھڑنگ صرف لنگوٹ باندھے ایک شخص گردن جھکائے بیٹھا تھا اُس کے سر کے بال سفید اور گردن و جسم پر جھریاں نمایاں تھیں۔ وہ یوں سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے صرف اسی مقصد کے لیے ہی پیدا ہوا ہو۔ کمرہ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری تھا اور اس کے ایک کونے میں ایک بھیڑیے کا بچہ بندھا ہوا تھا اُس کے منہ سے یوں آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ اپنے سامنے کسی عفریت کو دیکھ رہا ہو۔ بوڑھا کچھ دیر کے بعد ایک جھرجھری لیتا ہوا اٹھا اور آگ میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے ایک تیز دھار والی چھری نکال لی اس کا ہاتھ جوں کا توں تھا، اُس پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ چھری ہاتھ میں پکڑے وہ بھیڑیے کے بچے کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں اُس کی گردن دھڑ سے الگ کر دی۔ خون فوارے کی طرح نکلا اور تمام فرش پر پھیل گیا۔ بوڑھے نے چھری ایک طرف پھینکی اور زمین پر لیٹ کر خود کو بھیڑیے کے خون سے غسل دینے لگا۔ جہاں جہاں خون لگتا جا رہا تھا جسم کے اس حصے سے جھریاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

بوڑھے نے کالے علم کا ایک وار "اگیا بیتال" استعمال کرتے ہوئے دوبارہ جوانی حاصل کر لی تھی۔ صرف اس مقصد کے لیے اسے پانچ سال انتظار کرنا پڑا تھا پھر جا کر اسے یہ جاپ حاصل ہوا تھا۔ لیکن ابھی بھی کچھ کمی تھی یہ جوانی صرف دو تین سال تک ہی برقرار رہنی تھی اس کے بعد اسے مزید پانچ سال انتظار کرنے کے بعد یہی عمل دہراتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کالے علم کا جاپ کر کے یہ جان چکا تھا کہ اگر وہ کسی ایسے آدمی کو اپنا چیلا بنا لے جو خوش اسلوبی سے اُس کے لیے کالے علم کے کچھ جاپ کر کے بیروں کو قابو کر لے اور اُن سے سدا جوان رہنے کے گُن حاصل کر لے تو وہ انہیں اپنا کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گا۔ اور پھر اسی مقصد کے لیے اس نے اپنے خاص چیلے لجپال کو بوڑھے مداری کے بھیس میں مجمع لگانے کے لیے شہر بھیجا تھا وہ جانتا تھا کہ نسیم کس وقت اور کس راستے سے گھر لوٹتا تھا اور آخرکار اس کے چیلے نے اس طریقے سے نسیم کو اپنے جال میں پھانسا تھا کہ اُسے ذرہ برابر بھی شک نہ ہو پایا۔

اس سارے کام میں یہ شرط لازمی تھی کہ اُس کا شکار خود اپنی مرضی سے یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو۔ آج اس کے نئے چیلے نے جیسے ہی پہلا سبق لیا تو اس نے بھی اپنی کارروائی شروع کر دی، اسی سلسلے میں وہ اس وقت اس عمل سے گزر رہا تھا خون سے تر ہونے کے بعد اس نے آگ پر رکھے فریم پر دھرے چاروں چراغوں کی لوؤں کو نوچ کر دور پھینکا اور غٹاغٹ کر کے ان میں بھرا انسانی خون پی گیا، خون جسم کے اندر پہنچتے ہی اُس کے بال سفید سے کالے سیاہ ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر میں اُس کے تمام بال سیاہ ہو گئے۔ اُس نے اپنا پہلا عمل کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب نسیم آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا اور الماری سے جاپ والا کاغذ نکال کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھتا چلا گیا گھر کے تمام افراد خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چھت پر اندھیرا چھایا ہوا تھا چاند کی ہلکی روشنی اندھیرے کو دور

بھگانے میں ناکام تھی غالباً چاند کی آخری تاریخیں تھیں اُس نے ہاتھ میں پکڑا جاپ بغور دیکھا ہلکے ہلکے الفاظ اس کو دکھائی دے رہے تھے اُس نے بابا کی ہدایت کے مطابق اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر اُس میں چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ جاپ کا ورد کرنے لگا۔ بابا کے مطابق اُس نے چار سو مرتبہ اس کا ورد کرنا تھا۔

ابھی اس نے بمشکل پچاس بار ورد کیا ہوگا کہ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہو پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب اس میں ذرا تیزی آئی تو اس نے جاپ روک کر دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لیے۔ ایسا کرتے ہی ارتعاش بند ہو گیا لیکن جاپ رک چکا تھا، یہ دیکھ کر اس نے دوبارہ جاپ شروع کیا تو اس بار اسے یوں محسوس ہوا جیسے دور سے ایک عورت ایک مرد اور ایک بچہ اس کی جانب بڑھ رہے ہوں اور وہ اکیلا جنگل میں بیٹھا ہوا ہے اس کے چاروں طرف عجیب و غریب شکلوں کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئے اور بچہ رونے لگا مرد نے عورت سے اس کی وجہ پوچھی تو عورت کہنے لگی اسے بھوک لگی ہے۔ اس لیے رو رہا ہے۔ مرد نے یہ سن کر کہا میں ابھی اس کے کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک جانب چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس نے دیکھا کہ اس مرد کے ہاتھ میں ایک جنگلی بھیڑیا لٹکا ہوا تھا اس کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی اس نے وہ بھیڑیا اس عورت کے سامنے پھینک کر کہا لو اسے کھا لو اس سے تمہاری اور بچے کی بھوک ختم ہو جائیگی۔

نسیم مسلسل جاپ کا ورد کرتے ہوئے ان کی جانب دیکھ رہا تھا اور ان کی گفتگو صاف سن رہا تھا بچے اور عورت نے لپک کر بھیڑیے کو ہاتھوں میں دبوچا اور کچھ ہی دیر میں وہاں ہڈیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

"مجھے اور بھوک لگی ہے میرا ابھی پیٹ نہیں بھرا۔" عورت نے ہونٹوں پر لگا خون اپنی لمبی زبان سے چاٹتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر مرد نے نسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں یہ کوئی بدنصیب بیٹھا ہوا ہے میں ابھی جا کر اسے پکڑتا ہوں اور تم اسے کھا کر اپنی بھوک مٹا لینا۔" یہ کہہ کر وہ جیسے ہی اس کی جانب بڑھا۔ یہ دیکھ کر نسیم جاپ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے اٹھ کر بھاگا تو ایک زوردار ٹکر سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ لہرا کر پیچھے گر پڑا۔ اس کے حصار سے نکلتے ہی وہ منظر غائب ہو گیا وہ چھت کی دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

نہ جانے وہ کب تک اسی حالت میں پڑا رہتا اگر بابا بروقت وہاں پہنچ کر اسے دوبارہ ہوش نہ دلاتے۔ بابا کے پوچھنے پر اس نے اسے تمام حقیقت بتا دی۔ بابا نے تمام واقعات سن کر اسے تاکید کی۔ "میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اس قسم کے واقعات سے سامنا کرنا پڑے گا اس لیے دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ کیسے بھی حالات ہوں تم حصار سے باہر نہ نکلنا ورنہ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر بابا نے اسے آرام کرنے کا کہا اور دوبارہ کل شام ڈیرے پر پہنچ جانے کا کہہ کر چلا گیا۔ نسیم یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ لیکن وہ اس کی کسی کراماتی طاقت کا کرشمہ سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

کھیتر پال کالے علم کا ایک ایسا وار ہے جسے خود کالے علم کے ماہر بھی بہت کم اور سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اس کے جاپ کے ذریعے "بھنڈاری کا یا پلٹ" کے بیروں کو قابو کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کا کرنے والا ہلکی سی بھی لغزش کا شکار ہو جائے تو اسی وقت اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب تک اس کے دفاع میں کوئی اور عمل نہ کیا جائے اس کا شکار ہونے والا ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس کے کرنے کا وقت اور حالات دونوں متعین ہیں۔

گرو ہرمن نے آخرکار اس جاپ کو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کے خاص چیلے نے رات کی رپورٹ اس کو تفصیل سے بتا دی تھی جسے سن کر ہرمن دل ہی دل میں خوش ہو گیا تھا کہ اس کا انتخاب ضرور اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا کیونکہ جاپ کے شروع میں ہی "لوتا

چماری" اور" کالا کوا" کا نظر آجانا اس بات کی نشاندہی تھی کہ ان چالوں کے بیر اس نئے چیلے سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اس جاپ کے کرنے سے گرو ہر من کو ایسی شکتی حاصل ہو جاتی جس سے وہ اپنے مزید جاپ آسانی سے مکمل کروا سکتا تھا۔

"کمیتر پال" کے لئے تین روز تک مسلسل ایک اندھیری گھپا میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وقفے وقفے سے نوزائیدہ بچوں کے سروں کا بھیجا کچا کھانا تھا۔ اس عمل کے لیے اس نے سات گھروں کا انتخاب پہلے سے ہی کر لیا تھا جن گھروں میں کچھ ہی دنوں میں بچوں کی ولادت متوقع تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے لجپال کو تفصیل سے سمجھا دیا تھا لجپال نے اسے اپنی کامیابی کا یقین دلایا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں گرو ہر من اس جاپ کو کرنے والا تھا۔ وہ بڑی بیتابی سے بچوں کی پیدائش کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً جا کر ان بچوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں سے نکال لے اور ان کے سر ان کے دھڑوں سے علیحدہ کر کے ان کا بھیجا کچا چبا جائے لیکن اس کے لیے اسے انتظار کرنا ضروری تھا ورنہ وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے کڑی شرط تھی۔

☆......☆......☆

دوسرے روز نسیم کالج سے ذرا دیر سے نکلا اور سیدھا بابا کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ بابا جھونپڑی میں کچھ گڑیاں سامنے رکھا ان میں سوئیاں چبھو رہا تھا پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ گڑیاں اس نے رات قبرستان میں سب سے پرانی قبر میں دفن کرنا ہیں اس سے اس کو ایسی طاقت حاصل ہو گی جس سے وہ ایک بیر کو قابو کرنے میں مدد دے گی۔ یہ کہہ کر بابا نے تین گڑیاں اس کو دیں اور ساتھ ہی کہا کہ قبر پر بیٹھ کر پچیس بار "ہر بھنگ آکھیا" دہرانا ہے اور خبردار ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے اور میں بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ نسیم نے گڑیاں قمیض کی سائیڈ والی جیب میں ڈالیں اور گھر کی راہ لی۔

یہ رات کے تقریباً بارہ بجے کا وقت ہو گا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور تاروں کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی بہت کھلی کھلی رات تھی نسیم قبرستان جانے والے راستے پر جا رہا تھا گھر کے افراد سو چکے تھے اور وہ بیرونی دروازے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ ایک ایسا کام کرنے جا رہا ہے کہ جس کے بعد اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی وہ جادو کے زور سے اپنے لیے اور والدین کے لیے بہت ساری دولت اکٹھی کر کے اور لوگوں کی طرح عیش و عشرت کی زندگی گزارے گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ قبرستان کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ آس پاس جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا جس میں سے جھینگروں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کوئی پرانی سی قبر تلاش کرنا چاہی جس پر بیٹھ کر وہ جاپ مکمل کر سکے اور گڑیاؤں کو اس میں دبا سکے۔ ابھی وہ اسی تلاش میں ہی تھا کہ اس کو سامنے کوئی عورت بین کرتی دکھائی دی۔

رات کے سناٹے میں اس عورت کے رونے کی آواز عجیب دہشت طاری کر رہی تھی۔ عورت کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹ رہی تھی۔ عورت کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے وہ پہچان نہ سکا کہ وہ کون بدنصیب ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے اسے مخاطب کیا۔ سنیئے محترمہ آپ کون ہیں اور مرنے والا آپ کا کیا لگتا تھا......"

"وہ میرا شوہر تھا اور میں اس لیے رو رہی ہوں کہ اگر وہ بھی اس وقت یہاں موجود ہوتا تو ہم اکٹھے ہی تمہاری ہڈیوں کو چباتے اور تمہارا خون پیتے"...... یہ کہہ کر اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی گردن پیچھے کی جانب موڑ لی اس کا بقیہ دھڑ سامنے ہی رہا تھا۔

نسیم نے جیسے ہی اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کے ہوش اڑ گئے سامنے کا منظر اس کے خوابوں کی بھیانک تعبیر سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ اس عورت کے چہرے پر تین آنکھیں تھیں جن کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں اور آنکھوں سے چھوٹے چھوٹے سانپ پھن پھیلائے باہر کو

جانب لپک رہے تھے اور اس کے پیلے پیلے لمبے دانت دونوں باچھوں سے جھول رہے تھے۔ اس کی تھوڑی پر ایک گڑھا سا تھا جس میں ایک پیلے رنگ کا بچھو بیٹھا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

تسیم کو یوں لگا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں اس نے تیزی سے بھاگنا چاہا لیکن ناکام رہا اس سے پہلے کہ وہ بلا اس کی گردن دبوچتی ایک ہلکا سا جھپا کا ہوا اور بابا ہاتھ میں ایک عجیب وغریب شکل کا ڈنڈا لیے نمودار ہوا اور آتے ہی اس نے وہ ڈنڈا اس بلا کے سر پر دے مارا۔ بلا ڈنڈا کھاتے ہی پلک جھپکتے غائب ہوگئی۔ تسیم کو تو جیسے کاٹو لہو نہیں۔

بابا نے ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونکا تو اسے ہوش آیا۔ بابا نے اسے حوصلہ دیا اور اسے اپنا کام ختم کرنے کا کہہ کر غائب ہوگیا۔ بابا کے بروقت پہنچنے پر اس کی جان بچ گئی تھی اور اسے کافی تقویت ملی تھی کہ بابا اسے کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ اب وہ بے فکر ہو کر قبرستان میں گھومنے لگا جلد ہی اسے ایک کافی بوسیدہ اور پھٹی پرانی قبر نظر آ گئی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر گڑیاں نکالیں اور ایک ہاتھ سے ذرا سا گڑھا کھود کر انہیں اس میں دفنا کر مٹی ڈال دی۔ پھر اس پر بیٹھ کر بابا کا بتایا ہوا جاپ پڑھنے لگا اس سارے عمل میں اسے پندرہ منٹ لگے۔ کام ختم کرکے وہ سیدھا گھر پہنچا گھر کے افراد جوں کے توں سوئے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور سیدھا بستر کی جانب بڑھ گیا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

ایک انتہائی تاریک غار میں ہرمن ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اس کے داہنے ہاتھ میں طشت تھا جس میں سات عدد نوزائیدہ بچوں کے سر رکھے تھے۔ سروں سے نکلنے والے خون سے طشت لبالب بھرا ہوا تھا۔ گرو کے منہ سے عجیب وغریب الفاظ نکل رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ایک ایک سر کو اپنے دانتوں سے بھنبھوڑتا اور اس میں سے نکلنے والے بھیجے کو یوں کھاتا جیسے وہ اس کی مرغوب غذا ہو۔ اس نے بچوں کی پیدائش کے فوراً بعد اپنا جاپ ''کھے تر پال'' شروع کر دیا تھا۔ آج اسے دوسرا روز تھا اور کل اسے ایک ایسی شکتی حاصل ہونے والی تھی جسے پا کر وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔ غار میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا غور سے دیکھنے پر ہی غار کے اندر کا منظر نظر آتا تھا۔ غار میں اس قدر خاموشی تھی کہ سوائے گرو کے نامانوس الفاظ کی بھنبھناہٹ کے اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور اس میں مزید غاروں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ابھی اسے کھڑے رہتے ہوئے طشت میں بھرے خون سے غسل بھی کرنا تھا جس کے بعد اس کا جاپ پورا ہو جاتا۔

غار کی خاموشی میں ایک جھماکا ہوا اور زمین سے ایک پتلا برآمد ہوا جس کے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں پتلے کے ہونٹ ہلے اور ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ ''گرو ہرمن! مہا گرو نے پوچھا ہے کہ تمہارا نیا چیلا کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہے کیونکہ ''لونا چماری'' اور ''کالا کوا'' مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں اور بھیس بدل بدل کر اسے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے مہا گرو سے پوچھا ہوا جاپ ادھورا چھوڑا تو تم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤ گے۔'' پتلے نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

گرو ہرمن جو پتلے کو زمین سے نکلتے دیکھ کر چونک گیا تھا اس کی بات سن کر سہم گیا اور کہنے لگا۔ ''مہا گرو کو کہہ دو کہ نئے چیلے نے کام شروع کر دیا ہے اور کچھ دنوں میں انہیں خوشخبری سنائی جائیگی''۔ یہ سنتے ہی پتا غائب ہوگیا۔ یہ دیکھ کر گرو ہرمن نے دوبارہ جاپ شروع کر دیا اور بے چینی سے کل کا انتظار کرنے لگا۔

لجپال نے ہاتھ میں پکڑی بوسیدہ کتاب کا ورق الٹا اور اس میں سے ایک جاپ کے الفاظ یاد کر کے سامنے بیٹھے تسیم پر پڑھ کر پھونک دیے۔ تسیم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں اڑتا جا رہا ہو اور تیز ہوا اس کے کپڑوں کو اس کے جسم سے علیحدہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ ایسا صرف چند سیکنڈوں کے لیے ہی محسوس ہوا۔ لجپال نے ایک صندوق میں سے لمبا چھرا نکال کر اس کی طرف

بڑھایا اور کہنے لگا ''آج رات تم نے اس کی مدد سے ایک بچے کو ذبح کر کے اس کا سر لے کر گرو ہرمن جو کہ اب تمہارے گرو ہیں کے پاس جانا ہوگا۔ انہیں اندھیری غار میں ایک شکتی حاصل ہوگی جس سے تم بھی فائدہ اٹھاؤ گے یہ گرو کا حکم ہے اور خبردار اگر تم نے انکار کیا تو اسی چھرے سے تمہارا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔''

تسیم کو تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ تو جادو سیکھنے کے شوق میں بابا کے پاس آیا تھا۔ اس نے تو اسے قتل و غارت گری پر لگا دیا تھا۔ اس نے انکار کرنا چاہا مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے الفاظ اس کے منہ میں گھٹ کر رہ گئے ہوں۔ اس نے چھرا بابا کے ہاتھ سے لیا اور اسے لباس میں چھپا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ واپسی پر بابا نے اسے غار کا پتہ تفصیل سے سمجھا دیا تھا۔

رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا جب تسیم ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا تھیلے کا رنگ سیاہ تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ تسیم نے موقع دیکھ کر ایک سات سالہ بچے کو ورغلا کر تیز دھار چھرے کی مدد سے ذبح کر دیا تھا اور اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر کے سیاہ تھیلے میں ڈال کر چھپا دیا تھا۔ گھر کے دیگر افراد اس کی ان سرگرمیوں سے لاعلم تھے اس نے اس طرح پلاننگ کی تھی کہ وہ باقاعدگی سے کالج بھی جا رہا تھا اور کسی کو شک بھی نہ ہونے دے رہا تھا۔

آسمان پر صرف تارے چمک رہے تھے چاند غائب تھا ہلکی ہلکی خنکی فضا میں چھائی ہوئی تھی غار کی طرف جانے والا راستہ جھاڑ جھنکار سے اٹا پڑا تھا۔ جنگلی پودے اور جھینگروں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کا پہاڑ اور اس میں بنا ہوا غار اسے اندھیرے میں یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی دیو منہ پھاڑے کھڑا ہوا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا غار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں جھولنے والے تھیلے میں ایک ٹارچ بھی موجود تھی اس نے بے خیالی میں تھیلے میں ہی ڈال دی تھی اب اسے اندھیرے میں اس کی ضرورت پڑنے پر خوشی محسوس رہی تھی کہ اس نے ٹارچ ساتھ لا کر اچھا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے ٹارچ تھیلے سے نکال کر روشن کی تو سامنے غار میں دور تک روشنی پھیل گئی۔

روشنی کے ہالے میں دور اسے ایک شخص ایک ٹانگ اٹھائے کھڑا نظر آیا جس نے ہاتھ میں ایک طشت پکڑا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ قریب پہنچ کر جیسے ہی رکا اس شخص نے اپنی آنکھیں کھول کر اسے گھورنا شروع کر دیا تسیم نے جھانک کر تھال میں دیکھا تو اسے اس میں خون بھرا ہوا نظر آیا۔ ابھی وہ اس کا مقصد سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ایک بھیانک آواز سنائی دی۔ ''جلدی کر دیہ طشت میرے سر پر انڈیل دو اور اس تھیلے کو دور پھینک دو''۔ تسیم نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا تھیلا دور پھینکا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر دھرا طشت پکڑ کر اسے اس کے سر پر انڈیل دیا۔ گاڑھا گاڑھا انسانی خون اس کے تمام جسم پر پھیل گیا اور وہ شخص زبان سے منہ پر پھیلا ہوا خون چاٹنے لگا۔ جیسے جیسے وہ خون چاٹتا گیا اس کے سامنے پھیلے ہوئے غاروں میں سے اس طرح کی آوازیں آنے لگیں جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ تسیم نے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو بند کر لیا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ شور اس کے کانوں کے پردے پھاڑ کر نکل جائے گا۔ کچھ ہی دیر میں یکدم غار میں خاموشی چھا گئی اور سامنے کھڑا شخص اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو پکڑ کر دبانے لگا۔ اس عمل سے اس کی زبان بار بار باہر نکلتی لیکن وہ مسلسل اسے دہراتا رہا۔

کافی دیر تک ایسے کرنے سے اس نے تسیم کو اشارے سے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا تسیم کسی معمول کی طرح اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس شخص نے تسیم کا منہ دونوں ہاتھوں اور ایک انگلی کی مدد سے کھولا اور ایک منتر پڑھ کر اس میں پھونک دیا۔ تسیم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ اس کے منہ میں ڈال دیا ہو اور کوئلہ حرکت کرتا ہوا اس کے معدے میں اتر گیا ہو۔ ''جا اب تیرے قبضے میں میں نے ایک ہیرو دے دیا ہے اسے استعمال کر اور اپنی چھوٹی موٹی خواہشوں کو پورا کر۔'' اس شخص کے یہ کہتے ہی یکدم جھپا کا ہوا اور غار میں تسیم تنہا رہ گیا۔ تسیم کو کچھ سمجھ نہ

آیا کہ کیسا ہیر اس کے قبضے میں آیا ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ تھیلے کی جانب مڑا مگر تھیلا غائب تھا۔ یہ دیکھ کر نسیم نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

گھر پہنچا تو سامنے ہی بابا اس کا منتظر تھا۔ رات کا وقت تھا گھر میں خاموشی تھی اور سب چین کی نیند سو رہے تھے۔ اس نے بابا کو سب کچھ بتانا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے روک دیا۔ ”مجھے سب پتہ چل گیا ہے مہا گرو نے تمہیں اپنا ایک ہیر دے دیا ہے اب تم بے فکر ہو جاؤ اور اب تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق ہر چیز ملے گی جس کی تم خواہش رکھتے ہو مگر خبردار اپنے ہیر سے کبھی ایسا کام لینے کی کوشش نہ کرنا جسے وہ پورا کرنے سے انکار کر دے ایسا کرتے ہی تمہارا ہیر تمہاری جان کا دشمن بن جائیگا اور پھر تمہیں اسے اپنی جان دے کر ہی لوٹانا ہوگا۔ بابا نے اسے تاکید کی۔

نسیم بابا کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اس نے وعدہ کیا اور بابا یہ کہتے ہی منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھنے لگا اور اس کے چہرے پر پھونک مار کر کہنے لگا اچھا اب تم جلدی سے اپنے گھر کے اندر داخل ہو جاؤ اس سے پہلے کہ تمہارے گھر کے کسی فرد کو تمہاری گھر سے غیر موجودگی کا پتہ چل جائے اور میں تمہارا کل شام جھونپڑی میں انتظار کروں گا کل تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔“ یہ کہتے ہی بابا غائب ہو گیا۔ نسیم نے اِدھر اُدھر دیکھا چاروں طرف خاموشی طاری تھی اس نے آہستہ سے گھر کے دروازے کی کنڈی کھولی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندر داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

گرو ہرمن غار سے غائب ہوتے ہی سیدھا ایک جھیل پر پہنچا اور اس کے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جس سے اس کے جسم پر لگا سارا خون صاف ہو گیا۔ گرو ہرمن نے آخرکار کھیعز پال حاصل کر لیا تھا اب اس نے جلد از جلد دیگر جاپ مکمل کروا کے ہمیشہ کے لیے امر ہو جانا چاہتا تھا۔ اب اسے جلد از جلد لجپال سے پیچھا چھڑوانا تھا کیونکہ اب اس کا مزید زندہ رہنا اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ غسل سے فراغت کے بعد اس نے ایک منتر پڑھا اور سیدھا لجپال کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ جھونپڑی کے اندر خاموشی طاری تھی اس نے آہستہ سے اس کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا تو اسے لجپال گہری نیند سویا نظر آیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر لجپال کی طرف اپنا دایاں ہاتھ جھٹکا تو اس میں سے بجلی کی لہریں نکل کر لجپال کے چہرے پر پڑیں اور لجپال دیکھتے ہی دیکھتے یوں جلنے لگا جیسے سوکھی لکڑی پر پٹرول چھڑک کر اس کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ چند ہی منٹوں میں وہاں راکھ کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔ ”اب تم نرک میں جاؤ باقی کام میرا نیا چیلا کرے گا۔“ یہ کہہ کر گرو ہرمن غائب ہو گیا۔

”بھنڈاری کا یا پلٹ“ کے ہیر ہاتھ باندھے گرو ہرمن کے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ”کھیتر پال“ کا جاپ اس وقت گرو ہرمن مکمل کر کے انہیں قبضے میں کر چکا تھا۔ ”سنو اب تم نے لجپال کے پاس جانے کی کوشش نہیں کرنی کیونکہ اسے میں ختم کر چکا ہوں۔ آئندہ سے میرا نیا چیلا نسیم ہے عنقریب میں تمہیں اس کے پاس روانہ کرونگا تم نے اسے کالی چٹانوں میں بنے ایک اندھیرے غار میں لے جانا ہے جہاں وہ میرے لیے خاص جاپ مکمل کرے گا لیکن اس بات کا خیال رہے کہ تم لوگوں نے اسے غار کے باہر ہی چھوڑنا ہے اندر جانے کی ہمت نہ کرنا ورنہ پاتال کی گہرائیوں میں زندہ دفن ہو جاؤ گے۔

”لونا چماری“ اور ”کالا کوا“ اس کے تعاقب میں ہیں تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دونوں کالے علم کے شہنشاہ ہیں میں ان کو باخبر ہونے تک اپنا جاپ مکمل کروا لینا چاہتا ہوں صرف جلدی کی وجہ سے میں نے اپنے چیلے لجپال کو ختم کر دیا ہے۔“ یہ کہہ کر گرو ہرمن نے سامنے پڑی ایک بندر کی کھوپڑی کو ہاتھ میں اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا کھوپڑی دیوار پر لگتے ہی اسکرین کی طرح دیوار روشن ہو گئی۔

سامنے نسیم بستر پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا گرو اس کو بلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نسیم نے کسمسا کر آنکھیں

کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ”نسیم جلدی سے جھونپڑی میں پہنچو“...... گرو نے اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

نسیم ایک معمول کی طرح اٹھا اور باہر جانے والے راستے سے نکل گیا۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے جنہیں اس کی فکر ہوتی۔ والدین دوسرے کمرے میں محو خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ باہر نکل کر بابا کی جھونپڑی کی جانب بڑھ رہا تھا کہ راستے میں اسے کتے نظر آئے جو تیزی سے اس کی طرف لپکے مگر قریب پہنچ کر اپنی دُمیں دبا کر آہستہ آہستہ آوازیں نکالتے واپس بھاگ گئے۔ یہ دیکھ کر نسیم کو حیرت ہوئی پھر یکدم اسے خیال آیا کہ اس کے قبضے میں تو ایک ہیر ہے کیوں نہ اس سے کام لیا جائے یہ خیال آتے ہی اس نے بابا کا بتایا ہوا منتر پڑھا تو ایک بری شکل کا انسان اس کے سامنے ظاہر ہو گیا جس کے سر کے بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے تھے اور اس کے منہ میں لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر کی جانب لٹک رہے تھے ہاتھوں کے ناخن لمبائی کی وجہ سے مڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پہلے تو نسیم ڈر گیا لیکن یہ دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر سر جھکائے کھڑا ہے تو اس نے اسے حکم دیا کہ ”وہ اسے فوراً بابا کی جھونپڑی میں پہنچا دے۔“ یہ سنتے ہی اس نے نسیم کی طرف اپنا ہاتھ جھٹکا تو اس میں سے ایک پھوار سی نکل کر اس پر پڑی اس کی سانس ایک لمحے کے لیے رکی اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا دوسرے لمحے وہ بابا کی جھونپڑی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے سامنے کا پردہ ہاتھوں سے ہٹایا تو جھونپڑی میں ایک راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ابھی وہ بابا کے متعلق سوچوں میں گم تھا کہ

اچانک جھونپڑی میں دھواں سا گردش کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ ایک لنگوٹ باندھے بدصورت شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی خون کی بدبو سے نسیم کا ناک بند ہوا جا رہا تھا اس نے باہر بھاگنا چاہا مگر جیسے اس کے جوتوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ شخص اس سے مخاطب ہوا...... ”مجھ سے ڈرو نہیں میں تمہارے مداری بابا کا گرو ہوں میں نے اسے ایک ضروری کام سے بہت دور بھیج دیا ہے اب تم مجھ سے جاپ کا سبق سیکھو گے“۔ اس بدصورت شکل انسان نے اس کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر نسیم نے اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگا کہ ”بابا نے اسے آج یہاں پہنچنے کا کہا تھا۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے میں تمہیں اپنے کام سے ایک ایسا جاپ دے کر روانہ کرنا چاہتا ہوں جسے صرف تم ہی پورا کر سکتے ہو اس جاپ کے ذریعے جہاں میرا کام مکمل ہو گا اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بے شمار دولت اور آسائشیں میسر ہوں گی“۔ بابا نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا۔

نسیم کا دل بلیوں اچھلنے لگا اس کی مراد بر آئی تھی اس نے بابا سے کہا کہ وہ جلد از جلد اسے جاپ بتائے تاکہ وہ اسے پورا کر کے فائدہ حاصل کر سکے۔ یہ سنتے ہی بابا نے اسے ایک جاپ بتایا جس کا نام ”بھیدوں دیوتا کا جاپ“ تھا اس کے مطابق اسے ایک پرانے کھنڈر میں رات کے وقت اس جاپ کو مکمل کرنا تھا اس نے تمام تفصیلات طے کر کے اس شخص سے اجازت لی اور گھر لوٹ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں دوسرے روز رات کے وقت اس جاپ کو مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کھنڈرات کے متعلق اسے پتہ پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ بے فکر ہو کر گھر پہنچتے ہی سو گیا۔

☆......☆......☆

کھنڈرات رات کے سناٹے میں کسی دیوؤں کی مانند سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہزاروں سال کی گردش لیل و نہار کے باعث ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بادل منڈلاتے پھر رہے تھے۔ چاند بھی کبھی ان بادلوں کے پیچھے چھپتا تو پل بھر کے لیے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ ستارے اپنی مدھم روشنی

میں حیرت اور خوف سے زمین پر چلنے والی ایسی مخلوق کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں میں ایک چھوٹے سے معصوم بچے کو اٹھایا ہوا تھا اس کا منہ چقندر کی طرح اور پاؤں اونٹ کے پاؤں کی طرح تھے۔ چہرے پر خباثت دور سے ہی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بچے کے جسم میں اپنے تیز دانت گاڑتی اوراس کے جسم کا کچھ حصہ کاٹ کر اپنے حلق سے اتارتی جاتی۔ اس کی باچھوں سے ٹپکنے والا خون راستے میں ایک لکیر کی صورت میں گرتا چلا جارہا تھا۔ رات کے اس سناٹے میں ایسا منظر دیکھ کر ایک مضبوط حوصلے کا انسان بھی لرز سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس بلانے کھنڈرات کے اندر قدم رکھ دیئے۔ کھنڈرات میں نحوست چھائی ہوئی تھی سامنے کبھی بڑے گیٹ لگے ہوتے مگر اب اس کے صرف نشان ہی باقی بچے تھے دونوں سائیڈوں پر ایک ایک پتھر کے کتے تراشے رکھے تھے۔ کتوں کی زبانیں منہ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ اس عجیب وغریب مخلوق نے جیسے ہی کھنڈرات کے اندر قدم رکھے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کہیں آس پاس کوئی انسان سانس لے رہا ہوں، اس نے اپنی لمبی تھوتھنی اوپر اٹھائی اور فضا میں کچھ سونگھنے لگی اس کے ساتھ ساتھ وہ آگے بڑھتی گئی۔ انسانی بو اس کی مکمل رہنمائی کر رہی تھی۔ کھنڈرات میں کمروں در کمروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا لگتا تھا جیسے کسی صدی میں یہ کھنڈرات شاہی محل کا درجہ رکھتے ہوں گے۔ بو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی اور کچھ ہی دیر میں وہ سامنے کے ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی بو اسی کمرے سے آرہی تھی اوراس کا احساس ہوتے ہی وہ اچھل کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

رات کا وقت ہوتے اورنسیم نے گھر کے افراد کے سوتے ہی باہر کی راہ لی اور تیز تیز قدم اٹھاتا شہر سے باہر نکل آیا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بادلوں کے ٹکڑے اڑتے پھر رہے تھے۔ نسیم نے منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر پھونکا تو ایک کریہہ الشکل انسان نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی نسیم نے اسے فوراً کھنڈرات میں پہنچانے کا حکم دیا یہ سنتے ہی اس کریہہ الشکل انسان نے اس پر ایک پھونک ماری جس سے ایک پھوار سی نکل کر اس کے جسم پر پڑی تو چند لمحوں کے بعد نسیم نے خود کو تاریک کھنڈرات کے سامنے پایا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کسی جانور تک کے بولنے کی آواز نہ آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کرۂ ارض پر کوئی جاندار زندہ نہ بچا ہو۔ نسیم ایک لمحے کے لیے گھبرایا مگر یہ سوچ کر کہ بہت ساری دولت حاصل کرنے کے لیے اسے ہمت کرنا پڑے گی اس نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ کھنڈرات کے بڑے سے بیرونی دروازے کی سائیڈوں پر پتھر کے کتے آویزاں تھے جن کی لمبی زبانیں باہر لٹک رہی تھیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ سامنے کمروں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا اس نے چاند کی روشنی میں ایک نسبتاً بڑے سے کمرے میں ایک کونے میں جگہ صاف کی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

جاپ پڑھنے کے لیے اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں چاند کی روشنی باآسانی پہنچتی رہے۔ "بھیروں دیوتا کا جاپ" کرنے کے لیے اسے مسلسل پندرہ منٹ تک اپنی آنکھیں بند رکھنا تھیں۔ ابھی اسے جاپ کرتے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی قوی الجثہ جانور زمین کو روندتا ہوا اس کھنڈرات کی جانب بڑھتا چلا آرہا ہو۔ اس نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن کچھ ہی دیر میں جب وہ بھاری آواز اس کے کمرے کے سامنے کے رخ آن کر رکی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی دونوں آنکھوں کو کھول دیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اس کی رگوں میں خون جیسے منجمد ہوکر رہ گیا ہو۔

آج سے پہلے اس نے کبھی بھی اس قدر بھیانک شکل کی مخلوق نہیں دیکھی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے بھاگ کر سامنے موجود اینٹوں کے ڈھیر کو عبور کیا اور ایک اور کمرے میں داخل ہوگیا اس طرح بھاگتے بھاگتے وہ کمروں کے اندر بہت دور تک نکل گیا۔ اپنے پیچھے آنے والی خوفناک آوازیں اسے مسلسل تعاقب کرتی سنائی دے رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے اس کی سانس پھول گئی۔ اس نے رک کر سانس درست کی جیسے ہی وہ دوبارہ آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھانے لگا اس کے سامنے ایک عورت کودی جس نے لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا اوراس کے سر پر بال نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہ سر سے گنجی تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے لمبے دانت اس کی بدصورتی میں اور اضافہ کر رہے تھے۔ اس کے کان لمبے اوران میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔ اس نے ہاتھ میں ایک تیز دھار کلہاڑی تھامی ہوئی تھی جس کی دھار اندھیرے میں بھی واضح چمک رہی تھی۔ کودتے ہی اس عورت نے ہاتھ گھما کر اس کی گردن پر کلہاڑی کا وار کرنا چاہا مگر نسیم جھکائی دے کر اس کے وار کو ناکام بنا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے دوبارہ دانت کچکچاتے ہوئے ہاتھ گھمایا مگر اس بار نسیم خود کا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر چھلانگ لگا چکا تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے سامنے موجود ایک لمبی راہداری میں دوڑ لگادی۔

وہ عورت مسلسل ہاتھ میں موجود کلہاڑی لہراتی ہوئی اس کے تعاقب میں تھی۔ نسیم اندھادھند بھاگتا ہوا راہداری پار کر گیا۔ سامنے ایک لمبا دالان تھا جس میں ایک کنواں نمایاں تھا۔ کنویں کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے گدھ اس کے باہر نکلتے ہی اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے تاریک فضا میں تحلیل ہوگئے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور سامنے موجود ایک چھوٹا سا برآمدہ نظر آنے پر اس کی طرف دوڑا۔ برآمدے کی دوسری طرف اسے چاند کی روشنی میں دور تک پھیلے ہوئے کھیت صاف نظر آرہے تھے۔ جیسے ہی وہ برآمدے میں پہنچا اسے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دیکھ کر اس نے بھاگ کر اپنے سامنے موجود چار فٹ اونچی کچی دیوار پر ہاتھ جماتے ہوئے باہر کھیتوں میں چھلانگ لگادی اگر ایک پل کی بھی اسے دیر ہوجاتی تو تیز دھار کلہاڑی اس کے کندھے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی۔ کھیتوں میں لگے ہوئے تازہ پانی کی وجہ سے اسے بھاگتے ہوئے کافی دقت ہو رہی تھی مگر جان بچانے کی خاطر وہ مسلسل بھاگتا چلا گیا۔ نجانے کتنی دیر تک وہ یوں ہی بھاگتا چلا گیا کافی دور نکل آنے کے بعد اس نے پیچھے دیکھا تو کھنڈرات کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ اس کے جوتے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ اس نے رک کر جوتے اتارے اور انہیں صاف کر کے دوبارہ پہن لیا۔

دور سے ایک کٹیا دکھائی دے رہی تھی پہلے تو اس نے اس طرف جانا مناسب خیال نہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر اس کٹیا کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کٹیا کے سامنے پہنچ گیا۔ کٹیا گھاس پھونس سے بنی ہوئی تھی اور اس کی دیوار کے ساتھ ایک مٹکا اور ایک مٹی کا آبخورہ بھی رکھا ہوا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس کی پیاس کی شدت بڑھ گئی تھی اس نے نیچے بیٹھ کر آبخورہ بھرا اور جی بھر کر پانی پیا اور سیراب ہوکر کٹیا کے دروازے کو ہاتھ سے دھکیلا۔ دروازہ یوں کھل گیا جیسے صرف اس کے چھونے کا منتظر ہو اس کے ساتھ ہی ایک بارعب آواز سنائی دی۔ "اندر آجاؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ آج تم ضرور یہاں آؤ گے۔ میں مجبور تھا کہ اس سے پہلے تم سے نہیں مل سکتا تھا۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ طاغوتی طاقتوں کو پچھاڑنے کے لیے میں تمہیں ان سے بچاؤں تم بری طرح طاغوتی طاقتوں کے شکنجے میں پھنس گئے ہو۔ اب بھی اگر تم نے واپسی کا راستہ اختیار نہ کیا تو تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں بھولے بھٹکے لوگوں کو بھلائی کی راہ دکھاتا ہوں۔ تم ایک نیک انسان ہو تم نے دولت حاصل کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ بدی کا راستہ تھا۔ طاغوتی طاقتیں ازل سے ہی نوری طاقتوں سے برسرپیکار ہیں۔ یہ ایک چھڑی رکھ لو اب باقی کام تم نے اپنی ہمت سے سرانجام دینا ہے۔ اس چھڑی کی مدد سے تم اس گرو ہرمن شیطان کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو جو تمہارے سہارے ابدی زندگی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تو تمہاری جان کے ساتھ ساتھ وہ دیگر معصوم انسانوں کی زندگی کا بھی دشمن بن جاتا۔ تم نے پرانے کھنڈرات میں سے بھاگ کر اپنی جان بچائی ہے لیکن ابھی بھی موت کے سائے تمہارے گرد

منڈلا رہے ہیں“۔

اس کے سامنے موجود ایک باریش بزرگ نے ہاتھ میں پکڑی ایک چھڑی اسے دیتے ہوئے کہا۔

بزرگ کے ہاتھ سے چھڑی لیتے ہوئے تسیم نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور معافی مانگی کہ وہ راہ سے بھٹک گیا تھا اور بدی طاقتوں کے شکنجے میں پھنس گیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر منہ ہی منہ میں منتر پڑھ کر پھونکا تو کچھ بھی نہ ہوا اس نے دو تین بار ایسا کیا مگر جب کچھ نمودار نہ ہوا تو اس بزرگ نے مسکرا کر اس سے کہا کہ ”میری وجہ سے وہ بدی کی طاقتیں یہاں آنے سے جل جائیں گی اس لیے انہیں مارنے کے لیے تمہیں کٹیا سے باہر جانا ہوگا۔“

یہ سنتے ہی تسیم نے باہر نکل کر منتر پھونکا تو فوراً وہی کریہہ الشکل انسان حاضر ہوگیا جسے دیکھتے ہی تسیم نے چھڑی اس کی طرف گھما دی چھڑی میں سے نارنجی رنگ کے شعلے نکل کر اس کریہہ الشکل انسان پر پڑے اور اس کا جسم پٹرول لگی لکڑی کی مانند جلنے لگا۔ آگ میں جلتے ہوئے اس انسان نے ہزاروں مختلف روپ بدلے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں راکھ کا ڈھیر رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد سامنے کے رخ دھوئیں کا مرغولہ دکھائی دیا اور گھومتا ہوا آسماں کی طرف اٹھا اور گھومتا ہوا مشرق کی جانب بڑھ گیا۔ جتنی تیزی سے مرغولہ غائب ہوا تھا اتنی تیزی سے واپس بھی آ پہنچا لیکن اب اس میں گرو ہرمن کی بھیانک شکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کی جگہ دو جلتے ہوئے کوئلے دہک رہے ہوں۔

بزرگ بھی آہستہ سے آن کر تسیم کے پیچھے کھڑا ہوگئے۔

تسیم نے چھڑی والا ہاتھ اپنے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔ ”مورکھ! تو نے یہ کیا کیا اپنے ہی ہیر کو یوں جلا دیا۔ تو جانتا نہیں کہ اس کے لیے تم کو دوبارہ جاپ کرنا ہوگا اور تو نے کھنڈرات والا جاپ بھی ادھورا چھوڑ کر غلطی کی ہے۔ تمہارے پیچھے لگنے والی چڑیل اصلی نہیں جادوئی کرشمہ تھی جس سے تم ڈر کر بھاگ آئے ہو اس لیے واپس کھنڈرات لوٹ کر جاپ مکمل کرو اور جلد دوبارہ میرے پاس پہنچو تاکہ میں تمہیں بہت سی دولت دے سکوں“۔ گرو آتے ہی اس پر برس پڑا۔

”بھاڑ میں گئی تیری دولت اور تیرا جاپ...... میں ابھی تجھے جہنم میں پہنچاتا ہوں“...... یہ کہہ کر تسیم نے جلدی سے چھڑی والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ گرو ہرمن سنبھل کر اپنا بچاؤ کرتا۔ چھڑی میں سے نکلنے والی نارنجی شعاعیں تیزی سے نکل کر گرو کے چہرے پر پڑیں۔ گرو ابھی منتر پڑھنے کے لیے منہ کھولنے ہی لگا تھا کہ پل بھر میں نارنجی شعاعوں نے اس کے چہرے کو بھسم کر دیا۔ گرو کے جلتے ہی تسیم کو ایک جھٹکا لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دونوں ہاتھوں میں دبا کر مسل دیا ہو۔ جھٹکا اتنی زوردار تھی کہ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور پل بھر میں وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

آنکھیں کھلتے ہی تسیم نے بزرگ کو اپنے چہرے پر جھکے دیکھا۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بابا سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ ”چونکہ اس پر جادوئی حصار قائم تھا اس لیے ہر شیطان کے مرتے ہی حصار بھی ختم ہوتا تھا اس لیے وقتی تکلیف ہوئی تھی۔ مگر اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہو۔ لہٰذا میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیتا ہوں ابھی کچھ ہی دیر میں صبح ہونے والی ہے اس لیے اپنے گھر والوں کو خبر ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤ۔“

یہ کہہ کر بابا نے اسے آنکھیں بند کرنے کا کہا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اسے ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم ہوا پر تیرتا ہوا جا رہا ہو اور پھر بابا کے کہنے پر اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو گھر کے دروازے پر پایا۔ بابا غائب ہو چکے تھے اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر میں داخل ہو کر اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔

وہ موت کے منہ میں جا کر واپس زندگی کی طرف پلٹا تھا اس نے سچے دل سے توبہ کی اور مطمئن ہو کر گہری نیند سو گیا۔

ڈاک بنگلہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اچانک رات کے اندھیرے میں پائل کی آواز گونجی تو نوجوان اس کی طرف بڑھنے لگا اور آواز کا تعاقب کرتا گیا وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کہاں ہے لیکن پھر......

خراماں خراماں...... دل و دماغ کو مبہوت...... کرتی اور جسم کو تھرا دینے والی...... کہانی

گھنے جنگلوں، ٹیڑھے میڑھے راستوں، اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، کے طویل سلسلے سے گزرتی ہوئی ہماری ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ راج محل! یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ شاہ باغ اور لارڈ کلایو کی شکست و فتح کی یادگار، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش، پرشکوہ کھنڈرات! ایسا معلوم ہوتا تھا بے یہ آشوب روزگار شہر کبھی شہر نگاراں رہا ہوگا۔ یہ بل کھاتی ہوئی ندی، یہ لہلہاتے سبزہ زار، یہ حسین پھولوں کی وادی، یہ مہکتے کوہسار چھوٹے سے شہر میں اتنی ساری رعنائیاں۔

لیکن جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کر سکتی وہ تھی، ”نیل کوٹھی“ جسے عرف عام میں ڈاک بنگلہ کہتے تھے۔ ڈاک بنگلہ اس لئے مشہور ہے کہ یہ جگہ اب بھی دور سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کو پناہ دیتی ہے یہ اور

بات ہے کہ کوئی بھی یہاں سے چین سے ایک رات بسر نہیں کرسکا ہے۔ اس قسم کی بہت سی روائتیں مشہور ہیں۔ لیکن ان میں حقیقت کہاں تک ہے، یہ انتہائی مشکل ہے۔

کوٹھی کے تنہا نگہبان راموداداکی رائے بہت مستند مانی جاتی ہے راموداد اس ماحول میں رہنے والا قدیم ترین انسان ہے اس کی زندگی میں اس کوٹھی کے بہت سے مالک بدلے لیکن راموکی جگہ وہی رہی اور آج بھی بنگال کے ایک بڑے زمیندار ہریش چندر کے لڑکے ونے چندر کی ضد پر خریدی گئی۔ یہ کوٹھی راموکے ہی تصرف میں ہے۔ کبھی کبھی یہاں آنے والوں سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کا تنہا حقدار راموداد ہے اور یہاں جو کہانیاں جنم لیتی ہیں، ان کا واحد رازدار رامودادا ہے۔ یہاں کی فضا رامودادا کے سوا کسی اور کوراس نہیں آئی۔ یہاں کوئی زیادہ وقت تک نہیں ٹھہر پاتا۔

اسٹیشن سے نکل کر مغربی سمت میں درختوں کے جھنڈ میں پراسرار حسینہ کی طرح کھڑی یہ کوٹھی بہت ہی حسین ہے۔ اس کے قدموں میں بہتی ہوئی گنگا اس کے آنچل میں ٹکے ہوئے سرخ سفید پھول، کچھ دور پر اس کے شانہ بشانہ پھیلا ہوا پہاڑیوں کا سلسلہ دل ودماغ پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے۔ خصوصاً چاندنی رات میں اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے پس منظر میں سیاہ درخت اور سامنے اس کا صبیح حسن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پری لٹ جھکائے بیٹھی ہو۔ شاہ شجاع کے قلعہ کے سینے پر بنی ہوئی یہ کوٹھی نیل کی کھیتی کے تجارتی نقطہ نگاہ سے بنائی گئی تھی اور اب ہندوستان کی سرزمین پر بیرونی تسلط اور طرز معاشرت کا مکمل نمونہ ہے!

سامنے سے آیئے تو جہاں پر دور تک پھیلتی ہوئی پتھروں اور سرخیوں سے بنی ہوئی سڑک مڑ جاتی ہے وہاں سے ایک نئی سڑک شروع ہوتی ہے۔ گہری سرخی سے لپٹی ہوئی نیل کوٹھی کے قدموں میں مچلتی ہوئی یہ سڑک ڈاک بنگلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اندر جانے سے پہلے ایک بلند گیٹ ملے گا، جس کا ایک پایہ گردش زمانہ کی نذر ہو گیا ہے۔ سرخ سڑک کے دونوں جانب سرو کے قطار در قطار درخت ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ کنارے کنارے گہرے رنگوں کے انگریزی پھول کھلے ہیں۔ عشق پیچاں کی بیلیں کانٹے دار تاروں سے والہانہ لپٹی ہوئی چھت پر چڑھ رہی ہیں۔

چند زینے طے کرنے کے بعد آپ ایک وسیع صحن میں پہنچیں گے۔ پھر ایک کشادہ سائبان ملے گا۔ جس میں ہر طرف ہوادار چھجے لگے ہیں۔ ایک بڑا سا ہال ہے جس کے اردگرد پھیلا ہوا سائبان دور تک چلا گیا ہے۔ اس کی پشت پر ایک بہت ہی کھلی ہوئی جگہ ہے جہاں سے خوشنما موسم اور لہروں کے پیچ وخم کا لطف لیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جگہ خاص اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہو۔ جہاں بیٹھ کر دو دھڑکتے ہوئے دل راز و نیاز کی باتیں کرسکیں۔ سائبان سے متصل پرانے قلعے کا قوی ہیکل ستون ایک پہرہ دار دیو کی مانند پانی کی لہروں میں اتر کر گنگا کی مقدس روانی کا محافظ بنا کھڑا ہے۔ سائبان کا یہ خوبصورت حصہ آگے چل کر اچانک نیچے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ جہاں سے بیسوں فیٹ نیچے چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی امڈتی ہوئی دیوانہ وار موجیں اپنا دہانہ کھولے کسی کی منتظر ہیں۔ پاس ہی کے باغ کے احاطے میں بانہیں پھیلائے ہوئے سیاہ درخت اندھیری رات میں انتہائی خوفناک معلوم ہوتے ہیں۔ درختوں کے کنج سے بہتی ہوائیں ماحول کی سسکیاں بن جاتی ہیں!

ہمارے ساتھ چار آدمی تھے۔ اور سبھی روشن خیال۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ کسی طرح کا خوف محسوس ہو۔ اس لئے جب رامودادا نے کہا آج آپ لوگ میری کٹیا میں ٹھہریں میں کل انتظام کردوں گا تو ہم مسکرا پڑے۔

''نہیں دادا ہمیں یہی جگہ پسند ہے۔''

اور جب ہمارے اصرار پر اس نے ڈاک بنگلہ کھولا تو پھر کہا۔ ''آپ لوگ خوب سوچ لیں، یہ ویرانہ جگہ ہے، دریا میں خوب پانی آ گیا ہے، کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ گھپ اندھیری رات ایسے میں یہاں رہنا اور مشکل ہو جاتا ہے پانی کم ہوتا ہے تو لوگ کشتی لے کر آتے جاتے ہیں لیکن ایسے موسم میں کسی آدمی پر نظر نہیں پڑے گی؟''

لیکن ہماری ضد کے آگے رامودادا خاموش ہو گیا۔ برسوں سے لگا ہوا زنگ آلود قفل کھولا گیا، چھتوں پر پھیلے ہوئے مکڑی کے جالے۔ گرد سے اٹے ہوئے صوفے، شکستہ روشن دان، دیواروں میں آویزاں تصویریں، ٹوٹے ہوئے بجلی کے تار اور پنکھے اور ایک کشادہ آتشدان، رامودادا نے جلد ہی صفائی شروع کر دی اور ایک گوشے میں ہمارا سامان قرینے سے رکھ دیا۔ اپنی کٹیا سے ایک لیمپ لاکر روشن کیا۔ کچھ لکڑیاں لاکر آتش دان میں ڈال کر گرمی پیدا کر دی۔ اور ضروری ہدائتیں دے کر بازار چل دیا۔

شام ہی سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ درخت پراسرار خاموشی میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد کوندتی ہوئی بجلیاں سارے ماحول کو چونکا دیتیں اور پھر ایک اداس تاریکی پھر زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سارے درخت آنسوؤں میں نہا گئے۔ سنسناتی ہوئی ہوائیں جسم میں گدگدی پیدا کرتی ہوئی گزرنے لگیں۔ سردی بڑھ چلی تھی۔ ہم سب کمرے میں چلے گئے اور آتشدان کے پاس بیٹھے رہے ہمیں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر بحث کا نیا موضوع نہ مل سکا کچھ تھکاوٹ اور خنکی سے پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ رامودادا ہنوز لاپتہ تھا بارش کا شور اور ہوا کے جھونکوں سے سائیں سائیں اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی کچھ دیر بعد اور کہیں بھاری قدموں کی آواز آئی۔

''ٹپ.....ٹپ.....''

پھر آواز قریب آ گئی۔ اور ایک لمحہ کو آواز کی پھر دروازہ کھل گیا اور ایک تیز جھونکا کانوں کے پاس سے سنسناتا ہوا نکل گیا۔ ہمیں یاد نہیں ہم نے دروازہ بند کیا تھا یا نہیں لیکن کھٹکا کھلنے کی صاف آواز آئی۔

پھر ایک لمبا تڑنگا جوان ہمارے سامنے موجود تھا۔ ہمیں زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ ہماری ہی طرح ایک اجنبی تھا جو شاید بارش سے بچنے کے لئے ادھر آ نکلا تھا۔ وہ بری طرح شرابور تھا۔ جیسے پانی میں ڈوب کر نکلا ہو۔ اس کے ہاتھ اس کے ہیٹ، اس کے کوٹ، اس کے جوتے سبھی سے پانی ٹپک رہا تھا۔

اس کی بے تکلفی پر ہمیں ذرا تعجب ہوا۔ لیکن خوشی بھی وہ خاموشی سے آتشدان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر باتیں ہوئیں ادھر ادھر کی زمانے کی موسم کی عقائد کی اور بالآخر اس مکان کی باتیں ہماری دلچسپی اور گہری ہوتی چلی گئی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ یہ مکان ایک زمانے میں ونے چندر نامی ایک نوجوان نے خریدا تھا۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اور اپنی پرکشش شخصیت کے باعث بہت مقبول تھا۔

ایک دن اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا شام کے وقت وہ ایک تاریک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک مترنم آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''آؤ.....میرے ساتھ آؤ.........!''

اور وہ غیر شعوری طور پر بڑھتا گیا۔ پائل کی آواز کا تعاقب کرتا گیا، دور بہت دور ایک ویران اور عالیشان مکان میں وہ داخل ہوئی۔ اندر داخل ہو کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک رنگ محل میں پہنچ گیا ہو۔ دلکش ودلنواز چیزیں انواع واقسام کے کھانے، پری چہرہ عورتیں، وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ لڑکی اسے وہیں چھوڑ کر کہیں گم ہوگئی۔ پھر گہرے سرخ رنگوں کے لباس میں ملبوس آئی اور کہنے لگی۔ ''آؤ سیر کریں۔'' دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔

ونے گھر لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اب اکثر وہ چاندنی راتوں میں دریا کے کنارے اس لڑکی کے ساتھ گھومتا نظر آتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ لڑکی کون ہے اور ویرانے کے اندر اتنا حسن کہاں سے سمٹ آیا؟ وہ اس پر اتنی مہربان کیوں......؟''

ان ہی دنوں اس نے ماں سے ضد کر کے یہ مکان خرید لیا۔ رامو اس کی حفاظت کرتا کچھ دن کے بعد ونے میں ایک عجیب تبدیلی ہوئی۔ اس کی شادی کو کچھ ہی دن گزرے تھے لیکن اپنی خوبصورت اور نئی نویلی دلہن

سے انتہائی بے زار رہنے لگا۔ خاص طور سے اس کے سرخ لباس سے انتہائی نفرت تھی۔

آخر ایک دن اس کے سارے سرخ کپڑے جلا ڈالے، گھر کے لوگ بہت پریشان ہوئے۔ اس کے والد آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی اب سخت ہونے لگے۔ اور ایک دن اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اور اس مکان کو فروخت کرنے کی سوچ لی۔

لیکن دوسرے دن اس سے بھی حیرتناک واقعہ ہوا۔ بند کمرے سے آواز آ رہی تھی۔

"ونے! اپنی بیوی کو نکال دو۔ یہ میری دشمن ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔" اور جب کمرہ کھول کر دیکھا گیا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دوسرے دن چاندنی اپنے شباب پر تھی۔ رات گئے سے وہ اپنے کمرے سے غائب تھا۔ پھر وہی مکان وہی جگہ وہی لڑکی اپنی پائل کی آواز پر ونے کو راستہ بتاتی ہوئی چل رہی تھی۔

آج وہ اداس تھی پر اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ "ونے ہم اس طرح نہیں مل سکیں گے۔ ہمیں ایک ہو جانا ہی چاہیے۔"

ونے سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکا۔

پھر وہ دیر تک گھومتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ رامو اپنی جھونپڑی میں اونگھ رہا تھا۔ دریا میں لہریں ابھر کر نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں درخت سکتہ کے عالم میں کھڑے تھے۔ قلعہ کا دیو نما ستون خاموش تھا۔ لڑکی اٹھ گئی وہ چلنے لگی۔

"آؤ...... اب ہم چلیں......!"

اور ونے چلتا رہا......! چلتا رہا...... اپنے سے بے نیاز...... ماحول سے بے خبر......"آؤ......!" اس نے پھر کہا۔ "ذرا آگے بڑھو!"

یہاں تک کہ ایک زوردار دھما کہ ہوا پچاسوں فیٹ نیچے چنگھاڑتی ہوئی لہروں نے اس ہنگامے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا!

دوسرے دن سویرے ونے کی لاش ملی......!

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"تو کیا اب یہاں کوئی نہیں رہ پاتا؟"

ہم نے پھر سوال کیا۔

"نہیں...... رات گئے دھیمے دھیمے پائل کی اور پھر زوردار قہقہوں کی آواز گونجتی ہے۔" اس نے کہا ہم لوگ کہانی میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ یہ محض ایک کہانی تھی۔ اور پھر اجنبی کی زبانی بحث کا موضوع بدل گیا۔

لیکن ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دور کہیں پائل بج رہی ہو۔ دھیمی، دھیمی...... مدھم، مدھم......!

پھر وہ ہم کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کہا۔

"چھوڑیئے ان کہانیوں کو اس زمانے میں کس کو فرصت ہے ان پر غور کرے......!!"

"ہاں یہ تو ہے لیکن......"

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ٹوک کر کہا۔" ارے یہ کیا؟ آپ اتنی دیر سے آگ کے سامنے بیٹھے ہیں، لیکن شرابور ہو رہے ہیں۔!"

"ہوں......" وہ مسکرایا۔

دور کہیں پائل چھنکی!

"جی آپ کیا کہہ رہے تھے۔" میں نے ٹوکا۔

"میں......!" اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔

"میں کبھی خشک نہیں ہو سکتا میں برف ہوں اور برف پر آگ اثر نہیں کرتی برف اور آگ کا کیا مقابلہ؟"

یہ کہہ کر اس نے جلتی ہوئی لکڑیوں کے کئی شعلے اٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھ لئے۔ اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

ہاہا......ہاہا......ہاہا......!"

تیز جھونکا آیا لیمپ بجھ گیا۔ اور دو ملے جلے قہقہے گونجنے لگے......!

جب ہمیں ہوش آیا تو رامو دادا سرہانے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ آپ لوگ یہاں رات بھر نہیں رہ سکیں گے!!"



یشمک

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اپنی اپنی کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے کہ اچانک ایک خوفناک منظر رونما ہوا، ایک زہریلا کالا بچھو ایک خاتون کے ہاتھ پر گرا تو خاتون کی چیخ نے قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا کہ پھر اتنے میں......

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل گرفتہ اور دل فریفتہ ذہن کو مبہوت کرتی کہانی

آج میں جس مہم کی کہانی آپ کو سنانے جا رہا ہوں اس کا آغاز اسی روز ہو گیا تھا جب میں پورٹ سعید پر بحری جہاز سے اترا۔ حقیقتاً یہ اس سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا مگر افسوس اس وقت مجھے اس کا ادراک نہ ہو سکا۔ مشرق کا سحر ہر ذہن پر حاوی ہے۔ اسی سحر کے زیر اثر میں نے اپنی چھٹیاں منانے کے لیے مصر کو چنا جہاں ذرے ذرے میں تاریخ بستی ہے جہاں فضاؤں میں بھی جادو ہے۔ اپنے اس سفر کو پوری طرح یادگار بنانے کے لیے میں نے سمندری سفر کو ترجیح دی تا کہ مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے ایک ایک لمحہ کو اپنی سانسوں میں، اپنی یادوں میں اتار سکوں۔

یہ میری زندگی کا پہلا بحری سفر تھا اس لیے میں قدرے نروس بھی تھا۔ میری بکنگ "مارسلی" نامی بحری جہاز پر تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے کیبن عرشے کے بالکل

قریب مل گیا تھا۔ اس شاندار عرشے پر چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ سیلانی آدمی کے لیے دنیا کا کوئی کونا نہیں ہے۔ اس جہاز پر کئی اینگلو انڈین باشندے بھی سفر کر رہے تھے۔ میں جس سے بھی ملا وہ ''کپلنگ'' کی کسی کتاب کا عکس نظر آیا۔ ان دنوں میں مشرق کے سحر میں پوری طرح سرتاپا لپٹا ہوا تھا اس لیے یہ سب میرے لیے بہت ہیجان انگیز تھا۔ مشرق نے مجھے پکارا تھا اور اس پکار کو جو کوئی سن لے وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتا مگر یہ پکار صرف ان کو سنائی دیتی ہے جو کانوں سے نہیں بلکہ دل سے سنتے ہیں اور میں نے اسے سن لیا تھا۔

سفر سے پہلے میں نے ایک شان دار غسل کیا اور وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے ہی بندرگاہ پہنچ گیا۔ گینگ وے پر نوٹس چسپاں تھا کہ مارسیلی جہاز دو گھنٹے کی تاخیر سے رات نو بجے روانہ ہوگا۔ میں واپس جانے پھر دوبارہ آنے اور جہاز سے رہ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے میں نے یہ وقت ایک ریسٹورنٹ میں صرف کرنے کو بہتر خیال کیا۔ میں بے صبری سے جہاز کی روانگی کا انتظار کر رہا تھا اور جب آخر کار ایک طویل انتظار کے بعد میں نے اپنا شاندار کیبن دیکھا تو ساری کلفت دور ہوگئی۔ میزا نرنک میرے سفید اور بے داغ اجلے بستر کے نیچے تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ کر دن بھر کی یادیں اکٹھی کرنے لگا۔

اس جہاز میں سفر اور اپنے بستر پر لیٹنا میرے لیے ایک سنسنی سے کم نہیں تھا۔ اتنا بڑا بحری جہاز سمندر کے سینے پر تیرتے ہوئے ایک شان دار ہوٹل کی مانند تھا اور اس جہاز پر سفر کرتے میرے بہت سے ساتھی مسافر میرے لیے ایک رومانوی کتاب کی مانند تھے جسے میں پڑھنے کا شائق تھا اور دوسرے دن کے اختتام سے پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہاں کچھ ایسی چیز ضرور موجود ہے جو پر تجسس ہے۔

ڈائننگ ہال میں رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے ایک ہم عمر شخص سے باتوں میں مصروف تھا جو کولمبو میں چائے کے باغات کا مالک تھا۔ ہم ایک گھنٹہ تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی مگر یوں لگا جیسے ہم برسوں پرانے دوست ہیں یا پھر کم از کم دوسروں کو ضرور ایسا ہی محسوس ہوا۔

''کیا تم ان چار ہندوستانیوں کو دیکھ رہے ہو جو ہمارے بائیں ہاتھ کونے میں میز پر بیٹھے ہیں۔'' ہملٹن نے پوچھا۔ یہ میرے اس نئے دوست کا نام تھا۔ میں اس میز کی طرف دیکھنے لگا پھر پوچھا۔

''کون ہیں یہ لوگ۔؟''

''میں نہیں جانتا مگر مجھے وہ مشکوک سے نظر آرہے ہیں۔'' ہملٹن نے جواب دیا

''مشکوک۔۔۔۔۔۔؟'' میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ہملٹن کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا کہ جب وہ اس جہاز پر سوار ہوئے تو ان کا استقبال خود جہاز کے کپتان نے کیا اور ان میں سے دو تو اس کے ساتھ اس کے کیبن میں آدھ گھنٹہ تک علیحدگی میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔'' ہملٹن نے پوری رپورٹ تیار کر رکھی تھی۔

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی میں کچھ وضاحت نہیں کر سکتا لیکن ان کا رویہ ہی ان کو مشکوک بنا رہا ہے۔ کیا تم نے کوئی اندازہ نہیں لگایا۔؟'' اس نے سوال کیا۔

اس خیال سے کہ وہ مجھے بے وقوف ہی نہ سمجھے میں نے اس سے مزید کچھ نہ پوچھا نہ وضاحت مانگی اگرچہ اس وقت میں اس کی بات کا مطلب بالکل بھی نہ سمجھا۔ مجھے اس کی سمجھ بعد کے واقعات کی وجہ سے آئی مگر اس وقت میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ دوسری صبح ناشتے کے وقت میں نے کئی مرتبہ ان مشکوک لوگوں پر نظر ڈالی۔ وہ ایک علیحدہ میز پر بیٹھے تھے اور ان کو جہاز کے ملازمین کی طرف سے دوسرے مسافروں کی نسبت زیادہ توجہ مل رہی تھی۔ وہاں میں اکیلا نہیں تھا جو اس بات کو محسوس کر رہا تھا مگر یہ اینگلو انڈین دوسرے لوگوں سے مختلف نظر آرہے تھے۔ یہ اینگلو انڈین لوگ کسی سے بات بھی نہیں کر رہے تھے اور نہ کبھی عرشے پر نظر آئے تھے شاید بہت زیادہ تنہائی پسند تھے۔

میرا دوسرا دن جہاز پر معمول کے مطابق گزرا۔ میں کیبن سے باہر جہاز کے عرشہ پر کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ وہ ایک حسین شام تھی بحیرہ روم میں ڈوبتا ہوا سورج ایک سرخ تھال کی مانند نیلے پانی کی گود میں اتر رہا تھا اور میں مبہوت انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے آس پاس موجود کیبنوں میں روشنیاں جل چکی تھی۔ کونے کا کیبن جو دوسروں سے قدرے بڑا تھا اچانک اس کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل کر عرشے پر آیا اس کا رخ میری طرف ہی تھا۔ وہ کوئی عورت یا لڑکی تھی جو سیاہ ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے سر اور کندھوں پر قیمتی منقش چادر تھی اور چہرے پہ پشمک تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اس پشمک والی خاتون کو اس جہاز پر دیکھا۔ وہ ایک بارعب اور شان دار شخصیت والی خاتون تھی۔ اسے دیکھتے ہی کئی حسین نظاروں نے میرے لیے اپنی وقعت کھودی۔ وہ کچھ اور قریب آئی تو میں اس کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کی تراشیدہ اٹھتی ہوئی ناک، سیاہ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، گداز مرمریں ہاتھ جس سے اس نے اپنی چادر سنبھال رکھی تھی۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں سرخ یاقوت کی انگوٹھی سجی ہوئی تھی۔ اس نے اونچی ایڑی کی جوتی پہن رکھی تھی جس کی وجہ سے جب وہ چلتی تو عرشے پر ٹک ٹک کی آواز ابھرتی۔ شاید اسے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ میں اسے بغور دیکھ رہا ہوں اس لیے وہ جلدی سے واپس مڑی اور باوقار انداز میں چلتی ہوئی دوبارہ اپنے کیبن میں چلی گئی۔

میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی ایک جھلک نے میرے دل اور ذہن پر کیا تاثر چھوڑا۔ اسے دیکھ کر تو میں مبہوت ہی رہ گیا تھا۔ وہ مشرقی حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اینگلو انڈین لوگ میرے ذہن سے نکل گئے اور وہ چھپ گئی۔ میں نے جلدی سے لباس بدلا اور رات کے کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ وہاں بھی اسی کا خیال اور سراپا میرے ذہن پر چھایا رہا اور میں پوری طرح ہملٹن کی بات بھی نہ سن سکا جو میری طرف جھکا مجھے پتہ نہیں کیا کچھ بتا رہا تھا۔

میرا دھیان تو اس کونے والے کیبن کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا کہ مسلمان عورتیں کھلی جگہوں پر کھانا پسند نہیں کرتیں یہ ان کی مشرقی شرم و حیا کا تقاضا تھا۔ اس لیے وہ یقیناً اس ڈائننگ ہال میں موجود نہیں تھی اس لیے میں اس کے متعلق مزید کچھ معلوم نہ کر سکا۔

لیکن شاید آپ جانتے ہوں بحری جہاز پر خبریں اور افواہیں کیسے اور کتنی جلدی پھیلتی ہیں اس لیے جلد ہی مجھے اس کے بارے میں پوری معلومات مل گئی اور اس کا ذریعہ بھی ہملٹن ہی تھا۔ ہملٹن کے پاس ہمیشہ خبروں کا ذخیرہ رہتا مگر ان میں سچائی کس قدر ہے یہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ان میں رنگ خود بھر لیتا تھا۔ پشمک کی اس حسینہ کے بارے میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ دمشق کے ایک امیر مسلم خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور پورٹ سعید تک سفر کر رہی ہے۔

وہاں سے اسے دوسرے بحری جہاز کے ذریعے بیروت پہنچنا تھا۔ ہملٹن ہر کسی کی خبر رکھتا تھا مگر اس وقت وہ اس دمشقی شہزادی کے متعلق یہی خبر نکال پایا کیونکہ اس کی پوری توجہ صرف ان چار اینگلو انڈین لوگوں پر تھی۔ ان کے متعلق مجھے ہملٹن کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک ہندوستانی ریاست کے راجہ کے سفیر تھے جو ایک اہم کام کی انجام دہی کے لیے اس بحری جہاز پر موجود تھے۔ ہملٹن بتانے لگا۔

''میرے دوست تم نے یقیناً اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ایک مشہور فرانسیسی گلوکارہ ''لولا ڈی لارس'' اپنے زیورات اور استعمال کی دوسری قیمتی اشیاء نیلامی کے ذریعے فروخت کر رہی ہے تاکہ اس سے حاصل شدہ رقم سے کوئی خیراتی ادارہ بنا سکے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ اس کی نیلامی کی فہرست میں وہ مشہور ہندوستانی ہیرا بھی شامل ہے جو اسے لندن میں ایک شو کے دوران بہترین پرفارمنس سے خوش ہو کر شاہی خاندان کے ایک فرد نے پیش کیا تھا۔ یہ ہیرا اس گلوکارہ نے اب نیلامی کے لیے پیش کیا تو ہندوستانی ریاست کے راجہ نے اسے خرید لیا۔ اس طرح پچاس سال مغرب میں رہنے کے بعد یہ ہیرا مشرق کو واپس کر دیا گیا جہاں سے یہ آیا تھا اور اب اسی راجہ کے یہ سفیر اس ہیرے کو واپس ہندوستان لے جا رہے ہیں۔''

ہملٹن کی بات سن کر میں نے کڑیاں جوڑنا شروع

کہیں تو مجھے سب یاد آ گیا۔ میں نے واقعی اس ہیرے کے متعلق اخبارات میں پڑھا تھا۔ میں یہ جان کر حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ نادر اور بیش قیمت مشہور ہیرا میرے ساتھ ہی اس جہاز پر سفر کر رہا تھا اور یہ چار کم گو اشخاص اس ہیرے کے محافظ تھے۔ عام حالات میں شاید یہ میرے لیے زیادہ دلچسپ ہوتا مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایک اور معاملے نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی اور میں خوابوں کی دنیا میں رہ رہا تھا جہاں وہ دمشقی شہزادی میرے لیے ہیرے سے زیادہ قیمتی تھی۔

ایک یا دو دن کے بعد ایک شام میں عرشے پر کھڑا طلوع ہوتے چاند کا نظارہ کر رہا تھا۔ عرشہ تقریباً سنسان تھا کیونکہ نیچے ہال میں رقص و موسیقی کی محفل ہو رہی تھی اور زیادہ تر مسافر وہیں جمع تھے۔ وہ اپنے کیبن سے نکلی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی عرشے پر آئی۔ میں چاند کی روشنی میں اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ سکتا تھا۔ پہلے پہل مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ واپس پلٹ جائے گی کیونکہ اس کے انداز میں ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی۔ وہ کچھ رکی بھی مگر پھر آگے بڑھی اور میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ میں اس کی باوقار چال اور دل کش شخصیت سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ وہ آج بھی یشمک اوڑھے ہوئے تھی جس نے اس کے ملکوتی حسن کو اور بھی دل گداز بنا دیا تھا۔

اگر آپ نہیں جانتے تو میں بتا دوں کہ یشمک ایک قسم کا مہین اور باریک ریشمی نقاب ہوتا ہے جس سے مشرقی اور خصوصاً عرب خواتین اپنا چہرہ ڈھانپتی ہیں۔ یہ نقاب اس قدر باریک ہوتا ہے کہ نقاب ہونے کے باوجود اس میں سے چہرہ جھلکتا ہے اور اس کی کیفیت کچھ یوں ہی ہوتی ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں۔ ان دنوں یہ نقاب یا یشمک پردے سے زیادہ فیشن کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

وہ جنگلے کے پاس گئی اور اس کے سہارے جھک کر دور نظر آنے والی پہاڑی چوٹی کے مدھم سے ہیولے کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے دھیرے سے اپنی منقش شال کو دوبارہ اپنے کندھوں پر درست کیا اور پھر واپس پلٹنے لگی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا ریشمی معطر رومال عرشے پر گر گیا۔ میرا دل ایک دم بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں ایک جادوئی بگولے کی طرح اٹھا اور رومال کے پاس پہنچ گیا اور پھر دس سیکنڈ کے بعد میں اس سے بات کر رہا تھا۔ وہ رواں فرانسیسی زبان بول رہی تھی مگر انگریزی کم ہی جانتی تھی۔

اس نے دل موہ لینے والے مشرقی انداز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ میں کوئی دل پھینک شخص نہیں اور نہ ہی صنف نازک میری کمزوری ہے۔ میں پہلی نظر کی محبت کا بھی قائل نہیں مگر اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ اسے اپنی آغوش میں لے لوں اور ان کپکپاتے گلابی ہونٹوں کو بے تابی سے چوم لوں۔ اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی وہ یقیناً میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں گا مگر یہ کیفیت بہت غیر معمولی تھی۔ ان سیاہ نشیلی آنکھوں کی دراز پلکوں نے میرے دل میں آگ لگا دی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو دوں گا۔ وہ بول رہی تھی مگر میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سمجھنے کی کوشش کرتا اس نے اچانک میرے پیچھے دیکھتے ہوئے اپنے یاقوتی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اندھیرے سایوں میں گم ہو گئی۔ جملے میری زبان پر نامکمل رہ گئے۔ میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ شکل و صورت سے خوف ناک نظر آنے والا ایک مشرقی خدوخال کا مالک شخص عرشے پر پڑی ایک لائف بوٹ کی اوٹ سے مجھے جھانک رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ پر سبز غلاف نظر آ رہا تھا جیسا عموماً فلموں میں بحری قزاقوں کے چہرے پر نظر آتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یقیناً دمشق کی اس شہزادی کی نگرانی ہو رہی ہے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بوٹ کے پیچھے ہی کہیں غائب ہو گیا اور میں نے بھی یوں ظاہر کیا کہ جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں اور لاپروائی کے سے انداز میں چلتا ہوا وہاں سے نکل کر نیچے رقص کی محفل میں چلا آیا۔

☆......☆......☆

اس ادھوری ملاقات کی کسک میرے دل میں باقی رہ گئی۔ میں سوچتا رہا کہ اب دوبارہ ملاقات کیسے ممکن ہو مگر

دوسری ہی شام مجھے ایک اور ملاقات کا موقع مل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ملاقات اتفاقیہ نہ تھی بلکہ اس دمشقی شہزادی کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھی مگر وہ کچھ محتاط بھی نظر آئی۔ عرشے کے ایک کونے میں بیٹھے ہم تھوڑی دیر عام سے موضوعات پر بولتے رہے بلکہ یوں کہیے کہ میں ہی بولتا رہا وہ تو صرف ہوں، ہاں کرتی رہی۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی تمکنت تھی۔ اس کے انداز سے وضع داری جھلک رہی تھی۔ اس لیے میں بھی گفت گو میں محتاط ہی رہا حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان حسین کانوں میں سرگوشیاں کروں اور دل کی ساری کیفیت بیان کر دوں۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اسے بتا دیا کہ ایک مشہور ہندوستانی ہیرا ابھی اس جہاز پر واپس ہندوستان لے جایا جا رہا ہے۔ حالانکہ زیورات اور ہیرے جواہرات خواتین کا من پسند ہوتے ہیں مگر اس نے اس خبر میں کچھ زیادہ دل چسپی ظاہر نہ کی اور جلد ہی موضوع بدل دیا۔ اس وقت ہم عرشے پر بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میرا منہ سمندر کی طرف تھا اور وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس کے چہرے پر کل جیسا خوف نمودار ہو گیا اور الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ میں ایک دم چوکنا ہو گیا اور وہ پہلی ملاقات کی طرح اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے حلق سے ایک سرگوشی ابھری۔ ''دمشق.......مصطفیٰ۔''

اس سرگوشی اور مسحور کن دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ دمشق کی یہ شہزادی جس میں مجھے ہندوستانی راجہ کے ہیرے سے بھی زیادہ دل چسپی تھی تیزی سے اپنے کیبن کی طرف چلی گئی۔ میں نے ایک دم مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہی کل والا یک چشمی شخص جو شاید اس کا محافظ تھا ایک دیوار کے پیچھے دبکا کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

گفت گو کے درمیان مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس دمشقی حسینہ کا نام ''ناہیما'' تھا۔ حیرت انگیز طور پر ایک عورت ہونے کے باوجود اس نے ہیرے کے ذکر میں زیادہ دل چسپی ظاہر نہ کی تھی۔ بادی النظر میں تو مجھے اس کی یہی وجہ نظر آئی کہ دمشق کے شاہی خاندان سے تعلق اور دولت کی ریل پیل ہونے کی وجہ سے شاید اس قسم کے ہیرے اس کے لیے کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت میری سوچوں کا محور صرف ناہیما تھی اس کے علاوہ میرا دماغ کسی اور سوچ کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے میرے دل و دماغ پر مکمل طور پر قابو پا لیا تھا

اگلے دن ہملٹن نے دوپہر کے کھانے پر میری طرف جھکتے ہوئے نہایت رازدارانہ انداز میں بتایا کہ آج کھانے کے بعد جہاز کے کپتان کے کیبن میں صرف چند خاص لوگوں کو مدعو کیا جائے گا اور وہاں ہندوستان کے اس مشہور ہیرے کو جو اپنے چار محافظوں سمیت اس جہاز پر سفر کر رہا ہے شرکاء کو دکھایا جائے گا۔ میں یہ خبر سن کر تقریباً اچھل ہی پڑا اور ہملٹن سے پوچھنے لگا کہ کون کون اس محفل میں شریک ہوگا۔ میرا انداز اور تجسس دیکھ کر ہملٹن مسکرانے لگا اور بولا۔

''میرے دوست میں نے تمہارا نام بھی اپنی خاص کوشش سے اس فہرست میں شامل کروا دیا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔''

''اور وہ دمشقی شہزادی......؟'' میں جھجکتے ہوئے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ شریک ہو۔ ہملٹن میری بات سن کر مسکرانے لگا اور دوبارہ بولا۔ ''اس کی فکر نہ کرو۔ اس کا نام پہلے ہی شامل ہے کپتان کی فہرست میں۔''

ہملٹن کی بات سن کر میں نے سکون کی سانس لی۔ لنچ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد سب لوگ جہاز کے کپتان کے کیبن میں جمع ہو گئے۔ جہاز کے چیف آفیسر مسٹر برووڈی نے سب شرکاء کا اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں استقبال کیا۔ وہاں میرے اور ہیرے کے چاروں اینگلو انڈین محافظوں کے علاوہ ڈاکٹر پیٹرسن، مسز پیٹرسن، ہملٹن، ناہیما اور چند دوسرے خواتین و حضرات جمع تھے لیکن مجھے سب سے زیادہ حیرت سکاٹش پادری مسٹر ہاکنسن کو وہاں دیکھ کر ہوئی۔ میرا اس آدمی سے کوئی زیادہ تعارف نہ تھا بس دو چار دفعہ ڈائننگ ہال میں آتے جاتے سلام دعا ہوئی تھی لیکن وہ مجھے کچھ زیادہ پسند بھی نہ تھا اور اس

کی کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی مگر اس وقت وہ وہاں موجود تھا۔

یہ ایک گرم دن تھا سمندر شیشے کی ایک چادر کی مانند سپاٹ بہہ رہا تھا اور کپتان کے کیبن میں چیف آفیسر مسٹر بروڈی اپنی روایتی حسن مزاح کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ احتیاطی اقدامات کے تحت کیبن کے دروازے مقفل کر رہا تھا کیونکہ یہاں ایک قیمتی ہیرا موجود تھا جسے دیکھنے کے سب لوگ مشتاق تھے۔

جب سب دروازے مقفل کیے جا چکے تو کپتان کے اشارہ پر ایک ہندوستانی محافظ نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے لوہے کا ایک چھوٹا مگر مضبوط ڈبہ نکالا جس کے اندر وہ ہیرا موجود تھا جو تھوڑی دیر قبل ہی جہاز کے اسٹرانگ روم سے لایا گیا تھا۔ یہ ہیرا بہت شان دار چیز تھی۔ اس کا حجم قدرے غیر معمولی تھا اور یہ کیبن کے پورٹ ہول سے چھن کر اندر آنے والی سورج کی روشنی میں بڑے مسحور کن انداز میں جگ مگا رہا تھا۔ پہلے ایک محافظ نے اس ہیرے کی مختصر تاریخ بیان کی اور پھر اس کے بعد ہر کسی کو باری باری وہ ہیرا چھو کر دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ اپنی باری پر وہ ہیرا دیکھنے کے بعد میں نے ناہیا کی طرف بڑھا دیا جو میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی مجھ سے پہلے یہ ہیرا پادری مسٹر رالکنسن کے ہاتھ میں تھا۔ ناہیا نے اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں میں اس ہیرے کو تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں بچوں جیسا تجسس تھا۔ ابھی وہ ہیرے کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔

جس نشست پر میں بیٹھا تھا اس کے پیچھے کیبن کا پورٹ ہول تھا وہاں سے کہیں سے بھورے رنگ کی کوئی شے اچھلی اور کیبن کے درمیان رکھی میز پر عین ناہیا کے سامنے آن گری۔ اسے دیکھتے ہی سب بری طرح گھبرا گئے کیونکہ وہ ایک بہت بڑا بچھو تھا۔ چیف آفیسر نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بچھو ایک دم پھر اچھلا اور اس دفعہ وہ ناہیا کی گوری کلائی پر آن گرا۔ اتنا بڑا بچھو میں نے اپنی پوری زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جونہی وہ ناہیا کی کلائی پر گرا وہ خوف سے ایک دم چلائی اور ہاتھ کو بری طرح جھٹکا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہیرا نیچے زمین پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ جھٹکنے کی وجہ سے اب وہ بچھو سیدھا میرے بازو پر آن گرا میں نے فوراً ہاتھ چلایا اور اسے دور پھینک دیا۔ پورے کیبن میں ایک دم شور سا مچ گیا۔ خواتین تو باقاعدہ چیخ رہی تھیں۔

ایک عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ ہر شخص کی توجہ بچھو اور اپنی جان بچانے پر تھی مگر وہ چاروں ہندوستانی محافظ اس بچھو کی موجودگی سے بے نیاز بلیوں کی طرح گھٹنوں کے بل فرش پر جھکے اس ہیرے کو تلاش کر رہے تھے۔ مسز پیٹرسن اور میں نے تقریباً نیم بے ہوش ناہیا کو سہارا دے کر دروازے کے قریب پڑے صوفے تک پہنچایا اور اس کو وہاں لٹا دیا۔ جونہی ہم نے ایسا کیا تو وہ بچھو صوفے کے کنارے اور کپڑوں کی الماری کے بیچ سے باہر نکلا اور رینگنے لگا مگر اس بار بچ نہ سکا اور چیف آفیسر نے فوراً اس کو اپنے پاؤں تلے دبا کر مسل ڈالا۔

اس واقعے کی توجیہہ پیش کرنا ممکن نہ تھا مگر اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ہیرا ابھی تک غائب تھا اور اس چھوٹے سے کیبن میں باوجود کوشش کے مل نہیں سکا تھا۔ اسی لیے کیبن کا دروازہ بھی ابھی تک مقفل تھا۔ اس غیر معمولی صورتحال میں ناہیا کو باہر لے جانا بھی ممکن نہ تھا۔

اس دوران میں چاروں اینگلو انڈین گھٹنوں کے بل زمین پر رینگتے ہوئے ہیرا تلاش کر رہے تھے۔ چھوٹا سا کیبن تھا جس میں سامان بھی مختصر تھا مگر ہیرا تھا کہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ جب ہر جگہ تلاش کیا جا چکا تو سب کی سمجھ میں آ گیا کہ ہیرا کھو چکا ہے مگر کہاں۔۔۔؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پورے فرش کو کھنگالنے کے بعد وہاں سے صرف کوٹ کا ایک بٹن ملا مگر ہیرا نہ ملا۔ وہاں موجود سارے مرد حضرات کے کوٹوں کو جائزہ لیا گیا مگر ہر کسی کے بٹن پورے تھے۔

اس صورت حال پر چیف آفیسر پریشان ہو گیا۔ اس نے گھنٹی بجا کر باہر سے ایک خاتون مددگار کو اندر بلایا اور وہاں موجود ساری خواتین کو ساتھ والے خالی کیبن میں منتقل کر دیا گیا۔ دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا گیا اور پھر مسٹر بروڈی نے پہل کرتے ہوئے اپنا لباس اتارنا شروع کر دیا وہ ایک

ایک کر کے اپنے سارے کپڑے ایک چھوٹی میز پر رکھتا جا رہا تھا اس طرح اس نے اپنی پوری تلاشی دی اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوا جب تک کپتان سمیت ہر ایک شخص نے اسی انداز میں تلاشی نہ دے دی مگر ہیرا نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ملحقہ کیبن میں خواتین کی بھی اسی انداز میں تلاشی لی گئی مگر وہاں بھی نتیجہ وہی نکلا یعنی ہیرا ندارد۔ مجبوراً ہم سب کو وہاں سے جانے کی اجازت مل گئی مگر ہیرا کہاں گیا اس سوال کا جواب کسی کو نہ مل سکا۔ وہاں موجود ہر شخص اس مسئلے پر خاموش رہنے میں ہی عافیت محسوس کر رہا تھا مگر جہاز کے کپتان نے چیف آفیسر کی شان میں خوب گستاخی کی اور اسی طرح چیف آفیسر نے ہملٹن کو جو سنایا وہ بھی ناقابل بیان تھا کیونکہ ہیرے کی اس طرح نمائش کا آئیڈیا بھی ہملٹن کا ہی تھا۔ دوسری طرف وہ چاروں ہندوستانی ہم سب کو مشکوک سمجھ رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کچھ سمجھ نہ آیا۔ یہ معاملہ اتنا سنجیدہ تھا کہ میں اس کے سوا ہر شے بھول گیا حتیٰ کہ ناہیما کو بھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پورٹ سعید پہنچتے ہی ہم سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد ہملٹن میرے کیبن میں آیا اور گتے کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ جب وہ کھلا تو اس میں دو کچلا ہوا مردہ بچھو پڑا تھا۔ میں سوالیہ انداز میں ہملٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ بچھو آخر آیا کہاں سے۔۔۔؟" وہ نہایت سنجیدہ آواز میں بولا۔ یہ سوال اس سے پہلے ہر کوئی ایک دوسرے سے شاید کئی ہزار بار پوچھ چکا تھا مگر کسی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے بھی اپنا سر نفی میں ہلا دیا تو وہ خود ہی بتانے لگا۔

"یہ کھلے پورٹ ہول سے آیا تھا اور اس کو کوئی خصوصاً اسی مقصد کے لیے اس جہاز پر لایا تھا اور وہ شخص کیبن کے باہر عرشے پر موجود تھا جس نے یہ بچھو اس کیبن کے اندر پھینکا تھا۔"

"مگر اتنی خوف ناک چیز۔۔۔۔" میں نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔

"تم خوش قسمت ہو۔" ہملٹن نے پنسل کی نوک کی مدد سے اس مردہ بچھو کو اوپر اٹھایا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ خطرناک بالکل بھی نہیں ہے دیکھو اس کے ڈنک کو کسی نے کاٹ دیا ہے۔" میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ یہ بچھو واقعی بے ضرر تھا۔

ایک دو دن بعد ہم پورٹ سعید پہنچ گئے مگر اس دن کے واقعے کے بعد مجھے ناہیما سے دوبارہ ملاقات کا موقع نہ مل سکا تھا۔ جب یہاں میں نے اسے دیکھا تو وہ ایک کشتی میں ساحل پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے بھی اسی کشتی میں جگہ مل جائے اور میں نے اس کوشش میں اس کے ایک چینی محافظ کو بھی نظر انداز کر دیا کیونکہ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میری یہ کوشش رائیگاں گئی۔ مجھے اس کے بعد جانے والی کشتی میں جگہ مل سکی۔ جب میں ساحل پر اترا تو سامنے ایک نہایت عجیب منظر میرا منتظر تھا۔ ہملٹن اور دو تین دوسرے مسافروں کو چند باوردی پولیس والوں نے روکا ہوا تھا اور ان کے سوٹ کیس اور دوسرا سامان کھول کر تلاشی لے رہے تھے۔ ہملٹن غصے کے عالم میں اپنا سامان سمیٹ رہا تھا جو کہ اب زمین پر ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو چیخنے لگا۔

"یہ بے عزتی میری برداشت سے باہر ہے۔ میں نہیں جانتا یہ سب کس کے حکم پر ایسا کر رہے ہیں۔ یہ اجڈ اور بدتمیز پولیس والے میرے سامان سے ہیرا تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا میری نظر پادری مسٹر رابنسن پر پڑی وہ بھی قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ اپنا سنہری فریم والا چشمہ درست کرتے ہوئے بولا۔

"یہ سب غیر معمولی ہے۔ پہلے تو کبھی ان لوگوں کا رویہ ایسا نہیں رہا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہملٹن کے بعد اب تلاشی کی باری مسٹر رابنسن کی ہے اور ہوا بھی یہی مگر ہیرا اس کے سامان سے بھی نہ نکلا۔ اس کے بعد جیسا کہ مجھے خدشہ تھا ناہیما کو بھی اسی قسم کی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی

لوگوں کے ہجوم کو ساحل کے اس حصے سے دور رکھا جا رہا تھا جہاں ہم کھڑے تھے اور میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ سب کس کے کہنے یا اشارے پر ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا حکم کسی نے جہاز پر سے وائرلیس کے ذریعے دیا ہو۔ حیرت انگیز طور پر میرے سامان کی اس طریقے سے تلاشی نہ لی گئی مگر مجھے دیر تک روکا گیا اور ایک ایک سوال کئی کئی بار کیا گیا۔ اس دوران میں ناہیما اور اس کا ایک چینی محافظ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے اور اب کہاں گئے یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ایک ٹیکسی والے کی مدد سے میں ایک ہوٹل میں شب بھر کے لیے ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ ہملٹن کولمبو جا رہا ہے اسی وجہ سے اس کا سامان اور وہ خود پورٹ سعید پر ہی رک گیا تھا۔ اب مجھے اس پُرکشش دمشقی خاتون ناہیما کو شہر میں تلاش کرنا تھا مگر کہاں۔۔۔۔ یہ میں نہیں جانتا تھا مگر رات کو سونے سے پہلے جو آخری بات ذہن میں تھی وہ یہ کہ اب مجھے جلد ہی دمشق جانا ہوگا۔

☆......☆......☆

طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن دوپہر کی ٹرین سے مجھے قاہرہ روانہ ہونا تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کیا اور پھر کچھ دیر شہر کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا کہ کہیں مجھے ناہیما کی ایک جھلک دکھائی دے جائے مگر میرا مدعا پورا نہ ہوا۔ ٹرین روانہ ہونے کا وقت آیا تو میں نے اپنا سامان سمیٹا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے میں نے ریلوے اسٹیشن پر آنے جانے والے ہر شخص کا بغور جائزہ لیا کہ شاید ان میں مجھے کوئی شناسا دکھائی دے جائے۔ کسی شناسا کی تلاش تو بہانہ ہی تھا ورنہ اصل میں تو مجھے ناہیما کی تلاش تھی اس لیے ٹرین میں سوار ہونے کے بعد ڈبے میں موجود ہر مسافر کو بھی بغور دیکھا مگر وہاں ایسا کوئی مسافر نہ تھا جسے میں پہلے سے جانتا ہوتا۔ آس پاس صرف مقامی لوگ تھے۔ میری سیٹ پہلے سے بک تھی اس لیے میں اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین کا سفر مجھے ہمیشہ سے مسحور کر دیتا ہے۔ گاڑی سے باہر دوڑتے بھاگتے ندی نالے، کھیت کھلیان اور درخت سب میرے لیے ایک عجیب سی کشش رکھتے ہیں۔ میں ان نظاروں میں کھویا رہا مگر میرا دل ابھی تک اس کے پاس ہی تھا جو کہیں غائب ہو چکی تھی۔

اس وقت شام کا دھندلکا چھانے کے قریب تھا جب ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر رک گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو لوگوں کے لباس اور وضع قطع سے محسوس ہوا کہ یہ کوئی قدیمی اور چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ٹرین رکنے کی دیر تھی کہ پلیٹ فارم پر موجود سینکڑوں کی تعداد میں ٹھیلے والوں اور خوانچہ فروشوں نے مکھیوں کی طرح گویا مسافروں پر حملہ بول دیا۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں کھڑکی سے چپکا اس دلچسپ منظر کو دیکھتا رہا اور ٹرین کے دوبارہ منزل کی جانب روانہ ہونے کا منتظر رہا مگر جب کافی دیر بعد بھی ٹرین نے جنبش نہ کی تو مجھے تشویش ہونے لگی پھر اس سے پہلے کہ میں کسی سے اس بارے میں کچھ پوچھتا ریلوے اسٹیشن پر لگے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہونے لگا کہ آگے ریلوے لائن پر کسی حادثے کی وجہ سے آج رات ٹرین کو اسی اسٹیشن پر رکنا پڑے گا اور مزید سفر کل صبح سے پہلے ممکن نہیں ہے۔ یہ اعلان سنتے ہی مسافروں میں ایک ہلچل سی مچ گئی جسے میں بالکل بھی سمجھ نہ پایا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

ایک آدھ گھنٹے بعد مجھ پر عقدہ کھلا کہ مسافروں کی افراتفری کا یہ عالم اس لیے تھا کہ اس چھوٹے سے شہر میں رات گزارنے کے لیے صرف دو ہوٹل میسر تھے جو کہ اب ان غیر متوقع مہمانوں کی وجہ سے پوری طرح بھر چکے تھے۔ مسافروں کی اس بھاگ دوڑ کا راز معلوم ہوا تو میں پریشان ہو گیا اور مجھے بھی رات گزارنے کی فکر لاحق ہوئی ورنہ میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ رات بھر چونکہ ٹرین یہیں رکے گی اس لیے مسافروں کے رات کے قیام کا بندوبست بھی محکمہ ریلوے خود کرے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ ٹرین کی بوگی میں رات کاٹنا ناممکن تھا اور میں چونکہ غیر ملکی تھا اس لیے میرے شور مچانے پر ریلوے کے ایک افسر کی مہربانی سے مجھے شہر کے دوسرے کنارے پر ایک ہوٹل میں رات

گزارنے کو ایک کمرہ مل گیا، میں اس کا بہت شکرگزار ہوا۔
اس قسم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا جو کافی تلخ ثابت ہوا۔ مجھے جو کمرہ ملا وہ نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں تھا۔ سونے کے لیے جو چیز تھی وہ صرف کہنے کی حد تک بیڈ تھا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ اس پر سونے کی سہولت میسر تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ مجھ سے پہلے یہاں کوئی قابض تھا جو شاید یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر میری خاطر اسے یہاں سے چلتا کردیا گیا۔ دیواروں کو پختہ کرنے کے لیے سیمنٹ سے زیادہ مٹی کے گارے سے کام لیا گیا تھا۔ یہ کمرہ نہ صرف مچھروں بلکہ چیونٹیوں کی بھی آماجگاہ تھا۔ پوری عمارت میں سوکھی ہڈیوں کی ایک عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی یہ ایک خاص بو تھی جس سے میں بخوبی آشنا تھا۔ اس مہک سے میرا تعارف قدیم مصری شہروں میں ہوا تھا۔ یہ قدیم قصبہ بھی مصری باقیات و آثار قدیمہ کے قریب ترین تھا جہاں فرعونوں کے مقابر اور اہرام بھی تھے مگر یہ بو کچھ عجیب سی بھی تھی جو میرے لیے خاصی ناخوشگوار تھی۔

میں نے موم بتی کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں کپڑوں کی ایک قد آدم الماری بھی تھی یا جس کو بمشکل الماری کہا جاسکتا تھا مگر جب میں نے اس کے دونوں پٹ کھولے تو علم ہوا کہ وہ الماری کی بجائے ایک کھڑکی تھی جو ساتھ والے کمرے میں کھلتی تھی۔ اس کے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کمرہ شاید کوئی ہال تھا جو تھا تو نچلی منزل پر مگر اس کی چھت میرے کمرے کی چھت کے برابر تھی۔ کمرہ صرف ایک میز اور چند کرسیوں کے سوا بالکل خالی تھا۔ میں نے اس کھڑکی یا الماری کے پٹ بند کردیے اور بستر پر بیٹھ کر آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد کسی جانب سے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ میں فوراً چوکنا ہوگیا اور غور کرنے لگا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ یہ آوازیں اس الماری نما کھڑکی کے پیچھے سے آرہی ہیں۔ میں نے فوراً موم بتی بجھائی اور دبے پاؤں اٹھ کر اس الماری کے پٹ کھول کر نیچے جھانکنے لگا۔ اب وہاں ایک حیرت انگیز نظارہ میرا منتظر تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ حُسنِ ماہ تاب ناہیما لمبی عبا اور پشمک میں ملبوس میز پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کرسی پر اس کا یک چشمی محافظ مصطفیٰ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں کسی مسئلے پر گفت گو کررہے تھے جس کا ایک بھی لفظ سنائی نہ دے رہا تھا مگر ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ جی تو چاہا کہ فوراً ناہیما کو پکاروں مگر جس چیز نے میری زبان کو گنگ اور پاؤں کو جامد کردیا وہ ان دونوں کے درمیان میز پر رکھا وہ ہندوستانی ہیرا تھا جو بحری جہاز کے سفر کے دوران میں چرالیا گیا تھا اور اب میں اسے لیمپ کی روشنی میں جھلملاتا اور جگمگاتا ہوا یہاں دیکھ رہا تھا۔ ابھی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستگی سے بے آواز کھلا۔۔۔ یا کم از کم میں نے کوئی آواز نہ سنی مگر اس یک چشمی کو شاید اس کا احساس ہوگیا کیونکہ وہ ایک دم اٹھا، میز پر رکھا وہ ہیرا فوراً اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اپنی آنکھ پر پڑا کپڑا ہٹا کر وہ ہیرا آنکھ کی خالی جگہ میں رکھ لیا، کپڑا دوبارہ جمایا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت تک دروازہ پورا کھل گیا تھا اور ہملٹن اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت ہملٹن پوری طرح بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا ناہیما اپنی جگہ پر اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ہملٹن نے ان دونوں پر ریوالور پوری طرح تان رکھا تھا اور اس نے یک چشمی سے زیر لب کچھ کہا۔ اس کی بات سنتے ہی یک چشمی کے چہرے پر خوف، ناگواری اور بغاوت کے آثار نمودار ہوئے مگر ہملٹن کے سامنے وہ بے بس دکھائی دے رہا تھا۔

ایک دو لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد یک چشمی نے اپنی آنکھ کا پردہ ہٹایا اور ہیرا نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر اس چمکتے پتھر کو میز پر اچھال دیا۔ ہیرا دیکھتے ہی ہملٹن کے چہرے پر خوشی کے آثار ابھرے۔ وہ آگے بڑھا اور تقریباً جھپٹنے کے انداز میں ہیرا اٹھالیا۔ اس اثنا میں اس کے پیچھے دروازے کے تاریک خلاء میں ایک اور آدمی نمودار ہوا جسے دیکھ کر میں حیرت کے مارے تقریباً چیخ ہی اٹھا۔ یہ

لمبے چوغے والا پادری مسٹر رالنکسن تھا۔
کمرے میں گھستے ہی وہ ہملٹن پر چیتے کی مانند جھپٹا اور اپنے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے نہایت سرد لہجے میں بولا۔

"فار لینڈ!۔۔۔ میرے دوست تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ تم نہایت ناتجربہ کار جاسوس ثابت ہوئے ہو۔ اب مہربانی فرما کر یہ ہیرا میرے حوالے کردو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پلک جھپکائے بغیر اس نے اپنی نظر ہملٹن پر جما رکھی تھی۔ ریوالور کنپٹی پر جما تھا اس لیے ہملٹن کو مجبوری کے عالم میں اس کی بات ماننا پڑی۔ مسٹر رالنکسن نے ہیرا لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا پھر اس نے ہملٹن کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور بولے بغیر اپنے ہاتھ سے کھلے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے وہ اسے باہر چلنے کا کہہ رہا ہو۔ ہملٹن نے بے بسی کے عالم میں اپنے کندھے اچکائے اور دروازے کی طرف قدم بڑھادیے۔ ایک لمحے کے لیے رالنکسن کی نظر اور یہی ایک لمحہ اس یک چشمی محافظ کے لیے غنیمت تھا۔

وہ کنگرو کی طرح اچھلا اور تقریباً اڑتا ہوا سیدھا رالنکسن پر جا پڑا۔ دونوں فرش پر گر گئے۔ یک چشمی نے اپنے ایک ہاتھ سے رالنکسن کا نرخرہ دباتے ہوئے اس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے ناہیما کی طرف دیکھا اور تیزی سے کچھ بولا جسے سنتے ہی ناہیما ایک لمحہ ہچکچائی اور پھر وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

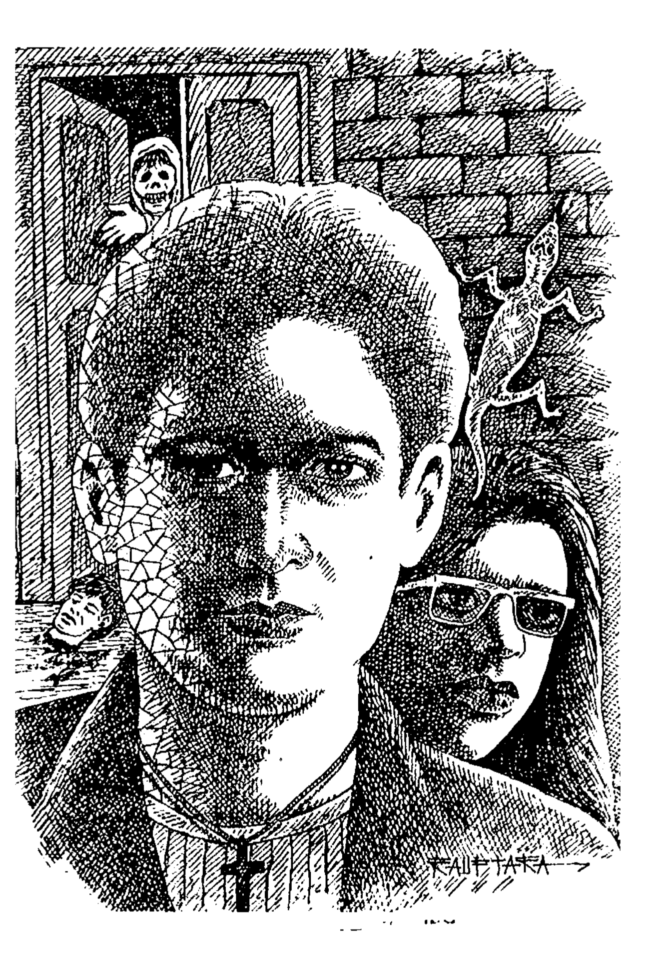
میں اگلے آدھے منٹ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچ گیا اور اگلے دس سیکنڈ بعد میں مسٹر رالنکسن کو اپنے قدموں پر کھڑے ہونے میں مدد دے رہا تھا۔ وہ اپنی گردن کو مسل رہا تھا شاید یک چشمی کا ہاتھ بہت سخت پڑا تھا اس کے علاوہ اس کو کوئی زخم نہیں آیا تھا اور وہ ہر طرح سے محفوظ تھا۔ یک چشمی بھی غائب ہوچکا تھا۔

"میں نے اس کو کھو دیا ہے۔۔۔" مسٹر رالنکسن نے شکست خوردہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا وہ دوبارہ کہنے لگا۔ "افسوس ہے وہ عورت ہاتھ سے نکل گئی اب اس کو پکڑنا مشکل ہے کیونکہ وہ دنیا کے اس خطے کو بہت اچھی طرح جانتی ہے۔"

مسٹر رالنکسن کی بات سن کر میرا دماغ پوری طرح گھوم رہا تھا اور میں سوچنے لگا کہ کیا مجھ پر پاگل پن غلبہ پا رہا ہے۔ گتھی بہت الجھ گئی تھی۔ اس دن کے بعد میں نے پھر کبھی ناہیما اور یک چشمی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ہملٹن سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر رالنکسن نے جو کہانی سنائی اس نے مجھے حیران کردیا۔ دمشق کا وہ پھول جس نے پوری طرح مجھے اپنے حُسن فسوں میں پھانس لیا تھا وہ مشرقی نہیں بلکہ ایک فرانسیسی خاتون تھی جو اس ہندوستانی ہیرے کی تاک میں ہی اس جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ کمال ہوشیاری اور چالاکی سے اس نے مجھے اپنا مہرہ بنالیا۔ پیرس کی پولیس اس کے خلاف لمبا چوڑا ریکارڈ رکھتی تھی۔ یہ ساری معلومات مجھے مسٹر رالنکسن سے ملیں۔

وہ بے ضرر بچھو بھی اسی خاص مقصد کے لیے لایا گیا تھا اور اسے کپتان کے کیبن میں پورٹ ہول کے ذریعے اسی یک چشمی نے ناہیما کے اشارے پر پھینکا تھا۔ ناہیما نے ہی وہ شرٹ کا بٹن وہاں پھینکا تھا تاکہ شک کسی مرد پر جائے۔ جب کیبن کے اندر لوگ گومگو کی کیفیت میں تھے اور ہیرا تلاش کررہے تھے تو ناہیما نے اپنا ہاتھ جھٹکنے کے بہانے پورٹ ہول کے ذریعے وہ ہیرا باہر عرشے پر پھینک دیا تھا جہاں موجود اس کا یک چشمی محافظ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ہیرا اس کی خالی آنکھ کے اندر ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کہانی میں ہملٹن کہاں سے آیا۔ ہملٹن کا اصل نام جیمز فار لینڈ تھا۔ وہ امریکہ کا رہنے والا ایک نوسرباز تھا جو دنیا کے تقریباً ہر ملک کی پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ بھی اس ہیرے کی تاک میں تھا مگر وہ عورت اس سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی۔ رہی بات مسٹر رالنکسن کی تو وہ کوئی پادری نہیں بلکہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا ایک سراغ رساں انسپکٹر تھا جو کہ ان دونوں کے پیچھے تھا۔ یہی وہ کہانی ہے جس کا آغاز رومانوی تھا مگر انجام انتہائی دل گرفتہ۔



اندھیرے سے اجالا

ملک فہیم ارشاد۔ ڈجکوٹ فیصل آباد

تیسری قسط

خوف کی وادی میں اٹکھیلیاں کرتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ڈالتی خیر و شر کی کہانی

حقیقت سے روشناس کراتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

"**کیوں** ......کیا ہوا......؟" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں اور نوکری چھوڑ کر چلے آئے۔" سنتوش نے بتایا۔

"بیٹا تمہارے پاپا نے مجھے نوکری سے نکال دیا تھا اور تم اسکول میں تھے اس لئے تم سے مل نہیں سکا۔" عبداللہ نے بتایا۔

"انکل جی...... میں آپ سے آخری بار ملنے آیا ہوں۔" سنتوش نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں......؟" عبداللہ حیران ہوا۔

"آخری بار کیوں......؟"

"میں اب شہر جا رہا ہوں اپنے ماما کے ہاں......" سنتوش نے بتایا۔

"لیکن کیوں......؟" حیرانگی بدستور عبداللہ کے چہرے پر عیاں تھی۔

"پنڈت جی کا کہنا ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو دھرم سے پھر سکتا ہوں۔" سنتوش طنزیہ لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی وہ ہنسا بھی تھا۔

"اوہ......" عبداللہ کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی۔

"تو اس کا مطلب دیانند جی کو بھی پنڈت نے ہی کہا تھا کہ وہ مجھے نوکری سے نکال دیں۔"

"جی ہاں مجھے بھی یہی لگتا ہے پرنتو عبداللہ انکل اصل میں یہ دھرم ہے کیا چیز۔" سنتوش نے کہتے ہوئے پوچھا۔

"دھرم، مذہب بیٹا انسان کی پہچان ہوتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے انسان کسے مانتا ہے کسے پوجتا ہے دھرم یا مذہب انسان کے لئے رہنمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔" عبداللہ نے بتانے کی کوشش کی۔

"اب مجھے پتا جی بھی کہتے ہیں اور پنڈت جی بھی کہ میں دھرم سے پھر سکتا ہوں انکل اگر میں دھرم سے پھر گیا تو پھر کون سا دھرم اپناؤں گا۔" سنتوش نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا تو عبداللہ بے اختیار مسکرایا۔

"یہ تو بیٹا تم چنو گے یا اوپر والا جو سب کے فیصلے کرتا ہے یعنی اللہ......اب فرض کرلو تین راستے ہیں ایک میں اندھیرا ایک میں اجالا اور تیسرے میں خاردار جھاڑیاں تو تم کون سا راستہ چنو گے......" عبداللہ نے بتاتے ہوئے پوچھا۔

’’ظاہری بات ہے انکل جی میں اجالے والا صاف ستھرا راستہ چنوں گا اندھیرے والا اور خاردار جھاڑیوں والا راستہ تو خطرناک ہے۔‘‘ سنتوش نے کہا تو عبداللہ مسکرا دیا۔

’’اسی طرح سماج میں کئی دھرم مذہب میں پیدائشی طور پر تو بندہ دھرم یا مذہب سے منسلک ہوتا ہے لیکن جب انسان عقل اور شعور کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے میرا دھرم یا مذہب ٹھیک ہے کہ نہیں کیا وہ مجھے ایک صرف ایک اللہ کی پہچان بتاتا ہے کہ یا نہیں کیا میرا مذہب یا دھرم اس اللہ کے احکامات کے چلنے کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے یا نہیں کیا میرا دھرم یا مذہب ایسا راستہ بتاتا ہے کہ جب اللہ احکم مانا جاتا ہے تو پھر کسی چیز کا خیال نہیں کیا جاتا کیا میرا دھرم یا مذہب یہ بتاتا ہے کہ ہمیں پیدا کرنے والا ہمیں اتنی آسائشیں دینے والا اللہ اسے خوش کیسے کیا جاسکتا ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’انکل جی آپ کا دھرم کیا ہے......‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’میرا...... میرا دھرم الحمدللہ اسلام ہے۔‘‘ عبداللہ فخریہ لہجے میں بولا۔

’’اور میرا......‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’تمہارا دھرم ہندو......‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’تو میرا دھرم اندھیرا ہے یا اجالا۔‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’ہمارے دھرم میں کسی دوسرے دھرم کو برا نہیں کہا جاتا کیونکہ دھرم تو ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے باقی رہی بات اندھیرے یا اجالے والی یہ بات بیٹا انشاء اللہ وقت کی چلتی گاڑی کے ساتھ تمہیں وہ بتائے گا جو میرا اور تمہارا سب کا مالک ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’انکل جی ہم سب کو بنانے والا ایک ہے۔‘‘ سنتوش نے حیرانگی سے پوچھا۔

’’جی ہاں بیٹا۔ سب کا مالک ایک ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’یعنی آپ کے دھرم والا اور میرے دھرم والا ایک اللہ ہی ہے۔‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’بیٹا دھرم کی نہیں مالک کی بات ہے سب کا مالک ایک ہے دھرم تو پہچان ہوتا ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’پرنتو انکل اگر سب کا مالک ایک ہے تو پھر میرے دھرم والے مندر میں موجود بتوں کو کیوں پوجتے ہیں۔‘‘ سنتوش منہ بناتے ہوئے بولا۔

’’یہ بات تو تم بھی بیٹا جانتے ہو کہ سب کا مالک صرف ایک ہے لور وہی عبادت اور پوجا کے لائق ہے۔ یہ بتوں کو پوجنا انسانوں کو پوجنا یہ تو ہم انسانوں کی سوچ ہے جو بالکل غلط ہے دنیا کی ہر دھرم ہر مذہب کی کتاب میں یہ موجود ہے کہ اللہ صرف ایک ہے اس کا دوسرا کوئی شریک نہیں وہی پوری کائنات کا مالک ہے انسان چرند پرند زمین آسمان، پہاڑ، درخت، سمندر، دریا، ندی، نالے اسی نے بنائے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں سے انسان سے بہت محبت کرتا ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’مجھ سے بھی......‘‘ سنتوش نے تیزی سے انگلی اپنی طرف کی۔

’’بالکل......‘‘ عبداللہ نے لفظ ’’بالکل‘‘ پر زور دیا۔

’’تم سے بھی اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے بیٹا جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو بدلے میں محبت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرتے ہیں لیکن بدلے میں ہم اس سے محبت تو دور کی بات ہے اس کے ساتھ کئی خداؤں کا تصور کرتے ہیں لیکن وہ ذات پھر بھی اتنی غفور ورحیم ہے کہ ہماری غلطیوں کو نظر انداز کردیتی ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ ہمارا خیال کرتا ہے۔‘‘ عبداللہ کے لہجے میں دکھ کا عنصر شامل تھا۔

’’یہ بات تو واقعی انکل آپ کی سو فیصد سچ ہے انکل آپ نے مجھے یہ لاکٹ دیا ہے نہ یہ ہر جگہ میری مدد کرتا ہے میں نے جب بھی اس لاکٹ کو سچے دل سے اپنے ہاتھوں میں تھاما ہے تو ہر مشکل سے مشکل راہ میرے لئے آسان ہوئی ہے۔‘‘ سنتوش نے بتایا۔

’’بالکل بیٹا...... یہ لاکٹ میں نے تمہیں دیا بھی اسی لئے ہے لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا بیٹا کبھی بھی اس لاکٹ کو اپنے آپ سے جدا نہ کرنا یہ لاکٹ اب تمہاری ضرورت بن چکا ہے اور یہی لاکٹ اندھیرے سے اجالے میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے کسی کو بھی اس لاکٹ کے بارے میں مت بتانا۔‘‘ عبداللہ نے سنتوش کو نصیحت کی۔

’’عبداللہ انکل اب آپ کون سا کام کریں گے۔‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’بیٹا ایک در بند تو اللہ تعالیٰ سو دروازے کھولتے ہیں اس کی فکر تم مت کرو......‘‘ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا میں نے ایک بڑی عجیب بات سنی ہے۔‘‘

’’جی ہاں...... میں وہ بات جانتا ہوں...... یہی نہ کہ میں نے رام کو چھت سے دھکا دے دیا۔‘‘ سنتوش سنجیدہ لہجے میں بولا۔

’’ہاں، ہاں بالکل یہی بات ہے۔‘‘ عبداللہ نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

’’انکل بات کچھ اس طرح ہوئی ممانے مجھے اور رام کو چھت پر کھیلنے کے لئے بھیجا......‘‘

ویسے ایک بات ہے سنتوش......‘‘ رام نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’وہ کیا......‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تمہارے جانے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوگی۔‘‘ رام نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’کارن جان سکتا ہوں۔‘‘ میں نے غصے سے پوچھا۔

’’مجھے کچھ سکون سا تو ملے گا۔ ہر معاملے میں تم اپنی ٹانگ اڑاتے ہو اور ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹتے ہو۔‘‘ جواباً رام بھی غصے سے بولا۔ ہم دونوں چھت پر پہنچ گئے تھے۔

’’میرا دل نہیں چاہ رہا۔‘‘ میں نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

’’مجھے تو ایک چنتا کھائے جارہی ہے۔‘‘ رام نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

’’وہ کس بات کی۔‘‘ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

’’تو شہر جارہا ہے تو شہر والوں کا کیا بنے گا۔‘‘ رام نے ہنستے ہوئے کہا تو بے اختیار میری ہنسی بھی نکل گئی۔

’’تو تجھے میرے جانے کی خوشی کچھ زیادہ ہی ہے۔‘‘ میں نے مصنوعی غصے سے رام کو گھورا۔

’’نہیں اتنی زیادہ بھی نہیں ہے...... بس اس بات کا دکھ ہے کہ فارغ سے میں کہاں جاؤں گا۔‘‘ رام نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’یار میں نے سنا ہے کہ ہم نے جن دو آدمیوں کو پکڑوایا تھا نہ حوالات میں ان کی بڑی خوف ناک ہتھیائیں ہوئیں ہیں۔‘‘ میں نے موضوع بدلا۔

’’ہاں...... یار سنا تو میں نے بھی ہے اسی کارن میں تمہیں کہتا تھا کہ کسی کے معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو کسی دن تم ہی کسی مشکل میں نہ پھنس جاؤ۔‘‘ رام نے کہا۔

’’ویسے میں جب بھی کسی معاملے میں پھنسا تو تمہیں ساتھ لے کر پھنسوں گا......‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’اسی کارن تو میں خوش ہوں کہ تیرے پتا جی تمہیں شہر بھیج رہے ہیں۔‘‘ رام نے کہا تو میں مسکرا دیا۔

’’سنتوش تمہارے پاس کوئی لاکٹ ہے......‘‘ اچانک رام نے پوچھا تو میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

’’لاکٹ...... کون سا لاک......‘‘ میں نے رام کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھیں بھی یکدم خون کی طرح سرخ ہوگئیں۔

’’وہی جو تم نے کپڑوں کے بھیتر (اندر) چھپایا ہوا ہے۔‘‘ رام کرخت لہجے میں بولا۔

’’ہاں...... ہے تو......‘‘ میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

’’وہ لاکٹ مجھے دے دو......‘‘ رام سخت لہجے

میں بولا۔
"کیوں......" میں حیران ہوا۔
"اور تمہیں اس لاکٹ کے متعلق کس نے بتایا۔"
اس بات کو چھوڑو کہ مجھے کس نے بتایا بس وہ لاکٹ مجھے دے دو" یہ کہتے ہی وہ میری طرف بڑھا ہم دونوں اس سے چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے تھے قریب پہنچنے پر اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑا تو اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی وہ پیچھے کی طرف اچھلا اور چھت سے نیچے جا گرا۔" یہاں تک کہہ کر سنتوش خاموش ہوگیا۔
"رام کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے پرنتو وہ بچ گیا ہے۔"
"ہوں......" عبداللہ نے گہری سانس کھینچی۔
"رام میں ضرور کسی شیطانی روح کا بسیرہ تھا۔"
"کیا مطلب عبداللہ انکل۔" سنتوش حیران ہوا۔
"چھوڑو اس بات کو۔" میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں چاہے کوئی بھی ہو۔ کوئی بھی ہو تم سے یہ لاکٹ اتارنے کے لئے کہے تم یہ لاکٹ نہیں اتاروں گے۔ دوسری بات دنیا کا کوئی بھی بڑا آدمی تم سے زبردستی یہ لاکٹ نہیں اتروا سکتا لیکن تم کسی کے کہنے پر یہ لاکٹ نہیں اتاروگے...... سمجھ گئے میری بات۔" عبداللہ نے سخت لہجے میں تاکید کرتے ہوئے جواب مانگا۔
جواباً سنتوش نے مضبوط لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے عبداللہ انکل اب میں چلتا ہوں میں بڑی مشکل سے مما سے اجازت لے کر آیا ہوں۔"
عبداللہ مسکرایا اور اس نے سنتوش کو گلے سے لگالیا۔

☆......☆......☆

شہر کے اسکول میں سنتوش کا آج چھٹا روز تھا کلاس کے تقریباً سب ہی لڑکوں سے اس کی دوستی ہوچکی تھی۔ اس کے ماما اور مامی نے اسے دل سے ویلکم کہا تھا اس کے ماما اور مامی کے دو بچے تھے ایک لڑکا جس کا نام سریش اور ایک بیٹی جس کا نام ساکھشی تھا وہ دونوں بھی اس کی کلاس میں تھے۔
"سنتوش ویسے گاؤں کی زندگی بڑی پرسکون ہوگی......" سنتوش کے ایک دوست زبیر نے پوچھا۔
"ہاں...... بالکل ......" سنتوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"تو پھر تم یہاں کیوں آگئے۔" زبیر نے پوچھا۔
"بس ماتا پتا نے یہاں بھیج دیا۔" سنتوش نے بتایا۔
"تو اس کا مطلب مجبوری کے کارن آئے ہو۔" زبیر مسکرایا۔
"بس یہی سمجھ لو......" جواباً سنتوش بھی مسکرایا۔
"پرنتو ہمیں تو بہت خوشی ہے۔" سریش اور ساکھشی نے بیک وقت مسکراتے ہوئے کہا۔
"سنتوش تمہارے گاؤں کا نام کیا ہے......" تھوڑی دیر بعد زبیر نے پوچھا۔
"بیلا پور......" سنتوش نے بتایا۔
"بیلا پور......" سنتوش نے سوچتے ہوئے لفظ "بیلا پور" دوبارہ دوہرایا۔
"کہیں تم دیانند انکل کے بیٹے تو نہیں۔"
"ہاں...... پر تمہیں کیسے پتہ چلا......" سنتوش تعجب سے بولا۔
"پھر تو میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" زبیر نے شوخ لہجے میں بولا۔
"وہ کیسے......" سنتوش حیرانگی سے بولا۔
"میں بھی اسی گاؤں سے آیا ہوں۔" زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ الگ بات ہے کہ کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔"
"اب بتا بھی دو تم مجھے کیسے جانتے ہو۔" سنتوش نے بے چین لہجے میں پوچھا۔
"تمہارے کارنامے بیلا پور میں کافی مشہور تھے۔" زبیر نے کہا۔
"اب آپ کرپا کرکے یہ بتادیں کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں تو آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔" سنتوش نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"میں انسپکٹر دیال کا بیٹا ہوں۔" زبیر نے بتایا۔
"کیا......؟" سنتوش خوشی سے چلایا۔
"ہاں میں انہی کا بیٹا ہوں پتا جی اکثر مجھے اور مما کو تمہارے کارنامے سناتے رہتے ہیں۔ تمہارے کارنامے کافی دلچسپ تھے اسی کارن تمہارا نام مجھے یاد رہ گیا۔" زبیر نے مزید بتایا۔
"تو انکل کا ٹرانسفر ممبئی میں ہوگیا۔" سنتوش نے چہکتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں......" زبیر نے مختصر سا جواب دیا۔
"تو پھر آج میں ضرور انکل سے ملوں گا۔" سنتوش نے کہا۔
"چھٹی کے بعد چلیں گے۔" زبیر نے کہا تو سنتوش نے اثبات میں سر ہلادیا۔
چھٹی کے وقت وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوگئے لیکن انہیں زبیر کہیں نظر نہ آیا۔
"یہ زبیر کہاں چلا گیا۔" سنتوش نے اردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔
"پورا سمے تو وہ ہمارے ساتھ رہا اب نجانے وہ کہاں غائب ہوگیا ہے۔" ساکھشی نے کہا۔
"شاید اسے گھر جانے کی جلدی ہو اسی لئے بنا بتائے ہی چلا گیا ہو۔" سریش نے خدشہ ظاہر کیا۔
پر اس نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے دیال انکل سے ملوائے گا۔" سنتوش نے سوچتے ہوئے کہا۔
"چلو اب گھر چلتے ہیں کل مل لیں گے اس سے۔" ساکھشی اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔
"چلو سنتوش پھر گھر چلتے ہیں......" سریش نے ساکھشی کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔
وہ گھر پہنچے تو سنتوش کی مامی سرکھشنا کا مسکراتا چہرہ انہیں دکھائی دیا۔
"آگئے بچوں۔" سرکھشنا نے مسکراتے ہوئے تینوں کو گلے لگایا۔
"جلدی سے ہاتھ منہ دھولو تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔"
واش روم سے فارغ ہوکر وہ تینوں کھانے کی ٹیبل پر آبیٹھے اسی وقت دروازے کی بیل بجی۔
"ہیں......" اس سمے کون ہوسکتا ہے۔" سرکھشنا بڑبڑاتی ہوئی دروازے کے قریب جا پہنچی۔
اس نے دروازہ کھولا تو سامنے بارہ۔ تیرہ سال کا ایک بچہ کھڑا تھا۔
"نمستے آنٹی......" اس لڑکے نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
"نمستے بیٹا۔" جواباً سرکھشنا مسکرائی۔
"آنٹی میں سنتوش، سریش اور ساکھشی سے ملنے آیا ہوں۔" اس بچے نے اپنے آنے کی وجہ بتائی جو زبیر تھا۔
"اندر آجاؤ بیٹا۔" سرکھشنا نے اسے راستہ دیا تو زبیر مسکراتا ہوا اندر آگیا۔
"ارے...... زبیر تم......" سنتوش دور سے چلایا۔
"ہاں میں...... پرنتو مجھے تم سے شکایت ہے۔" زبیر منہ بناتے ہوئے بولا۔
"شکایت...... شکایت تو ہمیں تم سے ہے۔" جواباً سنتوش بگڑتے ہوئے بولا۔
"سنتوش بھیا بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" ساکھشی نے سنتوش کا ساتھ دیا۔ ایک طرف کھڑی سرکھشنا ان کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔
"زبیر بیٹا بھوجن تو کرو......" سرکھشنا نے کہا۔
"آنٹی بھوک تو مجھے بہت لگی ہے پرنتو میں بھوجن گھر میں ہی کروں گا۔" زبیر نے کہا۔
"یہاں کرلوگے تو دیال انکل تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اس بات کی گارنٹی میں تمہیں دیتا ہوں۔" سنتوش نے کہا۔
"چلو...... تم تینوں کی بات مان لیتے ہیں۔" زبیر نے کہا۔ اور وہاں پڑی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ......" ابھی زبیر نے اتنا

ہی کہا تھا کہ سنتوش نے اسے ٹوکا۔

”میرے گاؤں کے سب سے پیارے انکل کہتے ہیں کہ بھوجن کے سمے کسی قسم کی باتیں نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر بھوجن کے بعد کرلیں گے۔“ رنبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ چاروں کھانے میں مصروف ہوگئے۔

”ہاں تو اب بتاؤ تم تینوں گھر کیوں بھاگ آئے۔“ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رنبیر نے پوچھا۔

”ہم بھاگ آئے یا تم؟...... ہم تینوں نے تمہاری یاد میں پورا اسکول چھان مارا...... اور تم ہو کہ ......کیوں سریش، ساکھشی ہم تینوں نے رنبیر کو ڈھونڈا تھا کہ نہیں۔“ سنتوش نے بتاتے ہوئے سریش اور ساکھشی کا ساتھ چاہا۔

”بالکل...... ہم نے تو رنبیر تمہیں کافی ڈھونڈا......“ ساکھشی اور سریش نے بیک زبان ہوکر کہا۔

”یار یا تو تم تینوں پاگل ہو یا میں پاگل ہوں۔“ رنبیر نے غصے سے کہا۔

”تم......“ وہ تینوں تیز لہجے میں چلائے تو بے اختیار رنبیر کی ہنسی نکل گئی۔

”چلو بھئی میں ہی ہار مان لیتا ہوں حالانکہ غلطی تم تینوں کی ہے۔“ رنبیر نے کہا تو وہ تینوں مسکرا دیئے۔

”انکل دیال تو آفس میں ہی ہوں گے نہ۔“ سنتوش نے رنبیر سے پوچھا۔

”ہوں......“ رنبیر نے مختصر سا جواب دیا۔

”تو ہم جائیں گے کیسے۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”پتا جی مجھے لینے کے لئے روزانہ گاڑی بھیجتے ہیں۔“ رنبیر فخریہ لہجے میں بولا۔

”ایک حیرانی والی بات بتاؤں۔“ رنبیر بولا۔

”کیا......“ ان تینوں نے پوچھا۔

سرکھشنا اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

”تمہاری طرح ڈرائیور کا بھی کہنا تھا کہ وہ مجھے کافی دیر ڈھونڈتا رہا جب وہ تھک ہار کر واپس گاڑی میں آیا تو میں گاڑی میں موجود تھا۔“ رنبیر نے واقعی حیرانگی والی بات بتائی تھی۔

”اب بتاؤ...... کیا تمہارا ڈرائیور بھی جھوٹا ہے۔“ سنتوش نے بظاہر جواب مانگا۔

”پپ...... پپ...... پتہ نہیں......“ رنبیر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

”پتہ نہیں......“ سنتوش رنبیر کے لہجے پر حیران ہوا۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو...... پتا جی کے آفس میں چلتے ہیں کہیں وہ راؤنڈ پر ہی نہ نکل جائیں۔“ رنبیر نے موضوع بدلتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔“ سنتوش نے اٹھتے ہوئے کہا وہ سرکھشنا کو بتا کر انسپکٹر دیال کے آفس پہنچے تو انسپکٹر دیال سنتوش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”ارے سنتوش تم...... کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا......“

”اپنے ہاتھوں کی انگلیاں دانتوں کے نیچے دبا کر دیکھ لیں۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا تو انسپکٹر دیال نے کرسی سے اٹھ کر سنتوش کو گلے سے لگالیا۔

”دیال انکل مجھے آپ سے شکایت ہے...... آپ مجھ سے ملے بغیر ہی آگئے۔“ انسپکٹر دیال نے بتایا۔

”بیٹا یہاں کیسے آنا ہوا۔“

”میرے ماما جی یہاں رہتے ہیں ان کے [illegible] پتا جی نے مجھے بھیج دیا ہے۔“ سنتوش نے بتایا۔

”پھر تو بیٹا خوب مزہ آئے گا اب دیکھو نا تم سے عجیب سا ناطہ بن گیا ہے آج نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم سے ضرور ملاقات ہوگی دیکھو تو تم سے ملاقات ہوگئی۔“ انسپکٹر دیال نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”انکل دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“ جوا[illegible] سنتوش بھی مسکرایا۔

”انکل اس کیس کا کیا بنا تھا جس کے متعلق میں نے اور رام نے آپ کو بتایا تھا۔“

”وہ کیس بیٹا ادھورا ہی رہ گیا...... اور وہ کیس

میری زندگی کا سب سے خوف ناک کیس تھا اس کیس میں، میں خود ڈر سا محسوس کرنے لگا تھا۔“ انسپکٹر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”انکل کیا آپ مجھے اس کیس کے متعلق کچھ بتائیں گے۔“ سنتوش نے پوچھا تو انسپکٹر دیال نے بتانا شروع کیا۔

”ہمارے گاؤں میں جو آدمی آئے تھے جن کے بارے میں تم نے اور رام نے ہمیں اطلاع دی تھی وہ دونوں آدمی واسع پور گاؤں کے سادھو رنگا کے چیلے تھے، اس گاؤں کے ٹھاکر کی پتنی کا دیہانت ہوگیا تھا وہ ٹھاکر اپنی پتنی سے بے انتہا پریم کرتا تھا وہ رنگا کے پاس پہنچ گیا اس نے رنگا کی کافی دھوم سن تھی اس نے رنگا سے کہا کہ وہ اس کی پتنی کو زندہ کردے تو وہ اسے منہ مانگا انعام دے گا رنگا نے حامی بھرلی ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ٹھاکر کی پتنی کی مرتیو دل کی حرکت بند ہونے کے کارن ہوئی ہے اس نے اپنے گاؤں سے دو معصوم بچے ڈھونڈے جن کے دل نکالنے تھے رنگا کو واسع پور گاؤں سے ایک بچہ تو اپنے مطلب کا مل گیا پرنتو ایک بچہ نہ ملا اسے اپنی شکتیوں سے پتہ چلا کہ دوسرا بچہ ہمارے گاؤں میں مل سکتا ہے اس نے اپنے خاص چیلوں کو ہمارے گاؤں کی طرف بھیج دیا اب ان کی بدقسمتی تم نے ان کی باتیں سن لیں اور مجھے بتادیا۔“

”رات کے سمے میں نے ان دونوں چیلوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا مار پیٹ کے بعد انہوں نے مجھے ساری حقیقت سے آگاہ کردیا میں سمے پر واسع پور گاؤں پہنچ گیا اور میں نے دوسرے بچے کی جان بھی بچالی سادھو اور ٹھاکر کو بھی میں نے گرفتار کرلیا پرنتو حیرت کی بات ہے وہ اور ٹھاکر اسی رات نجانے حوالات سے کہاں غائب ہوگئے سادھو نے اپنے چیلوں کو بڑی درد ناک موت دی۔“

”ایسی باتیں یا تو میں قصے کہانیوں میں پڑھتا تھا یا فلموں میں دیکھتا تھا، مگر مجھے وشواس نہیں ہو رہا کہ رئیل لائف میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔“ انسپکٹر دیال نے تفصیلاً ساری بات بتائی۔

”انکل یہ قصے کہانیاں فلمیں معاشرتی کرداروں سے ہی تو جنم لیتیں ہیں۔“ سنتوش نے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے بیٹا ایسا ہی ہے۔“ انسپکٹر دیال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے انکل اب ہم چلتے ہیں۔“ سنتوش نے اجازت چاہی۔

”ارے بیٹا ایسے کیسے کچھ بھوجن وغیرہ تو ہوجائے۔“ انسپکٹر دیال نے کہا۔

”نہیں انکل...... بھوجن تو ہم گھر سے ہی کر کے آئے ہیں اور ہو بھی ٹھیک ٹھاک اس بات کا ڈنس رنبیر ہے۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے رنبیر کی طرف اشارہ کیا۔

”جی پتا جی سنتوش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رنبیر نے سنتوش کے بیان کی تصدیق کردی۔

”ٹھیک ہے پھر میرا ڈرائیور تمہیں ڈراپ کردیتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر دیال نے ٹیبل پر پڑی بیل بجادی۔

☆......☆......☆

8 سال بعد

”کچھ کھاؤ گی۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

”ہاں کچھ لے آؤ۔“ لڑکی نے کہا تو لڑکے نے گاڑی کا رخ پیٹرول پمپ کی طرف کردیا رات کی سیاہ چادر نے ہر سو ڈیرا جمایا ہوا تھا لڑکے نے کار ایک طرف روک کر کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا وہ کار کا [illegible] کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا کار میں بیٹھنے کے بعد اس نے شاپر بیگ لڑکی کو پکڑا دیا جس میں سینڈوچز، بسکٹ، چپس اور کولڈ ڈرنکس تھیں لڑکے نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس کی اور گھما کر روڈ پر لے آیا۔

”تم نے اپنے پتا جی سے بات کی۔“ لڑکی نے

لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کی تو تھی۔'' لڑکی نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''تو پھر......'' لڑکے کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

''پھر کیا......''

''مان گئے۔'' لڑکی نے سینڈوچ کے اوپر چڑھا کورا اتارتے ہوئے کہا۔

''یا ہو...... یہ ہوئی نہ بات۔'' لڑکا چہکتے ہوئے بولا۔

''ہم اس جگہ پر ایک عالی شان ہوٹل بنوائیں گے جس کا نام چھایا ہوٹل ہوگا۔''

''مسکا لگا رہے ہو مجھے۔'' لڑکی مصنوعی غصے سے بولی۔

''مسکا...... میری جان میری ہر چیز تمہارے نام ہی تو ہے۔'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پا نے وہ جگہ تمہیں مفت دینے کے لئے کہا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''نہیں...... خیر میں وہ جگہ مفت تو نہیں لوں گا تمہارے پا کو اس جگہ کی قیمت دوگنی دوں گا آفٹر آل وہ میرے سسر جی ہیں۔'' لڑکے نے کہا تو لڑکی جس کا نام چھایا تھا ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''تمہارے باباجی اچھے انسان تھے جن کا آج دیہانت ہوگیا۔'' لڑکا دکھی لہجے میں بولا۔

''اسی لئے تم مجھے آج ہی واپس لے آئے۔'' چھایا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''تم تو جانتی ہو چھایا کہ میں تمہارے بنا ایک پل بھی نہیں گزار سکتا اور صبح ایک امپورٹنٹ میٹنگ بھی ہے۔'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ چھایا کوئی جواب دیتی اچانک کار کی ونڈ اسکرین پر کوئی بھاری چیز آگری چھایا کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور لڑکے نے بوکھلاتے ہوئے تیزی سے بریک پر پاؤں رکھے اور گاڑی چیختی ہوئی سڑک کے بیچوں بیچ گھوم گئی گاڑی کی ونڈ اسکرین اب مکڑی کے جالے کی سی شکل اختیار کرگئی تھی۔

''سک...... سک...... کیا ہوا سنیل۔'' چھایا بوکھلاتے ہوئے بولی۔

''لل...... لل...... لگتا ہے کوئی چیز کار سے ٹکرا گئی ہے۔'' سنیل دھڑکتے دل کے ساتھ بولا۔

''مم...... مم...... میں اتر کر دیکھتا ہوں۔''

''نن...... نہیں...... سنیل۔'' چھایا تیزی سے بولی۔

''مم...... مم...... مم...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''چھایا اب دیکھنا تو ہے نہ...... شاید کوئی گھائل ہوا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے سنیل کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا کافی پیچھے سڑک کے کنارے کالے رنگ کی کوئی بڑی سی چیز پڑی ہوئی تھی۔

''ہیں یہ کیا......'' سنیل پریشانی سے بڑبڑایا۔

''لگتا ہے کوئی جانور ہے۔''

''سنیل کون ہے۔'' چھایا گاڑی کے اندر سے چلائی سنیل دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے کوئی جانور تھا۔'' سنیل نے گاڑی اسٹارٹ کرکے گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ اسکرین......'' چھایا نے ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ اب شہر میں جاکر صبح کے سے ہی تبدیل کروائی جاسکتی ہے۔'' سنیل نے کہا اسی وقت کار کی چھت پر کوئی چیز زوردار انداز میں آگری سنیل نے بوکھلاہٹ میں تیزی سے بریک پر پاؤں رکھ دیئے اور کار ایک مرتبہ پھر چیختے ہوئے سڑک کے بیچوں بیچ گھوم گئی کالے رنگ کی کوئی بڑی سی چیز بونٹ سے ہوتی ہوئی سامنے جھاڑیوں میں جاگری نے دیکھ کر چھایا کی زوردار چیخ نکل گئی۔

''یہ...... یہ کیا تھا۔ سس...... سنیل......'' چھایا بوکھلاتے ہوئے بولی۔

''مم...... میرے خیال میں تو......'' سنیل کی بات درمیان میں ہی رہ گئی وہ کالے رنگ کی چیز اچانک جھاڑیوں سے نکلی اور اچھل کر کار پر آگری خوف کے باعث چھایا کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں سنیل کو کچھ اور تو نہ سوجھا اس نے گاڑی تیزی سے ریورس کی اور سیدھی کرکے گیئر لگا کر گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی اس چیز کو دیکھ کر چھایا بار بار چیخ رہی تھی ایک مرتبہ پھر سنیل نے زوردار انداز میں بریک پر پاؤں مارے ایک مرتبہ پھر وہ چیز سڑک پر جاگری سڑک پر گرتے ہی وہ چیز تیزی سے اٹھ کر سڑک کے بیچ کھڑی ہوگئی سنیل نے گیئر لگا کر گاڑی اسپیڈ سے اس چیز کی طرف بڑھادی اس سے پہلے کہ تیز رفتار گاڑی اس چیز کو کچلتی ہوئی آگے بڑھتی گاڑی کے قریب آنے پر وہ چیز فضاء میں اچھلی اور ہوا میں ہی گھوم کر کار کی چھت پر آگری ایک مرتبہ پھر چھایا نے چیخنا شروع کردیا چھت پر بیٹھی اس خوف ناک چیز نے زوردار انداز میں اپنا ہاتھ گاڑی کی چھت پر دے مارا اور سنیل نے بوکھلاہٹ میں گاڑی کا اسٹیرنگ جھاڑیوں کی طرف گھمادیا تیز رفتار گاڑی جھاڑیوں میں اتر کر ایک درخت سے زوردار انداز میں جاٹکرائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنیل کا سر اسٹیرنگ سے جاٹکرایا اور چھایا گاڑی کی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی گاڑی سے باہر جاگری۔

☆......☆......☆

''میں کالج کے ان دنوں کو بڑا مس کروں گا۔'' سریش ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

''تو اس میں اتنی چنتا کرنے کی کیا ضرورت ہے تم اس سال فیل ہوجاؤ اگلے سال تم اپنے ان کلاس فیلو سے بھی یہی کہہ رہے ہوگے۔'' میں کالج کے ان دنوں کو بڑا مس کروں گا۔'' زبیر نے سریش کی ٹانگ کھینچی تو وہاں کھڑے اس کے سارے دوست قہقہے لگانے لگے۔

''اگر اتنا ہی پیار ہے تمہیں اس کالج سے تو ہر سال فیل ہوجایا کرو۔'' ایک طرف کھڑے جمی نے کہا تو ایک مرتبہ پھر سریش کو قہقہوں کی بارش سننا پڑی۔

''بس...... بس اب کوئی بھی میرے بھائی کی انسلٹ نہیں کرے گا۔'' ساکھشی نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بس...... بس اب کوئی بھی میرے بھائی کی انسلٹ نہیں کرے گا۔'' جمی نے ساکھشی کی طرح اپنا دایاں ہاتھ اسی کے انداز میں بلند کرتے ہوئے منہ بگاڑتے ہوئے کہا تو ایک مرتبہ پھر سب ہنسنے لگے۔

''بھائی کی چمچی جب کوئی ہماری انسلٹ کرتا ہے تو بڑے دانت نکالتی ہے۔''

''دانت تم جیسے گدھے نکالتے ہیں بےوقوف۔'' ساکھشی نے تیز لہجے میں کہا۔

''تو اب تم جمی کو گدھا کہہ رہی ہو کل تم اسے بندر کہہ رہی تھیں۔'' ایک طرف کھڑی کاویری نے کہا تو سب کے ساتھ مل کر ساکھشی بھی قہقہے لگانے لگی اسی وقت ایک نوجوان خوب صورت لڑکا ان کے پاس سے گزر گیا۔

''اے رحیم......'' جمی نے اس خوبصورت لڑکے رحیم کو آواز دی تو وہ لڑکا جمی کے قریب آگیا۔

''جی فرمایئے۔'' رحیم نے مسکراتے ہوئے کہا مسکان اس کے چہرے پر بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

''تم کل کاویری کو کیوں گھور رہے تھے۔'' جمی دانت پیستے ہوئے بولا۔

کاویری حیرانگی سے جمی کی طرف دیکھنے لگی۔

''جی میں......'' رحیم حیران ہوا۔ ''نہیں میں نے تو نہیں گھورا''

''میں نے تمہیں خود دیکھا تھا۔'' جمی کا لہجہ مضبوط تھا۔

''شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' رحیم بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے...... جمی...... تم نے رحیم کو کس کارن روکا ہوا ہے۔'' سنتوش نے جمی کے قریب آتے

ہوئے پوچھا۔

”میں نے......“ جمی حیران ہوا۔

”یہ تو خود یہاں آیا تھا۔“

”کیا مطلب......“ سنتوش حیران ہوا۔

رحیم کے چہرے پر بھی اب حیرانی تھی۔

”یہ کہہ رہا تھا کہ میں آپ لوگوں کے گروپ میں آنا چاہتا ہوں میں نے صاف انکار کردیا...... کیونکہ یہ ہمارے دھرم کا نہیں ہے۔“ آخری جملہ بولتے ہوئے جمی نے ایک مرتبہ پھر دانت پیسے۔

”جمی میں نے تو تم سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور جمہیں نے تو مجھے بلایا تھا۔“ رحیم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”کیوں بھئی ...... کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ جمی نے گھوم کر سب سے تصدیق چاہی۔ جواباً رحیم مسکرا دیا۔

”جھوٹ بولنے والے کی ہاں میں ہاں ملانا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔“ رحیم نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تو کیا تمہارا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ جمی کی آنکھوں میں خون اتر آیا ساتھ ہی وہ غصے کے انداز میں رحیم کی طرف بڑھا۔

”جمی یہ کیا بے وقوفی ہے ہر سمے لڑنے کے موڈ میں ہی رہتے ہو...... جمی تم جاؤ۔“ سنتوش نے پہلے جمی اور پھر رحیم سے کہا رحیم نے ایک گہری نگاہ جمی پر ڈالی اور پھر ایک طرف بڑھ گیا۔

”اگر تم بیچ میں نہ پڑتے تو آج میں اسے اچھا سبق سکھاتا۔“ جمی نے شکایتی لہجے میں سنتوش سے کہا۔

”یار تو ہر سمے اس سے لڑنے کی ترکیبیں نکالتا رہتا ہے وہ تجھے کچھ کہتا ہے۔“ سنتوش نے کہا۔

”بس مجھے وہ پسند نہیں......“ جمی نے غصے سے کہا۔

”پسند نہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس سے لڑا جائے پسند تو تجھے اپنے پرنسپل بھی نہیں ان سے پنگا لے تو۔“ سنتوش کی اس بات پر سب مسکرا دیئے۔

”وہ ہیں تو میرے دھرم کے۔“ جمی نے کہا۔

”اب دھرم بیچ میں کہاں سے آگیا ساری دنیا اور انسانوں کو بنانے والا تو ایک ہی ہے نہ۔“ سنتوش نے کہا۔

”نہیں ہمارا بھگوان اور ہے ان کا اللہ الگ ہے......“ جمی نے کہا۔

”نہیں جمی...... یہ بات بالکل غلط ہے بھگوان یا اللہ صرف ایک ہے...... صرف ایک ہستی ہے جو دھرتی اور آکاش کے نظام کو چلا رہا ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے صرف مختلف دھرموں کے لوگ اسے الگ ناموں سے پکارتے ہیں کوئی اسے گوڈ (God) کہتا ہے کوئی اسے ایشور یا بھگوان کہتا ہے یا کوئی اللہ۔ پرنتو وہ مختلف سے پکارنے سے بھی رہے گا ایک ہی۔“ سنتوش نے کہا۔

”تیرے ساتھ کون بحث کرے...... ہر سوال کا جواب ہوتا ہے تیرے پاس۔ بھی اس رحیم سے بھی ٹکر لو تو مانوں۔“ جمی نے کہا۔

”وہ کوئی غلط بات کہے تو میں اس سے ٹکر لوں۔ مجھے پکا وشواس ہے تم ہی نے اسے بلایا ہوگا کیونکہ اشارہ وہ کہہ گیا تھا کہ تمہارے یہ سب بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔“ سنتوش نے کہا تو وہ سب سنتوش سے نظریں چرانے لگے۔

”یعنی تیری نظر میں وہ اچھا ہے۔“ جمی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”بات اچھے یا برے کی نہیں ہے بات سچ کی ہے۔“ سنتوش نے کہا۔

”اب تجھے معلوم ہی ہے کہ منوج اچھا بھلا دھرم پرش تھا وہ بھی کمینا مسلمان ہوگیا ہے۔“ جمی نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

”تو رحیم نے کون سا اسے خنجر کی نوک پر مسلمان بنایا تھا وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوا تھا اگر تو چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان بھی ہمارے دھرم میں شامل ہو تو تو بھی

سب سے اسی طرح مل جس طرح رحیم سب سے ملتا ہے۔“ سنتوش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا ہر سمے گدھے کی طرح مسکرانا آہستہ آواز میں بات کرنا اچھوتوں کی مدد کرنا......“ جمی اکڑ کر بولا۔

”بس یہی فرق ہے تجھ میں اور رحیم میں حالانکہ کسی سے مسکرا کر ملنا بری بات تو نہیں کسی کی مدد کرنا بری بات تو نہیں پریم اور نرم لہجے میں بات کرنا بری بات تو نہیں، دنیا میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا بادشاہ ہو یا غریب سب برابر ہیں سب ایک ہی طرح کی مٹی سے بنے ہیں۔“ سنتوش نے کہا۔

”ہے رام...... اس سے تو بحث کرنا فضول ہے۔“ جمی اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اچھا بھائی آپس میں بحث تو بہت ہوگئی اب ذرا کچھ سکھشا کا کام بھی ہو جائے جس کے کارن ہم کالج میں آتے ہیں۔“ ساکھشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ سب اپنی اپنی سواریوں کی طرف بڑھے۔

”سریش تم اور ساکھشی گھر جاؤ میں دیال انکل سے ملنے جا رہا ہوں۔“ سنتوش اپنی بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اوکے......“ سریش نے اثبات میں سر ہلایا۔ سنتوش تھانے پہنچا تو انسپکٹر دیال وہیں موجود تھا۔

”کیسے ہو سنتوش بیٹا۔“ انسپکٹر دیال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بس انکل۔ ٹھیک ہوں آپ سنائیں......“ سنتوش نے بتاتے ہوئے پوچھا۔

”بھگوان کی کرپا ہے بیٹا۔“ انسپکٹر دیال نے جواب دیا۔

”انکل لگتا ہے آج کہیں گئے نہیں آپ۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”بس جانے ہی والا تھا کہ تم آگئے۔“ انسپکٹر دیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر تو میں گھر جاتا ہوں۔“ سنتوش نے کہا۔

”ارے نہیں نہیں...... بتانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم واپس چلے جاؤ بلکہ تم بھی ساتھ چلو میں بس دیا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کر رہا تھا۔“ انسپکٹر دیال نے بتایا۔

”بڑا دکھ ہے انکل دیا کی موت پر نجانے کس ظالم نے اس کی ہتھیا کی۔“ سنتوش افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”یہ کام تو تمہارے کالج میں سے ہی کسی کا ہے۔“ انسپکٹر دیال نے کہا۔

”لگتا تو یہی ہے پرنتو وہ کون ہوسکتا ہے۔“ سنتوش نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یہ تو انوسٹی گیشن کے بعد ہی پتہ چلے گا۔“ انسپکٹر دیال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”انکل جی میرے خیال سے اگر آپ عبداللہ سے ملیں تو بات بن سکتی ہے۔“ سنتوش نے خدشہ ظاہر کیا۔

”کیونکہ وہ دیا کا بیسٹ فرینڈ تھا۔“

”عبداللہ وہی جو پہلے منوج تھا اور مسلمان ہوگیا تھا۔“ انسپکٹر دیال نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں وہی......“ سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے پھر تم بھی ساتھ چلو۔“ انسپکٹر دیال نے کہا تو سنتوش بھی اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں جیپ میں آکر بیٹھے...... ”ویسے یہ عبداللہ مسلمان کیسے ہوا تھا......“ انسپکٹر دیال نے پوچھا۔

”انکل جی یہ تو وہی جانے۔ پرنتو مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے بہت نفرت کرتا تھا۔“

”مسلمان کیسے ہوا یہ یا تو اوپر والا جانے یا عبداللہ۔“ سنتوش نے کہا۔

"چلو انوسٹی گیشن کے دوران اس کے مسلمان ہونے کی کہانی بھی سن لیں گیں۔" انسپکٹر دیال نے کہا۔

وہ دونوں عبداللہ کے گھر پہنچے تو ایک مسکراہٹ کے ساتھ عبداللہ نے ان کا استقبال کیا۔

عبداللہ کا گھر صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔

"یہ کیا عبداللہ تمہارا مکان تو کافی بڑا تھا اور تھا بھی کہیں اور...... یہ کیا ماجرا ہے۔" سنتوش نے کے لہجے میں حیرانگی شامل تھی۔

سنتوش کی اس بات پر عبداللہ مسکرا دیا۔

"پہلے کی دولت میری اپنی نہیں تھی اب جو ہے وہ میرا اپنا ہے میرے ہاتھ کی کمائی ہے پہلے والا مکان اور گاڑی فروخت کر کے میں نے سب کچھ فروخت کر کے خیرات کر دیا میری ماں کے پاس کچھ زیور تھا جسے بیچ کر میں نے یہ مکان خرید لیا اور اب دن کے وقت میں کالج جاتا ہوں اور کالج سے فارغ ہونے کے بعد جاب کرتا ہوں۔" عبداللہ نے بتایا۔

"اتنی ساری جائیداد تم نے غریبوں میں بانٹ دی۔" انسپکٹر دیال کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

سنتوش بھی کم حیران نہ تھا۔

"وہ ساری پراپرٹی میرے باپ نے حرام کے پیسوں سے بنائی تھی جب میں اپنی اصل منزل پر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ پہلے تو میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن پھر مجھ پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور مجھے اس اندھیرے سے باہر نکلنے کی راہ نظر آ گئی میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور اس راہ پر چل پڑا اور میرے اردگرد اجالا ہی اجالا ہو گیا اندھیرے کے تمام سیاہ بادل چھٹنے لگے۔" عبداللہ نے بتایا۔

"کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو عبداللہ کہ تم نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا۔" انسپکٹر دیال نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے دھرم چھوڑا نہیں انسپکٹر صاحب بلکہ اصل مذہب میں داخل ہوا ہوں یہ ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہمیں زندگی سے لے کر موت تک کا سارا سفر معلوم پڑتا ہے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کانٹوں والا سفر کدھر ہے اور پھولوں والا راستہ کدھر ہے یہ ایک مکمل مذہب ہے انسپکٹر صاحب جو ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا بنانے والا ایک ہے انسانوں کو بنانے والا ایک ہے ہر چیز کو بنانے والا صرف ایک اللہ ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔

"تمہاری اس بات کو تو میں بھی مانتا ہوں۔" سنتوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم مسلمان کیسے ہوئے۔" انسپکٹر دیال نے عبداللہ کو دوبارہ موضوع کی طرف کھینچا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب میں بتاتا ہوں اس دن میری ماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے کہا ماں کی حالت بہت خراب ہے اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑے گا اسپتال لے کر گئے تو وہاں ماں کے لئے خون کی اشد ضرورت پڑ گئی ڈاکٹر نے خون کا گروپ بتایا تو مجھے یاد آیا کہ جمی کے خون کا گروپ بھی وہی ہے جو میری ماں کے خون کا ہے میں نے جمی سے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا میں حیران رہ گیا مجھے جمی سے یہ امید نہ تھی ادھر ماں کی حالت کافی خراب تھی میں پریشان سا کالج میں پہنچا ہر دوست سے پوچھا مگر کسی کے خون کا گروپ ماں کے خون کے گروپ سے نہیں ملتا تھا جمی بھی کالج میں موجود تھا نہ میں نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے مجھ سے کوئی بات کی۔

"میں اس وقت پریشان سا آنکھیں بند کئے کینٹین میں بیٹھا ہوا تھا اور جمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کیا بات ہے منوج کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" ایک نرم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں...... پریشان تو میں ہوں۔" میں آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

"کیا پریشانی ہے......" وہی نرم آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میری ماں جی کی حالت کافی خراب ہے انہیں خون کی ضرورت ہے اور جمی کا خون ان کے خون کے گروپ سے مِل کھاتا ہے۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر تم جمی سے بات کرو۔" مجھ سے کہا گیا۔

"کی تھی پرنتو......" میں دکھ کے عالم میں رکا۔

"لیکن کیا......" مجھ سے پوچھا گیا۔

"اس نے صاف انکار کر دیا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جمی تو تمہارا بیسٹ فرینڈ ہے۔" آواز میں حیرانگی شامل تھی۔

"ہوں...... بدقسمتی سے میں بھی سمجھا تھا۔" میرے لہجے میں دکھ کا عنصر شامل تھا۔

"تمہاری ماں کے خون کا گروپ کیا ہے۔" پوچھا گیا تو میں نے بتا دیا۔

"اوپر والے پر بھروسہ رکھو وہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

"لیکن آپ ہیں کون۔" اتنا کہتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہاں کوئی نہیں تھا میں حیرانگی سے اردگرد دیکھنے لگا۔

شاید میرا وہم تھا...... میں بڑبڑایا کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں اسپتال پہنچا تو ڈاکٹر مجھ پر برس پڑا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم...... پتہ ہے تمہاری ماں کی حالت کتنی خراب ہو گئی تھی۔"

"ڈاکٹر صاحب میری ماں۔" اتنا کہتے ہوئے میں رو پڑا۔

"ارے...... ارے چنتیت کیوں ہو رہے ہو۔" وہ تو شکر ہے کہ تمہارا دوست آ گیا اس کے خون کا گروپ، تمہاری ماں کے خون کے گروپ سے ملتا تھا۔ اس کا خون لگنے سے تمہاری ماں کی حالت اب کافی بہتر ہے۔" ڈاکٹر نے پہلے گھبراتے ہوئے اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ...... وہ جمی ہے نہ۔" خوشی کے باعث میرے منہ سے نکلا۔

"نام تو مجھے اس کا معلوم نہیں کیونکہ اس سے بہت ایمرجنسی تھی اس لئے میں نے نام نہیں پوچھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ جمی ہی ہوگا۔"

"کک...... کہاں ہے وہ......" میں نے پریقین لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وہ تمہاری ماتا جی کے روم میں ہی بیٹھا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا تو میں تیزی سے اپنی ماں کے کمرے کی طرف بڑھا میں اندر داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا اندر بیٹھے شخص کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا وہ وہی شخص تھا جس سے میں بے انتہا نفرت کرتا تھا۔

یعنی رحیم...... رر...... رحیم...... تت...... تم......

"میں نے ہکلاتے ہوئے کہا تو رحیم پہلے چونکا اور پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آؤ منوج...... اب تمہاری ماں خطرے سے بالکل خالی ہے۔"

میں بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"تت...... تت...... تم نے میری ماتا جی کو خون دیا۔" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے ہی تمہاری ماں کو خون دیا ہے تم بھول بھی گئے صبح جب تم کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے تمہیں پریشان دیکھا تو تم سے پریشانی کی وجہ پوچھ لی میرے خون کا گروپ تمہاری ماں کے خون کے گروپ سے ملتا تھا اسی لئے میں نے تمہاری ماں کو خون دیا میرے خون کے چند قطروں سے تمہاری ماں کی زندگی بچ گئی مجھے اور کیا چاہئے۔" رحیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر...... پرنتو تم تو اور دھرم......" ابھی میری بات جاری تھی کہ رحیم نے مجھے بیچ میں ٹوکا۔

"اس میں دھرم، مذہب والی تو بات ہی نہیں اور اگر دھرم کی بات کرتے ہو تو ہمارا مذہب اسلام بھی اجازت دیتا ہے کہ ہر ایک کی مدد کرو چاہے وہ کسی بھی دھرم یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو اسلام ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہر ایک کی مدد کرو کیونکہ سب انسان ایک اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اللہ ہی ہے جو مشکل وقت

اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے ے کی مدد دھرم یا مذہب دیکھ کر نہیں کرتا تو وہی اللہ ہم انیت پر بھی خاص کر اس کے نبی حضرت محمدؐ کی امت بھی یہی تاکید کرتا ہے کہ سب کی مدد کرو چاہے وہ فقیر چاہے بادشاہ گورا ہو یا کالا مذہب والا ہو یا غیر ہب۔" رحیم نے مجھے آگاہ کیا ایک حیران کن سچائی ے......

"مم...... مم...... مجھے معاف کر دو رحیم میں تم سے نفرت کرتا رہا اور تم...... اتنا کہہ کر میں رحیم کے رموں میں گر پڑا۔

"ارے...... ارے...... اٹھو۔" اس کے آگے بھکو جس نے تمہاری مدد کی ہے میری کیا اوقات ہے۔" رحیم نے جلدی سے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بس انسپکٹر صاحب یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے میں الحمدللہ مسلمان ہو گیا۔" یہاں تک کہہ کر عبداللہ خاموش ہو گیا۔

"ہوں......" یہ تو رحیم نے واقعی بہت اچھا کام کیا اس کی بات بالکل صحیح ہے کسی کی مدد دھرم دیکھ کر نہیں کرنی چاہئے۔" انسپکٹر دیال متاثر ہوتے ہوئے بولا۔

خون دینے کے بعد رحیم نے مجھے قرآنی آیتوں کو سکھا دیا جس سے میری ماں جلد ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔

عبداللہ نے مزید بتایا۔ جمی بھی اسی کارن تم سے نفرت کرتا ہے۔ سنتوش نے پوچھا۔

"ہاں......" عبداللہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"شاید میری طرح اللہ جمی پر بھی کرم کر دے۔"

عبداللہ ہم دیا کے کیس کے کارن تم سے ملنے آئے ہیں کیا اس سلسلے میں تم ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو کیونکہ دیا تمہارا کلوز فرینڈ تھا۔" انسپکٹر دیال اصل موضوع کی طرف آیا۔

"دیا......" عبداللہ کے منہ سے نکلا۔

"انسپکٹر صاحب مجھ سے بہتر آپ کو اس کے بارے میں کاویری بتا سکتی ہے۔" عبداللہ نے عجیب بات کہی۔

"کاویری...... کیا مطلب......" سنتوش حیران ہوا۔

"ہاں سنتوش...... کاویری......" عبداللہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"دیا من ہی من میں کاویری سے پریم کرتا تھا اور پھر اس نے ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کاویری سے کہہ بھی دیا تھا کہ لیکن کاویری نے غصے میں آ کر اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"ہوں...... کوئی اور بات جو تم بتا سکو۔" انسپکٹر دیال نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" عبداللہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر عبداللہ ہم چلتے ہیں...... اگر ضرورت پڑی تو تمہیں پھر یاد کریں گے۔" انسپکٹر دیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور......" عبداللہ نے انسپکٹر دیال اور سنتوش سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا دونوں عبداللہ کے گھر سے باہر نکل آئے۔

"تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے سنتوش۔" انسپکٹر دیال نے سنتوش سے پوچھا۔

"مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا انکل کہ دیا کاویری سے پریم کرتا تھا۔" سنتوش نے کہا۔

"مجھے وشواس ہے سنتوش کاویری سے ضرور کچھ کام کی بات معلوم ہو گی۔" انسپکٹر دیال نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"ہاں...... ہو سکتا ہے۔" سنتوش نے جوا اثبات میں سر ہلایا۔

☆......☆......☆

"میں اس عبداللہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" کاویری غصے سے بولی۔

"کیوں کیا ہوا......" جمی حیرت سے بولا۔

"عبداللہ انسپکٹر دیال سے کہہ رہا تھا کہ دیا کی ہتھیا میں میرا ہاتھ ہے...... کیا؟" جمی غصے سے چلایا۔

"میں اس کمینے کا خون پی جاؤں گا۔" وہ اٹھنے لگا تو کاویری نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی کوئی فائدہ نہیں یقیناً اس نے انسپکٹر دیال کو تمہارے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ بتایا ہو گا اگر تم نے کچھ عبداللہ کو کہا تو پولیس کا سارا شک تم پر جائے گا۔" کاویری نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" جمی کا غصہ ابھی بھی عروج پر تھا۔

"سمے کے چکر کو سمجھا کرو میری جان ایسے موقعوں پر عقل سے کام لیا جاتا ہے۔" کاویری نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

"تمہارا یہ پریم ہی تو ہے جس کے کارن میں چپ رہتا ہوں۔" جمی نے مسکراتے ہوئے کہا تو کاویری بھی مسکرا دی۔

"ویسے ایک بات پوچھوں جمی۔" کاویری نے غور سے جمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پوچھو......" جمی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کہیں دیا کی ہتھیا میں تمہارا ہاتھ تو نہیں۔" کاویری نے عجیب سوال پوچھا۔

"کک...... نن...... نہیں تو۔" جمی یکدم گھبرا گیا۔

"تو پھر تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔" کاویری نے شکی سی نظروں سے جمی کی طرف دیکھا۔

"مم...... میں کہاں گھبرا رہا ہوں۔" جمی زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگا شاید تم گھبرا گئے ہو۔" کاویری نے بدستور جمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو...... مم...... میں بھلا کیوں گھبرانے لگا۔" جمی تیز لہجے میں ہکلایا۔

"ویسے سوچنے والی بات یہ ہے کہ دیا کی ہتھیا آخر کی کس نے۔" کاویری نے جمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... سوال تو کافی الجھا ہوا ہے۔" جمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ آج رات کلب جا رہے ہو کہ نہیں۔" کاویری نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں......" جمی نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں......" کاویری نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مجھے ایک ضروری کام ہے۔" جمی کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"ضروری کام......" کاویری مزید حیران ہوئی۔

"ایسا کون سا ضروری کام ہے جو تم مجھے نہیں بتا سکتے۔"

"نہیں میری جان یہ بات نہیں ہے۔" جمی مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کیا بات ہے۔" کاویری نے منہ بنایا۔

"ارے ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ اس کام سے فارغ ہونے کے فوری بعد میں کلب میں آ جاؤں گا۔" جمی بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

"ویسے کام کیا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے۔" کاویری نے پوچھا۔

"ضرور بتاؤں گا پرنتو کام ہونے کے بعد۔" جمی نے کہا۔

"اوکے...... جیسے تمہاری مرضی...... چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔" کاویری نے کہا تو جمی مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کیسے ہو گیا۔" سنتوش کے منہ سے افسوس زدہ لہجے میں نکلا۔

"تمہیں اس میں افسوس کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔" جواباً جمی حیران ہوا۔

"پرنتو...... عبداللہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"ارے بھئی اسے افسوس ہوا ہو گا کہ اس نے اسے دھرم سے پھیر دیا اس لئے اپنے پاپوں کا پراچیت کر لیا ہو گا۔" جمی نفرت انگیز لہجہ میں بولا۔

''دھرم والی بات اس میں کہاں سے آ گئی......''سنتوش کو غصہ آ گیا۔

''تو اور کیا کارن ہو سکتا ہے بھلا۔'' جمی نے بظاہر سنتوش سے جواب مانگا۔

''میرے خیال سے تو عبداللہ نے یہ خون ہی نہیں کیا۔'' سنتوش نے کہا۔

''میری جان سنتوش...... جس خنجر سے یہ خون ہوا ہے اس پر عبداللہ کی انگلیوں کے نشان ہیں۔'' جمی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ارے عبداللہ کا تو دھرم ہی نہیں ہے۔'' رام رام، کاویری نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھا سنتوش بھیا میں سوچ تھا تو ٹھیک تھا عبداللہ بنتے ہی ہتھیا کر دی۔'' ساکھشی نے کہا۔

''بے وقوفانہ باتیں مت کرو ساکھشی میرے خیال میں اس ہتھیا میں دھرم یا مذہب کا کوئی دخل نہیں۔'' سنتوش سخت لہجے میں بولا۔

''اور کس چیز کا تعلق ہو سکتا ہے بھلا اس نے اس کی ہتھیا کی ہے جس نے اسے دھرم سے پھیرا تھا یعنی رحیم کا۔'' سریش نے کہا۔

''نہیں سریش جب تک انوسٹی گیشن نہیں ہو جاتی تب تک ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' سنتوش نے نفی میں سر ہلایا۔

''انویسٹی گیشن تو ہو چکی ہے سنتوش...... پتا جی بتا رہے تھے خنجر پر عبداللہ کی انگلیوں کے نشان ہیں گھر کا پچھلا دوازہ جو باہر کی طرف کھلتا ہے اس کے ہینڈل پر عبداللہ کی انگلیوں کے نشان ہیں جس سے پتا جی نے عبداللہ کو گرفتار کیا وہ اس سے رحیم کی ہتھیا کر رہا تھا۔'' اس دفعہ رنبیر نے کہا۔

''ہوں......''سنتوش نے ایک گہری سانس کھینچی۔

''ٹھیک ہے کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں دیال انکل سے ملتا ہوں۔''

کالج سے فارغ ہونے کے بعد سنتوش پولیس اسٹیشن پہنچا اس نے سب سے پہلے عبداللہ سے ملاقات کی۔

''یہ کیا عبداللہ تم نے اپنے محسن کی ہتھیا کر دی۔'' سنتوش نے عبداللہ سے پوچھا۔ جو سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔

''اسی کارن لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔''

عبداللہ مسکرایا اور بولا۔ ''لوگوں کا تو کام یہی ہے سنتوش بھائی مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے وہ ضرور مجھ پر رحم کرے گا۔''

''کیا مطلب......؟'' سنتوش حیران ہوا۔

''میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔''

''رحیم کا قتل میں نے نہیں کیا......'' عبداللہ نے عجیب بات بتائی۔

''کیا......'' سنتوش کا انداز چلانے والا تھا۔

''پرنتو تمام ثبوت تمہارے خلاف ہیں۔''

''کبھی کبھی جو نظر آتا ہے سنتوش ویسا ہوتا نہیں لیکن جب نگاہوں کے سامنے سے دھند چھٹتی ہے تو ہر طرف موسم صاف ہو جاتا ہے اور ساری باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا عبداللہ تم سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہو اور بات بات پر مسکرا رہے ہو۔'' سنتوش کے لہجے میں حیرانگی شامل تھی۔ ''میں تب ڈروں جب میں نے کوئی جرم کیا ہو...... دکھ تو مجھے رحیم کی موت پر ہے باقی رہی میری بات تو انشاء اللہ جلد میرا اللہ مجھ پر رحم کرے گا اور میں سلاخوں کے باہر ہوں گا۔'' عبداللہ پر یقین لہجے میں بولا۔

''مجھے بھی وشواس تھا عبداللہ کہ تم نردوش ہو اور اب تم سے ملنے کے بعد وہ وشواس پکا ہو گیا ہے۔'' اس دفعہ سنتوش بھی مسکرایا۔

''ہوا کیا تھا عبداللہ۔''

''میں اپنے گھر پر تھا کہ رحیم کا فون آیا اس نے مجھے گھر پر بلایا میں جب اس کے گھر پر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اندر داخل ہوا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ سامنے فرش پر رحیم تڑپ رہا تھا اسی وقت مجھے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی میں سمجھ گیا قاتل پچھلے دروازے سے

باہر بھاگ رہا ہے میں تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف بھاگا پھر مجھے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی میں پچھلے دروازے کے قریب پہنچا تو ایک گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی میں نے ہینڈل پکڑ کر دروازہ بند کیا اور رحیم کے قریب آ گیا۔''

''اب عب...... عبد...... عبد...... اللہ'' جج......

''رحیم اتنا ہی کہہ سکا پھر اس کی سانسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا میں نے انجانے میں رحیم کے پیٹ میں گھونپا گیا خنجر نکال دیا اسی وقت وہاں پولیس آ گئی۔'' یہاں تک کہہ کر عبداللہ خاموش ہو گیا۔

''ہوں...... تو اس کا مطلب ہتھیارا کوئی اور ہے۔'' سنتوش سوچتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے عبداللہ میں دیال انکل سے بات کرتا ہوں۔'' سنتوش نے کہا تو عبداللہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

''ہائے جمی...... کیسے ہو تم......؟'' کاویری جمی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی جو بیڈ پر لیٹا ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا وہ اٹھ کر بیٹھا۔

''میں ٹھیک ہوں...... تم سناؤ......'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ کیونکہ کاویری کے آنے سے اسے بڑی خوشی ملتی تھی کاویری کمرے میں موجود کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

''کہیں باہر چلیں۔'' جمی نے کاویری سے پوچھا۔

''نہیں یہیں ٹھیک ہے...... میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ ذرا جھنجلاہٹ سے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی...... جوس لو گی۔'' جمی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں منگوالو۔'' کاویری نے اثبات میں سر ہلایا جمی ملازم کو آوازیں دینے لگا تھوڑی دیر بعد ملازم گلاس ٹیبل پر رکھ کر باہر چلا گیا۔

''ویسے جمی عبداللہ پر بڑی حیرانگی ہوئی ہے کہ کیا کسی کی ہتھیا بھی کر سکتا ہے۔'' کاویری نے جوس کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''ہتھیا تو وہ واقعی نہیں کر سکتا۔'' جمی عجیب سے انداز میں بولا ساتھ ہی وہ ہنسا بھی۔

''کیا مطلب......؟'' کاویری حاران ہوئی۔

''رحیم کی ہتھیا عبداللہ نے کہاں کی ہے وہ تو بالکل نردوش ہے......'' جمی نے عجیب بات کی۔

''تو پھر کس نے کی ہے رحیم کی ہتھیا۔'' کاویری نے پوچھا۔

''میں نے......!'' جمی نے کہا۔

''تت...... تم......'' کاویری حیرانگی سے ہکلائی۔

''ہاں...... میں نے عبداللہ کو اس ہتھیا میں پھنسایا ہے اور وہ بھی صرف تمہارے کارن۔'' جمی کہتے ہوئے رکا۔

''میرے کارن......'' کاویری کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''ہاں تمہارے کارن...... یاد ہے اس دن جب تم نے مجھے بتایا کہ دیا کی ہتھیا کے سلسلے میں پولیس کو عبداللہ نے تمہارا نام بتایا ہے تو میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اسے سبق سکھانے کا سوچا، رحیم سے مجھے پہلے ہی سخت نفرت تھی اور اب عبداللہ سے بھی ہو گئی تھی میں نے رحیم کی ہتھیا کرنے کی سوچی، میں اس کے گھر پر پہنچا اب گڈ لک دیکھو وہ عبداللہ کو فون پر اپنے گھر ہی بلا رہا تھا اب میں سے ضائع کیے بغیر رحیم کے سامنے آ گیا...... کیسے ہو رحیم۔'' میں نے سخت لہجے میں وہ حیرانگی سے گھوما...... جمی...... تم۔''

''ہاں...... میں......'' میں زبردستی مسکرایا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو تم......'' اس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہاں تمہاری ہتھیا کرنے آیا ہوں۔'' میں نے جیب سے چاقو نکالتے ہوئے کہا۔

''یعنی قتل......'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں قتل......'' اتنا کہہ کر میں نے آگے بڑھ کر

اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا اسی وقت مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں تیزی سے گھر کے پچھلے دروازے کی طرف بھاگا جس طرف سے میں آیا تھا یہ ہے ساری بات۔ اتنا کہہ کر جمی خاموش ہوگیا۔

"ایک راز کی بات بتاؤں۔"

"کک...... کیا......" کاوری کے منہ سے نکلا۔

"دیا کی ہتھیا بھی میں نے کی ہے۔" جمی نے ایک اور دھماکہ کیا۔

"کک...... کیا!" کاوری کا انداز چلانے والا تھا۔

"ہاں...... وہ بھی صرف تمہارے کارن کیونکہ اس نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔" جمی نے بظاہر کاوری پر احسان جتایا۔

"شرم آنی چاہئے جمی تمہیں...... ڈرانے دھمکانے کا مطلب تم نے ہتھیا میں نکال لیا میں نے تم جیسا پاپی نیچ اور ہتھیارا آدمی نہیں دیکھا۔" کاوری نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

تو جمی تیزی سے بیڈ سے نیچے اتر کر کاوری کے آگے آ کر کھڑا ہوگیا...... "کاوری یہ تو میں نے صرف تمہارے کارن کیا ہے کیونکہ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔" جمی نے کہا تو کمرہ "چٹاخ" کی آواز سے گونج اٹھا یہ ایک زنانے دار تھپڑ تھا جو کاوری نے جمی کے منہ پر مارا تھا۔

"خبیث انسان میں نے تمہیں کہا تھا کہ ان کی ہتھیا کرو...... اور یہ کیا کہہ رہے ہو تم کہ مجھ سے پریم کرتے ہو، میں ایسے کمینے اور جلاد انسان سے ملنا پسند نہیں کرتی اور تم پریم کا کہہ رہے ہو۔ I Hate You...... ہٹو پیچھے۔" کاوری نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تمہیں یہ تھپڑ مہنگا پڑے گا کاوری۔" جمی غصے سے گال سہلاتے ہوئے بولا۔

☆......☆......☆

"انکل کاوری کہاں ہے......؟" جمی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کاوری کے پتا سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہوگی۔" کاوری کے پتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑی غصے میں لگ رہی تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے اوپر اپنے کمرے میں گئی ہے۔"

"شاید مجھ سے ناراض ہے...... میں بات کرتا ہوں اس سے۔" جمی نے کہا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا وہ کاوری کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کاوری بیڈ پر بیٹھی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے ہوئے تھی دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"تم......" کاوری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"I am Sorry" جمی نے کہا۔

"Sorry کرنے سے دیا اور رحیم واپس آجائیں گے۔" کاوری غصے سے چلائی۔

"غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے کاوری...... مم...... میں اس کا پرائشچت کرنا چاہتا ہوں میں، مگر پولیس اسٹیشن جا کر وہاں انکل کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا اور اپنے آپ کو پیش کردوں گا۔" جمی کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح بولا۔

"کیا تم واقعی ایسا کرو گے......" کاوری تھوڑا نرم لہجے میں بولی اسے شاید جمی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں......" جمی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے بولا۔

"پھر تمہارا کیا بنے گا۔" ہمدردی کے باعث کاوری کے منہ سے نکلا۔

"میں نے وکیل سے بات کرلی ہے وہ میری سزا کم سے کم کرائے گا، میں آئندہ سے ایسی زندگی سے توبہ کرلوں گا۔" جمی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ کاوری سمجھ گئی کہ جمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اس کا تھپڑ کام کر گیا تھا۔

"چلو ٹھیک عقل تو آئی......" کاوری پہلی دا...... مسکرائی۔

"یہ تو تمہارے تھپڑ کا کمال ہے، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے غلط کیا تھا ورنہ میں تو اس دلدل میں دھنستا چلا جاتا۔" جمی بھی جواباً مسکرایا۔

"ٹھیک ہے پھر پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔" کاوری نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا۔

"چلو......" وہ دونوں نیچے آئے اور دونوں گھر سے باہر نکل گئے۔

"اس کا مطلب میرا تھپڑ کام دکھا گیا۔" کاوری شرارتی لہجے میں بولی۔

"ہاں بھئی...... ویسے تھپڑ بڑا کرارا تھا تمہارا...... ابھی تک گال درد کر رہا ہے۔" جمی گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

جواباً کاوری ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

چاند مکمل طور پر آسمان کی چادر سے باہر نکلا ہوا تھا اور چاند کی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا پولیس اسٹیشن پیدل چلنا ہے۔" کاوری مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔" جمی نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا تو کاوری نے اثبات میں سر ہلا دیا چلتے چلتے جمی ایک چھوٹی سی وین کے سامنے رکا۔

"کیا ہوا رک کیوں گئے۔" کاوری رک کر اس کے قریب آ کر بولی۔

اسی وقت وین کا دروازہ تیزی سے کھلا وین کے اندر دو نوجوان لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جمی نے کاوری کو زوردار جھٹکا وین کی طرف دیا تو کاوری چیختی ہوئی لڑکھڑا کر وین کے اندر جا گری دونوں لڑکوں نے جو وین کے اندر بیٹھے ہوئے تھے کاوری کو بازوؤں سے پکڑ کر وین کے اندر کھینچ لیا جمی اندر بیٹھا اور اس نے وین کا دروازہ بند کردیا۔

"یہ...... یہ...... کک...... کک...... کیا۔" کاوری نے ہکلاتے ہوئے حیرت سے جمی کی طرف دیکھا، تو جمی کے ہونٹوں پر اب سفاکی اور شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"اس تھپڑ کا انجام۔" جمی گالوں کو بھینچتے ہوئے بولا۔ جواباً کاوری کا رنگ اڑ گیا کیونکہ جمی اس وقت کسی درندہ سے کم نہیں لگ رہا تھا دونوں لڑکوں کے ہاتھوں میں اب پستول نظر آرہے تھے۔

"تت...... تت...... تم...... کک...... کیا چاہتے ہو؟" کاوری نے لرزتے ہونٹوں سے پوچھا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے وین اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

"تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔" جمی دانت پیستے ہوئے بولا۔

"کک...... کیا......" کاوری چلائی۔

"بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو جمی۔"

وہ تینوں قہقہے لگانے لگے کاوری نے پریشان نگاہوں سے اوپر کی جانب دیکھا۔ "ہے بھگوان میری رکھشا کر۔" وہ روتے ہوئے بولی، تینوں ایک مرتبہ پھر اس کی بے بسی پر قہقہے لگانے لگے۔

"میں نے تمہاری خاطر کیا کیا نہیں کیا...... ہتھیائیں کیں اور تم نے کتنی آسانی سے میرا دل توڑ دیا۔" جمی گرجتے ہوئے بولا۔

"تم جیسا نیچ اور درندہ آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" کاوری نفرت سے چیختے ہوئے بولی۔

"اور دیکھو گی بھی نہیں...... آج میں تمہیں کسی قابل نہیں چھوڑوں گا۔" جمی دانت پیستے ہوئے بولا۔

تھوڑی دیر بعد وین ایک جگہ رکی ہر طرف سنسانی پھیلی ہوئی تھی ان میں سے ایک نے وین کا دروازہ کھولا جمی نے کاوری کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "چل باہر نکل۔"

"مم...... مم...... میں نہیں جاؤں گی۔" کاوری کو اپنی آواز دور کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ وہ صاف سمجھ گئی تھی کہ تھوڑی دیر بعد ان تینوں درندوں کے ہاتھوں اس کی عزت کے پرخچے اڑنے والے تھے۔

''نکل باہر......'' جمی نے دوبارہ اسے باہر کی طرف کھینچا۔

''ب ......ب...... بچاؤ ...... Help''
کاویری چیختے ہوئے بولی یہ دیکھ کر وہ چاروں قہقہے لگانے لگے ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا بھی باہر آچکا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں کاویری یہاں دور دور تک کسی کا گھر نہیں ہے...... چلو اب......'' اتنا کہہ کر جمی نے کاویری کو باہر کھینچا اور سڑک سے اتر کر ایک طرف بنی پگڈنڈی پر چلنے لگا اب جمی کے تینوں دوستوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آرہے تھے کاویری بار بار التجائیہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی دور دراز پانچوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا چلتے چلتے وہ ایک کچے مکان کے سامنے رکے۔

''دروازہ کھولو......'' جمی نے اپنے تینوں دوستوں میں سے ایک کو حکم دیتے ہوئے کہا وہ لڑکا تیزی سے آگے بڑھا اور مکان کے دروازے پر جھک گیا کاویری سمجھ گئی تھی کہ جمی نے اپنے خبیث دوستوں کے ساتھ چند منٹوں میں ہی پلاننگ کرلی تھی وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے جمی کے ساتھ جانے کی حامی بھری تھی خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

خوف کے باعث کاویری کا پورا جسم کانپ رہا تھا تھوڑی دیر بعد اس لڑکے نے مکان کا تالا کھول کر دروازہ کھول دیا۔

''چل اندر......'' جمی کاویری کو کھینچتا ہوا مکان کے اندر لے گیا اس کے باقی دوست بھی اندر داخل ہوئے۔

''تم تینوں بعد میں...... پہلے میں......'' جمی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا اور پھر کاویری کو کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے جانے لگا، بے چاری کاویری اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

دوسرے کمرے میں جا کر جمی نے دروازہ بند کرلیا۔

''یہ تو گیا......'' ویسے یار ایک بات ہے...... ان میں سے ایک بولا۔

''کیا دوسرے نے پوچھا یہ جمی ہے بڑا کمینہ......'' پہلے نے کہا۔

''ہاں بات تو تیری ٹھیک ہے اپنی پریمکا تک کو نہیں چھوڑا۔'' اس بار تیسرے نے کہا دوسرے کمرے سے کاویری کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں...... شاید اپنا بچاؤ کررہی تھی......

پہلا بولا...... پرنتو کوئی فائدہ نہیں وہ جمی چھوڑے گا ہی نہیں۔'' تیسرے نے کہا۔

''ویسے یار چیز بڑے کمال ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' باقی دونوں خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''ارے ...... وہ دیکھو...... وہ کیا ہے......''
اچانک پہلے نے چونکتے ہوئے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ باقی دونوں نے تیزی سے دیوار کی طرف دیکھا وہ تینوں حیران رہ گئے دیوار پر ایک سایہ تھا جو خود بخود بڑھتا چلا جارہا تھا تینوں حیرانگی سے دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک ایک غراہٹ کی آواز گونجی تینوں نے تیزی سے گردنیں گھمائیں ڈر کے مارے ان کے اوسان خطا ہوگئے ان تینوں کا جسم خوف کے باعث بری طرح کانپنے لگا، سامنے کالے بالوں والا ایک بہت بڑا جانور کھڑا تھا وہ ایک بھیڑیئے سے مشابہت رکھتا تھا لیکن اتنا بڑا بھیڑیا انہوں نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا اس بھیڑیئے کی غراہٹیں تیز ہوتی جارہی تھیں وہ اپنی سرخ اور خوفناک آنکھوں سے تینوں کو گھور رہا تھا۔

اچانک وہ بھیڑیا اپنی جگہ سے اچھلا اور ان میں سے ایک کو لیتا ہوا زمین پر جا گرا باقی دونوں چیختے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور پستولوں کا رخ بھیڑیئے کی طرف کردیا انہوں کے بعد دیگرے کئی فائر کیے لیکن دوسرا لمحہ حیران کن تھا گولیوں کا بھیڑیئے پر کوئی اثر نہ ہوا بھیڑیئے نے اپنے نوکیلے دانت زمین پر پڑے چیختے ہوئے لڑکے کی گردن میں گاڑ دیئے دونوں لڑکوں کے

پستولوں کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں ان کا پہلا ساتھی تڑپتے ہوئے ٹھنڈا ہو چکا تھا بھیڑیا پھر اچھلا اور حیران کھڑے ان دونوں لڑکوں کو بھی زمین پر گرایا اور اپنے پنجے ان دونوں کے پیٹ میں گاڑ دیئے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور وہ دونوں بھی تڑپنے لگے بھیڑیئے نے گردن گھما کر دوسرے کمرے کی طرف دیکھا جس کے دروازے پر جمی بت بنا کھڑا تھا اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس خوف ناک بھیڑیئے کو دیکھ رہا تھا جمی کے بدن پر شرٹ موجود نہیں تھی۔

بھیڑیا غرایا اور وہیں سے اچھل کر جمی کے سامنے جا کھڑا ہوا جمی اپنے سامنے اس قدر خوف ناک بھیڑیئے کو دیکھ کر کانپنے لگا بھیڑیئے نے چھلانگ لگا کر اسے زمین پر گرایا۔ کاویری ایک طرف کھڑی کانپتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے برہنہ جسم کو چھپا رہی تھی بھیڑیئے نے اپنے نوکیلے دانت جمی کی گردن میں گاڑ دیئے جمی نے ایک زوردار چیخ ماری اور تڑپنے لگا بھیڑیئے نے جمی کی تڑپتی ہوئی باڈی کو چھوڑا اور کاویری کی طرف دیکھا کاویری زمین پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ گاڑی یکدم اسپتال کے سامنے رکی اور اس میں سے ساکھشی، ہریش، سنتوش اور زبیر نکلے اور اسپتال میں داخل ہوگئے وہ کاویری کے کمرے کے باہر پہنچے تو وہاں انسپکٹر دیال کھڑا تھا۔ ''بتاجی کیا حال ہے کاویری کا......'' زبیر نے پوچھا۔

''اب ٹھیک ہے بیٹا پرنتو وہ بے ہوش ہے۔'' انسپکٹر دیال نے کہا۔

''انکل یہ کیا ہوا......'' سنتوش نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے خود نہیں معلوم...... یہ تو کاویری کے ہوش میں آنے کے بعد ہی پتہ چلا گا پرنتو سب سے حیرانگی والی بات یہ ہے کہ جمی اور تین لڑکوں کی لاشیں بڑی بری حالت میں ملی ہیں موقع واردات پر ایسا لگتا ہے جیسے ان کا ایسا حال کسی خوف ناک جانور نے کیا ہو۔ کاویری بھی برہنہ حالت میں ملی تھی ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے اس کا ریپ کرنے کی کوشش کی ہے باقی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے باقی بات کاویری ہوش میں آنے کے بعد بتائے گی۔'' انسپکٹر دیال نے کہا تو سنتوش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

سنتوش اب اس لاکٹ کی زنجیر میں انگلی گھما رہا تھا وہ جب بھی پریشان ہوتا تھا اسی لاکٹ کی زنجیر میں انگلی گھماتا تھا اور کبھی بھی اس لاکٹ نے اسے مایوس نہیں کیا تھا سنتوش نے آنکھیں کھولیں اور پاس بیٹھے زبیر کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا......'' زبیر نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے وشواس ہے عبداللہ نردوش ہے......'' سنتوش نے کہا۔

''ہیں...... اس بات کی اس سمے ضرورت کیوں پڑگئی......'' زبیر حیران ہوا۔

''پتہ نہیں میں نے یہ بات محسوس کی اور تمہیں بتادی۔'' سنتوش نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی ایک نرس باہر آگئی اور اس نے کہا ......''مس کاویری کو ہوش آگیا ہے۔''

سب تیزی سے کاویری کے کمرے میں داخل ہوگئے وہاں کاویری کا باپ پہلے سے موجود تھا انسپکٹر دیال کاویری کے بیڈ کے قریب آیا۔

''مم...... مم...... میں کہاں ہوں......'' کاویری لاشعوری طور پر بولی۔

''کاویری تم اس سمے اسپتال میں ہو۔'' انسپکٹر دیال نے بتایا۔

''دیال انکل...... وہ...... وہ بھیڑیا کہاں ہے ...... وہ مجھے بھی مار دے گا۔'' کاویری ڈرتے ہوئے بولی۔

سب لفظ ''بھیڑیئے۔'' پر حیران ہوئے ......''کاویری چنتا مت کرو تم اس سمے اسپتال میں ہو یہ

دیکھو تمہارے چاچی بھی یہیں کھڑے ہیں۔'' انسپکٹر دیال نے کاویری کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

''پپ...... پپ...... چاچی وہ...... بھب...... بھیڑیا مجھے کھا جائے گا ...... اس نے جمی اور اس کے ساتھیوں کی ہتھیا بھی کی ہے۔'' کاویری بدستور ڈرتے ہوئے بولی۔

''اوہ......'' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''کاویری تم گھبراؤ مت اس سے تم محفوظ ہو۔ مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا۔'' انسپکٹر دیال نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد ساری تفصیل کاویری نے انہیں ساری تفصیل سنادی۔

''میں اس جمی کے باپ پر مقدمہ کروں گا......'' ساری تفصیل سننے کے بعد کاویری کے باپ نے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں چاچی جمی کو اپنے کیے کی بھیانک سزا مل چکی ہے۔'' کاویری نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

''اس بھیڑیے کا اچانک وہاں کیا کام......'' انسپکٹر دیال حیران ہوتے ہوئے بولا۔ وہ جگہ کسی جنگل میں تو تھی نہیں۔''

''دیال انکل اس بھیڑیے کا شریر عام بھیڑیوں سے بہت بڑا تھا بڑا خوف ناک بھیڑیا تھا...... وہ...... پرنتو اگر وہ بھیڑیا سے پر وہاں نہ آتو نجانے وہ کمینہ جمی۔'' اتنا کہہ کر کاویری رونے لگی۔

''تو اس کا مطلب وہ بھیڑیا تمہارے لئے دیوتا ثابت ہوا۔'' انسپکٹر دیال نے کہا۔

''جی ہاں...... بالکل انکل۔'' کاویری اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''تو اس کا مطلب دیا اور رحیم کا ہتھیارا جمی ہے اور عبداللہ نردوش ہے۔'' انسپکٹر دیال نے کہا تو زبیر نے تیزی سے حیرانگی کے باعث سنتوش کی طرف دیکھا اسے سنتوش کی تھوڑی دیر پہلے کہی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ ''عبداللہ نردوش ہے۔'' لیکن سنتوش کاویری کی طرف متوجہ تھا۔

''ٹھیک ہے پہلے عبداللہ کو تو باہر نکلوایا جائے جو نردوش ہے۔''

چند دنوں کی کارروائی اور تحقیقات کے بعد عبداللہ کو باعزت بری کر دیا گیا سنتوش اسے مبارک باد دینے گیا تو وہ اس وقت نماز پڑھنے مسجد میں گیا تھا۔ عبداللہ کی ماں نے اسے پیار دیا اور چارپائی پر بیٹھا دیا اور خود کچن میں چائے بنانے چلی گئی تھوڑی دیر بعد عبداللہ کی ماں چائے کی پیالی لے آئیں۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' سنتوش نے پوچھا۔

''اللہ کا بڑا شکر ہے بیٹا۔'' عبداللہ کی ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو مبارک ہو۔'' سنتوش نے عبداللہ کی رہائی کی مبارک باد دی۔

''خیر مبارک بیٹا۔'' عبداللہ کی ماں نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرا سنتوش کو عجیب سی راحت محسوس ہوئی۔

''بیٹا میرا عبداللہ بے قصور تھا اور اوپر سے اس کا ایمان بھی ایک حقیقی اللہ پر تھا اس لئے اللہ کی رحمت ہوئی اور وہ باعزت بری ہو گیا۔'' یہ کہتے ہوئے عبداللہ کی ماں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ تھوڑی دیر بعد عبداللہ بھی آ گیا سنتوش نے عبداللہ کے گلے لگ کر اسے رہائی کی مبارک باد دی عبداللہ کی ماں کچن میں جا چکیں تھیں۔

''عبداللہ تمہیں رحیم کی موت پر دکھ تو ہوگا۔'' سنتوش نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

''دکھ تو ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ اس کے قاتل کو سزا بھی مل گئی اور سب کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ رحیم اور دیا کا قاتل کون ہے۔'' عبداللہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''کاویری کیسی ہے۔''

(جاری ہے)



سزائے موت

رشک نور۔ فیصل آباد

اچانک مردے کی کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی، ظالموں نے میری محبوبہ کو موت سے ہمکنار کردیا تھا، میں اب دنیا سے پیار و محبت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردوں گا، پیار کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنادوں گا۔

حد سے تجاوز کرنے والے کیا اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

کاشف اور ندا اپنی گاڑی میں بیٹھے آدھی رات کے قریب ایک پارٹی سے واپس آرہے تھے۔

کاشف بولا۔ ''ندا راستہ بہت خراب ہے اور موسم بھی خراب ہو رہا ہے لگتا ہے کہ مجھ کو آج رات تمہارے گھر پر ہی رہنا پڑے گا۔''

ندا کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو تم...... تم جانتے ہو نہ کہ بابا کو یہ سب بالکل بھی پسند نہیں ہے۔''

کاشف، ندا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے۔

''میری پیاری اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے نا۔ موسم دیکھو کتنا خراب ہے۔''

ندا نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا تو آسمان بالکل سرخ ہو گیا تھا، آندھی ایسی تھی، آندھی کیا طوفان تھا۔ درخت بھی آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ لگ رہا تھا

جیسے ابھی کوئی درخت ان کی گاڑی پر گر جائے گا۔

"یار موسم تو بہت ڈراؤنا لگ رہا ہے اور تم نے یہ گاڑی بھی جنگل کے راستے پر ڈالی ہے۔" ندا کاشف کی طرف پریشانی کی حالت میں دیکھتی ہوئی بولی۔

کاشف ندا کو حوصلہ دیتے ہوئے۔ "تم فکر نہیں کرو میری جان میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" اور پھر قبرستان کے پاس آ کر ایک جھٹکے کے ساتھ ان کی گاڑی رک گئی۔

کیا ہوا کاشف گاڑی کیوں روک دی وہ بھی اس جگہ۔" ندا قبرستان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔" کاشف اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"اب کیا کریں۔" ندا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"چلو گاڑی سے باہر نکل کر کسی کی (Help) لیتے ہیں۔" کاشف نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل ہو گیا؟ اس جگہ پر ہمیں کون ملے گا ہماری (Help) کرنے کے لئے۔" ندا نے اپنے بالوں کو کلپ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہ کوئی ہوگا۔" کاشف نے کہا۔

"ہاں ہوگا انسان نہیں بھوت۔" ندا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں تو بھوتوں سے مدد مانگ لیں گے۔" کاشف نے ندا کو چڑاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں موبائل میں Signal بھی نہیں آرہے۔" کاشف ندا کو گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "چلو میں تم کو پیدل چھوڑ آتا ہوں ویسے بھی آگے تھوڑا سا ہی راستہ رہ گیا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی آدھی رات ہو گئی ہے اور تم مجھے قبرستان میں لے جانے کا بول رہے ہو۔" ندا اپنے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

کاشف ندا کو گاڑی سے باہر کھینچتے ہوئے بولا۔ "زیادہ نخرے نہ کرو جانو اسید ھی طرح میرے ساتھ چلو۔" کاشف نے مسکرا کر کہا تو ندا مزید چڑ گئی۔

اب وہ دونوں قبرستان کے بیچ و بیچ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ندا نے اپنے پیر پر کوئی گرفت محسوس کی جو اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ ندا نے جب موبائل ٹارچ اپنے پیر کی طرف ماری تو اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور پھر سنسان ماحول میں اس کی چیخ سے ایک خوف کی لہر پیدا ہوئی۔

قبر سے ایک لاش کا ہاتھ باہر تھا جس نے ندا کا پیر اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

کاشف نے ندا کا پیر لاش کی گرفت سے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ ندا مسلسل چیخے جا رہی تھی۔

کاشف نے ادھر ادھر چلاتے ہوئے مدد کے لئے پکارا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ کاشف نے پاس پڑے ہوئے ایک بڑا سا پتھر نیچے سے اٹھایا اور لاش کے ہاتھ پر بڑی قوت سے دے مارا تو درد کی وجہ سے ندا کے پیر سے اس کی گرفت بھی کم ہو گئی۔ کاشف اور ندا وہاں سے بھاگنے لگے۔

اچانک سامنے ایک لمبا آدمی کفن میں لپٹا ان کے سامنے کھڑا تھا چہرے سے تمام گوشت غائب تھا اور جگہ جگہ سے خون نکل رہا تھا۔ سفید کفن خون کی وجہ سے سرخ رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا اور اس کا ایک بازو جسم کے ساتھ لٹک رہا تھا، اندیشہ تھا کہ وہ بازو ٹوٹ کر ابھی گر جائے گا۔ "ک۔ کو۔ کون ہو تم۔" ندا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا تو لاش نے ایک قہقہہ بلند کیا پھر اس کی خرخراتی آواز سنائی دی۔

"تمہاری موت۔"

"م۔م۔موت۔" کاشف بہ مشکل اپنا الفاظ پورا کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں تمہاری موت۔" لاش نے کہا۔

ندا نے زمین سے مٹی اٹھائی اور لاش کی آنکھوں کی طرف اچھال دی، اتنے میں وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے اور ایک بڑے سے درخت کے پیچھے چھپ گئے۔

ندا روتے ہوئے کاشف سے بولی۔ "یہ لاش کیا کہہ رہی تھی؟ وہ ہمیں کیوں مارنا چاہتی ہے۔"

کاشف بولا۔ "ایسا کچھ نہیں ہوگا تم فکر نہیں کرو میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

اور پھر کاشف ندسا کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دیتا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا اس لئے تم پریشان نہ ہو میں ہوں ناں۔"

"کاشف ہمیں یہاں سے باہر نکلنا ہوگا۔" ندا نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد کاشف اور ندا درختوں کی آڑ میں چھپتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آئے، اس کے بعد وہ سرپٹ بھاگتے بھاگتے بہت دور نکل آئے۔ ان کی ٹانگیں اب بھاگنے میں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ سانس پھولا ہوا تھا اور وہ دونوں تھک کر چور زمین پر گر گئے۔ "کاشف تم ٹھیک ہو ناں۔" ندا بولی۔

"میں ٹھیک ہوں ندا، اور یہ اچھا ہوا کہ ہم دونوں بچ گئے، اس لاش کے ہاتھوں سے۔"

ندا کاشف کو غصے سے دیکھتے ہوئے۔ "تم کو ابھی بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔ ساری باتیں چھوڑو اور رات گزارنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرو۔"

پھر کاشف نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بھی کرنا پڑے گا۔"

"یہ تو بہت سنسان علاقہ ہے۔ پتہ نہیں کوئی یہاں رہتا بھی ہوگا یا نہیں۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے پر کیا پتہ کوئی مل جائے، کاشف تمہارا فون کہاں ہے۔" ندا نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو قبرستان میں ہی کہیں گر گیا ہے۔"

"چلتے چلتے وہ دونوں تھک چکے تھے، ندا ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے بولی، اب اور نہیں چل سکتی میں۔" کاشف بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اور ندا سے پوچھا۔ "ندا تم ٹھیک تو ہو ناں۔"

"تھک گئی ہوں اور بھوک بھی بہت لگ رہی ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" کاشف اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا کہ اتنے میں انہیں دور سے دھواں نکلتا نظر آیا تو دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے کاشف بولا۔ "ندا شاید وہاں پر کوئی گھر اور کچھ انسان بھی ہوں جو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

"کاشف وہاں بھوت بھی تو ہو سکتے ہیں۔" ندا بولی۔

"تم کو ہر وقت بھوت ہی یاد آتے رہتے ہیں۔" کاشف بولا۔

"کیا کوئی خاص رشتہ ہے ان سے تمہارا۔" اور پھر باتوں باتوں میں وہ دونوں اس جگہ پر پہنچ گئے۔ جہاں سے دھواں نکل رہا تھا۔

یہ گھر تو نہیں بلکہ پرانی کھنڈر نما حویلی ہے، اس میں کس طرح رات گزاریں گے۔ اس حویلی میں تو بھوت بھی رہنے سے پہلے دس بار سوچتے ہوں گے۔" ندا سہمے سہمے الفاظ میں بولی۔

"ندا، ایک تو تم کو بھوت بہت یاد آتے ہیں۔ بس آج رات کی تو بات ہے کل صبح ہوتے ہی ہم اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

اور پھر کاشف اور ندا دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ دیکھا کہ پورے گھر میں ہر طرف جالے ہی جالے لگے ہوئے ہیں جیسے کوئی برسوں سے یہاں پر رہتا ہی نہ ہو کہ اچانک ایک تیز ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور ساتھ باہر کا دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

اس کے بعد دونوں پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی، پھر دونوں نے اپنے حواس قابو میں کرنے کے بعد ڈرے اور سہمے انداز میں آگے کو بڑھنے لگے تو دیکھا کہ صحن میں ایک بوڑھا آدمی سفید لباس میں موجود ہے اور ہاتھ میں بڑے دانوں کی تسبیح ہے ذکر باری تعالیٰ میں مصروف ہے۔

کاشف بوڑھے کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کھانسنے لگا تو بوڑھا چونکا کھانسی کی آواز پر ایک دم اپنی آنکھیں کھول دیں اور پیچھے مڑ کر کاشف اور ندا کو دیکھا اور گویا ہوا۔ "آ گئے تم دونوں، آج کی رات تم اس کمرے میں بسر کر سکتے ہو۔"

کاشف حیرانگی سے بولا۔ "ہم نے تو آپ کو نہیں بتایا کہ ہمیں یہاں رکنا ہے۔"

بوڑھا آدمی مسکراتے ہوئے۔ "میں سب جانتا ہوں، جاؤ کمرے میں۔" وہ ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو کاشف ندا کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ "ندا چلو چلتے ہیں۔"

"ویسے بھی میں بہت تھک چکی ہوں۔" ندا بولی۔

دونوں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ان دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کمرے کے آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی جس کی وجہ سے کمرہ خاصا گرم اور پرسکون تھا۔ پورا کمرہ جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی چھت پر ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ دیوار پر خوب صورت مہنگی مہنگی تصویریں لگی تھیں۔ درمیان میں ایک میز اور اس کے ارد گرد صوفے خوب صورت رنگ کے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک بیش قیمت بیڈ تھا۔ دونوں کمرے کی حالت دیکھ کر کافی پریشان ہوگئے تھے کہ اس کھنڈر نما حویلی میں اس قدر سجے سجائے کمرے جس سے آنکھیں چندھیا رہی ہیں۔

ندا بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو کچھ بھی ہو آرام کی جگہ تو ملی۔'' کاشف بھی ندا کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔ ''اور اب کھانا مل جائے تو مزہ آجائے۔'' کاشف بولا۔

دونوں ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے میں آواز دے کر تین ملازم داخل ہوئے۔ انہوں نے کئی ڈشیں اٹھا رکھی تھیں اور ان ڈشوں میں انواع و اقسام کے مزیدار کھانے تھے۔ انہوں نے ڈشیں میز پر رکھ دیں اور بولے۔ ''آپ دونوں کا کھانا حاضر ہے کھائیں۔'' اور دونوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد دونوں اٹھے اور کھانا کھا کر چین کی نیند سو گئے۔ دونوں اس قدر تھک چکے تھے کہ آنکھیں بند کرتے ہی گہری نیند سو گئے۔

☆......☆......☆

ہر طرف ہو کا عالم، سناٹا اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، جس سے دونوں کی آنکھ کھل گئی تو ان دونوں نے خود کو اسی قبرستان میں پایا جہاں سے وہ جان بچا کر بھاگے تھے۔

ان دونوں پر کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بہت ڈر چکے تھے اتنی سردی میں بھی ان کو پسینہ آرہا تھا، دونوں کو اب اپنی موت نظر آرہی تھی، پھر اچانک بوڑھا آدمی ان کی طرف بڑھتا ہوا ان کو نظر آیا تو کاشف گھگھیایا...... آ...... آ...... آپ کون ہیں۔'' پھر وہ بوڑھا آدمی اب لاش کے روپ میں نظر آنے لگا۔ لاش کو دیکھ کر ندا کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی جس سے قرب و جوار کا علاقہ دہل گیا۔

''میں آخری خواہش تم لوگوں کی پوری کرنا چاہتا تھا اس لئے سونے کے لئے تم کو اچھا کمرہ دیا تھا، کھانے کے لئے بہترین کھانا دیا، اب تم لوگوں کو موت دوں گا تاکہ کوئی تم لوگوں کو جدا نہ کرسکے۔'' یہ کہتے ہوئے لاش کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

''تم ہماری جان کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو، ہم نے کیا کیا ہے، جو تم ہماری جان لینا چاہتے ہو۔'' ندا کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

پھر لاش کی کھرکھراتی ہوئی دہشت ناک بھاری آواز سنائی دی۔ ''محبت''

''میری محبوبہ کو بھی ظالم لوگوں نے مجھ سے دور کیا تھا اور مجھے سزائے موت دی تھی۔ اس لئے میں اس دنیا میں اب پیار نہیں رہنے دوں گا۔'' لاش نے یہ کہتے ہوئے پھر قہقہہ بلند کیا اور آگے بڑھتے ہوئے کاشف کو گردن سے پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے ندا کو تو ان دونوں کی چیخوں سے قبرستان گونج اٹھا کہ اتنے میں قریب کی آبادی کی مسجد سے اذان فجر سنائی دی۔ ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔''

اذان کی آواز سنتے ہی لاش کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔ ''یہ کیا ہوگیا......'' لاش کے منہ سے نکلا اور لاش اپنی جگہ سے غائب ہوگئی۔

جھٹ کاشف نے ندا کا ہاتھ پکڑا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ قبرستان سے نکل کر وہ سیدھا اپنی گاڑی کے پاس پہنچا اور دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں ندا بھی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

کاشف نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ''ارے یہ کیا......'' گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ کاشف نے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا فل دباؤ ڈالا تو گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور فراٹے بھرنے لگی۔ ندا کی حالت ایسی تھی کہ جیسے وہ گہری نیند سے دوچار ہوگئی ہو۔

کامنی شامنی

محمد حنیف شاکر۔ ننکانہ صاحب

عامل کے عمل پڑھتے ہی اچانک کمرے کے کونے سے دھواں اٹھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے ایک انسانی ہیولے کا روپ دھار لیا اور پھر ہیولے کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے لیکن پھر......

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو ہلکان و پریشان کردیتی ہے خوفناک اور ڈراؤنی آسیبی کہانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بیسوی صدی کے سال 1987ء کا آغاز ہوا تھا میں ان دنوں اپنے گھر سے ستر 70 کلومیٹر دور اپنے تایازاد بھائی کے گھر دریائے راوی کے جنوبی کنارے ضلع اوکاڑہ کے گاؤں ٹھٹھہ بہلول میں بخار میں جتلا چارپائی کا مہمان بنا ہوا تھا اپنے گھر سے نکلے ہوئے مجھے تقریباً چھ ماہ ہوگئے تھے بخار کو ہوئے آج چوتھا روز تھا جسم میں کمزوری ضرور تھی لیکن ٹمپریچر اب کم تھا دس بجے کا وقت ہوگا کہ میرے ماموں کا بیٹا آنکلا سلام دعا اور خاطر تواضع کرنے کے بعد پوچھا۔

''بھائی اشرف آج ادھر کیسے آنا ہوا؟'' تو وہ بولا۔

''میں تجھے لینے آیا ہوں کیونکہ تمہاری باجی حنیفاں بہت بیمار ہے ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے سب گھر والے اور رشتہ دار وہاں پہنچے ہوئے اور بے حد

پریشان ہیں تمہاری امی میری پھوپھو نے بھی کہا ہے کہ اشرف جاؤ اپنے بھائی حنیف کو لے آؤ لہٰذا اٹھو میرے ساتھ چلو ورنہ یہ نہ ہو کہ اس وقت کا کیا پچھتانا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

"ٹھیک ہے بھائی چلتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ آپ یہاں کیسے پہنچے۔"

"میں سائیکل پر آیا ہوں جسے باہر گیٹ پر کھڑا کیا ہے۔" اس وقت موٹر سائیکل بہت ہی کم ہوتی تھی اگر کسی کے پاس تھی بھی تو وہ بھی بہت امیر لوگوں کے پاس ورنہ اس وقت سائیکل بہت زیادہ تھی جیسے آج کل موٹر سائیکل بہت زیادہ ہیں۔

میں نے تایازاد بھائی کی بیوی یعنی اپنی بھابھی صاحبہ جو (دونوں میاں بیوی) اب اس دنیا فانی میں نہیں رہے اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ سے اجازت لی اور ماموں زاد بھائی کے پیچھے سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا دریا راوی کو کشتی کے ذریعے پیر علی پتن سے پار کر کے دریا کے شمالی کنارے پر واقع قصبہ جھامرہ کے قریبی گاؤں ٹھٹھہ سرور کا میں جا پہنچا۔ وہاں کیا میرے سب گھر والے۔ بہن بھائی والدہ سمیت بہت سے رشتہ دار بھی موجود تھے باجی چارپائی پر پڑی ہوئی تھی کمزوری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھیں ناک اور چہرے پر سوزش تھی لیکن ہوش میں تھی میں نے کہا۔ "باجی کیسی ہیں۔؟"

"ٹھیک ہوں بھائی۔"

بخار کی وجہ سے مجھ سے بھی کھڑا نہیں ہوا جا رہا لہٰذا گھر والوں نے میری حالت کو دیکھتے ہوئے جلدی سے چارپائی بچھا دی جس پر میں بیٹھ گیا میرا بہنوئی احمد علی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔

"باجی کو کیا ہوا؟"

کہنے لگے۔ "یہی تو پتہ نہیں لگ رہا کہ انہیں کیا مرض لاحق ہے اچانک دورہ پڑتا ہے تو گر جاتی ہے اسے کچھ ہوش نہیں رہتا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح بے ہوشی میں گزرنے پر ہوش آ جاتا ہے ہم اسے پہلے ناند لیانوالہ ہسپتال لے گئے وہاں سے ہمیں الائیڈ ہسپتال فیصل آباد ریفر کیا گیا وہاں پر دس روز کے علاج پر جب کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ اسے ہوش میں لانے کے لئے نہ صرف انجکشن لگانے کے ساتھ ساتھ ناک میں مختلف دوائیاں بھی ڈالتے اور سونگھاتے رہے۔ جس سے نہ صرف ناک زخمی ہو گئی بلکہ سوزش بھی ہو گئی جسے آپ خود دیکھ رہے ہیں جب کہ ان سے یہ دورے اور بے ہوشی ختم نہ ہوئی تو ہم سے کہا اسے گھر لے جائیں سو ہم گھر لے آئے ہیں باقی اب آپ خود ملاحظہ کر سکتے ہو۔ ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ باجی کو پھر دورہ پڑ گیا باجی نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی میں ہمت کر کے اٹھا گو میری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی میں نے اپنی پرواہ نہ کی باجی کی آنکھوں میں دیکھا جو بالکل کھلی ہوئی تھیں اور دانت سختی سے بند تھے۔

میں نے باجی کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو پکڑ کر دم کرنا شروع کیا۔

ابھی دو پھونک ہی ماری تھی کہ باجی بولنے لگی، کہنے لگی۔ "مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے میں مر رہی ہوں جل رہی ہوں میں اسے کچھ نہیں کہوں گی اسے چھوڑ دوں گی کبھی دوبارہ نہیں آؤں گی۔" اس کی ایسی آوازیں سن کر میں کیا بلکہ جتنے افراد موجود تھے حیران رہ گئے۔

میں نے باجی کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں سنیں تو یہ سوچ کر کہ کہیں واقعی باجی کو میرا اس کی انگلی کو پکڑنا تکلیف کا باعث نہ بن رہا ہو میں نے انگلی کو چھوڑ دیا آواز آنا بند ہو گئی باجی کا دورہ ختم ہو گیا یعنی بے ہوشی نابود۔

باجی یہ کہتے ہوئے کہ۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟" اٹھ کر بیٹھ گئی اور مزید کہنے لگی۔ "آپ سب لوگ میرے اردگرد کیوں جمع ہیں۔"

میں نے کہا۔ "باجی آپ کو دورہ پڑا تھا جس کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئی تھیں اس لئے ہم سب آپ کے گرد اکٹھے ہیں۔"

میں نے باجی کے دورہ پڑنے پر دم کرتے ہوئے

جو الفاظ سنے تھے ان پر کافی غور و فکر کیا پھر باجی کی بے ہوشی کے دوران آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یہ تو کوئی مرض نہیں بیماری نہیں بلکہ یہ تو کوئی اور مسئلہ یا معاملہ ہے یہ تو مجھے ہوائی چیز کا مرض لگتا ہے۔"

میں نے گھر والوں سے اپنی اس سوچ و فکر کا ذکر کیا تو سب نے میری اس بات کو تسلیم کیا۔

میری والدہ نے کہا۔ "بیٹا تمہاری سوچ بالکل سو فیصد درست ہے اگر آئندہ ایسا ہوا تو اسے جانے مت دینا۔"

"ٹھیک ہے امی میں ایسا ہی کروں گا؟" جیسے ہی میری بات کا سب کو یقین ہو گیا تو بہنوئی نے کہا۔

"حنیف تم ابھی بچے ہو اوپر سے بخار میں مبتلا ہو اس چیز کو قابو کرنا اور اسے نکالنا تمہارے بس کی بات نہیں ساتھ والے گاؤں میں ایک عامل رہتا ہے وہ ایسے کاموں کا بہت ماہر ہے ان چیزوں پر قابو پانا اور انہیں نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ابھی عصر کا وقت ہے میں اسے جا کر لے آتا ابھی گیا اور ابھی آیا۔" وہ سائیکل پر عامل کو لینے چلے گئے ایک گھنٹے میں عامل کو ساتھ لے کر واپس آ گئے عامل صاحب نے آتے ہی اگربتیاں منگوائیں اور اگربتیاں جلا دیں۔ اتنے میں باجی کو پھر دورہ پڑ گیا عامل نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو ہوائی چیز باجی کے اندر سے باجی ہی کے ذریعے سے بولی۔ "خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے دفع دور ہو جاؤ۔"

"میں کیسے دفع ہو جاؤں، میں تو تجھے دفع دور کرنے آیا ہوں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو یہ اگربتیاں جلانے اور دھونی لگانے سے میں بھاگ جاؤں گی نہیں میں نہیں بھاگوں گی۔"

"میں تمہیں بھگاؤں گا نہیں بلکہ جلا کر بھسم کروں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے دیکھتی ہوں میں دفاع ہوتی ہوں یا تم...... میں چاہتی تھی کہ تم خون خرابہ کئے بغیر یہاں سے چلے جاتے تو بہتر تھا نہ مجھے چھیڑتے نہ خود تکلیف سے دوچار ہوتے مگر مجھے لگتا ہے تم خود بھی مجھ سے اذیت اٹھاؤ گے اور یہ جو کہ اب تک مجھ سے بچی ہوئی تھی اس کو بھی تکلیف میں مبتلا کرو گے۔"

"تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور اس طرح کے کام میں کتنا ماہر و مشہور ہوں اس سے پہلے تم جیسی کتنی کو جلا کر خاک کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہاری شان اور رتبے کو پہلے نہیں جانتی اور نہ ہی یہ جانتی ہوں کہ تم کتنے ماہر و مشہور عامل ہو لیکن اب تمہیں جان کر ہی رہوں گی اور دیکھوں گی کہ تم مجھ سے کیسے نمٹتے ہو اور کس طرح مجھے جلا کر راکھ کرتے ہو یا مجھ سے مار کھا کر اپاہج ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کام سے توبہ کر لو گے چلو میرا اور تمہارا کھیل شروع ہوتا ہے، میں تم کو چیلنج کر کے جا رہی ہوں کہاں جا رہی ہوں مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے چلو میں تم کو خود ہی بتا دیتی ہوں میں تمہارے گھر جا رہی ہوں اپنے گھر والوں کی خیر مناؤ ان کو بچا سکتے ہو تو جا کر اپنے بیوی بچوں کو مجھ سے بچا سکتے ہو تو بچا لو میں اس میں سے نکل رہی ہوں روکنے کی طاقت رکھتے ہو تو روک لو اگر نہ روک سکے تو مجھے دوبارہ اپنے سامنے حاضر کر لو تو سمجھ لوں گی کہ تم مجھ پر حاوی ہو اور میری زندگی کی تار ٹوٹنے والی ہے اور اگر میں تمہارے منتر تنتر پڑھنے سے حاضر نہ ہوئی تو سمجھ لینا کہ میں تم پر بھاری پڑ سکتی ہوں پھر بھی اگر میری باتیں تمہاری عقل میں نہ آئیں اور تم یہاں سے نہ گئے تو پھر مقابلہ ضرور ہو گا جس میں تم مجھ سے ضرور نقصان اٹھاؤ گے لو پھر میں جا رہی ہوں لگاؤ اپنی طاقت، کر لو مجھے حاضر، لو اپنے گھر کی خیر......" یہ کہہ کر وہ شو...... و...... کرتی ہوئی چلی گئی اور ساتھ ہی باجی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

عامل صاحب کافی دیر تک مغز ماری کرتے رہے جنتر منتر تنتر پڑھتے رہے لیکن وہ اسے حاضر کرنے سے قاصر رہے یعنی اس نے نہ حاضر ہونا تھا اور نہ ہی وہ حاضر ہوئی۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا آخر تھک ہار کر عامل

صاحب چلتے بنے۔

اگلے دن دس بجے کا وقت باجی کو پھر دورہ پڑ گیا سب گھر والے اور رشتہ دار چھوٹے بڑے مجھے منع کرتے رہے روکتے رہے کہ اتنے بڑے عامل سے وہ قابو نہیں آئی تو اس بدبخت کے سامنے تم کس باغ کی مولی ہو ان سب کے منع کرنے کے باوجود بھی میں نے اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کا نام لے کر اپنے پیر و مرشد کو یاد کر کے چھری کو پکڑا اس پر آیت الکرسی اور چاروں قل شریف پڑھ کر دم کیا اور اس چارپائی کو جس پر باجی بے ہوش پڑی ہوئی تھی چاروں طرف چھری سے لکیر کھینچ دی باجی کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو پکڑ کر سورۃ یٰسین پڑھنا شروع کی۔ یہ بتا تا چلوں کہ سورۃ یٰسین شریف کا ورد مہینوں کے ساتھ میں کافی عرصہ سے جاری رکھے ہوئے تھا اس لئے پہلی مبین پر پہنچ کر باجی پر پھونک دیا اور ساتھ پانی پر بھی دم کیا جو میں نے گلاس اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا دائیں ہاتھ سے میں نے باجی کی چھوٹی انگلی کو پکڑ رکھا تھا۔ دوبارہ یٰسین شریف پڑھنا شروع کی دوسری مبین پر پہنچ کر پھر پھونکیں لگائیں پھر تیسری بار ابتداء سے سورۃ یٰسین پڑھنا شروع کی تیسری مبین پر پہنچ کر پھونک لگائی تو وہ حاضر ہو گئی بولی۔

’’مجھے چھوڑ دو مجھے تکلیف نہ پہنچاؤ...... میں اذیت میں ہوں میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میری باجی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جسے تم بار بار آ کر تکلیف پہنچاتی ہو۔‘‘

’’تمہاری باجی نے میرے گھر یعنی درخت کے نیچے ہماری رہائش کی جگہ پیشاب کیا تھا۔‘‘

’’میرے پڑھ کر پھونکنے پر تم کو تکلیف ہو رہی ہے تو باجی کو بیس پچیس دن سے مسلسل تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہو جس سے سارے گھر والے تکلیف میں مبتلا ہیں اور پریشان بھی۔‘‘ اس بار میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئی اس کا مطلب مجھے فوراً سمجھ میں آ گیا کہ وہ باتوں باتوں میں حیلے بہانے سے مجھے پڑھنے سے روکنا چاہتی تھی تو میں نے پھر ابتداء سے سورۃ یٰسین شریف پڑھنا شروع کی، چوتھی مبین پر پہنچ کر میں نے پھر پھونک ماری پھر ابتداء سے یٰسین شریف پڑھنے لگا پانچویں مبین پر پھر پھونک ماری۔ اور ساتھ ہی پڑھتے ہوئے پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے کہا کہ۔ ’’ہائے میں مر گئی مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو مجھے تکلیف ہو رہی ہے...... میں وعدہ کرتی ہوں دوبارہ تمہاری باجی کے پاس نہیں آؤں گی خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔‘‘

’’پہلے عامل سے تو تم بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہی تھیں اسے نہ صرف دھمکیاں دے رہی تھی بلکہ چیلنج بھی کر رہی تھی اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانے بھی گئی تھیں اب تجھے کیا ہو گیا ہے اب تمہاری طاقت کہاں اور کدھر گئی اس وقت تو تم بھاگ گئی اب کیوں نہیں بھاگ سکتی۔‘‘

’’اس عامل کی بات اور تھی میں اسے پہلے سے اچھی طرح جانتی تھی میرا اس سے پہلے بھی ایک دفعہ واسطہ پڑ چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ یہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان سکا اس لئے میں نے اسے چیلنج کیا تھا اور بھاگ گئی اس کے بیوی بچوں کے پاس نہیں گئی تھی بلکہ میں اسے ڈرانے کے لئے کہہ رہی تھی۔‘‘

’’میں کوئی عامل تو نہیں پھر کیوں نہیں بھاگ سکتی۔‘‘

’’نہیں اس کی بھی کوئی وجہ ہے تم کو نہیں بتا سکتی لہٰذا تم مجھے اپنے خدا اور رسولؐ کے صدقے چھوڑ دو میری چھوٹی چھوٹی بیٹیاں میری جدائی میں رو رہی ہوں گی۔‘‘

’’تم کس مذہب سے تعلق رکھتی ہو جو بار بار مجھے خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہی ہو۔‘‘

کہنے لگی۔ ’’میرا مذہب ہندو ہے میں ہندنی ہوں۔‘‘

’’تمہاری کتنی بیٹیاں ہیں اور ان کی عمر کتنی ہے اور ان کے نام کیا ہیں۔‘‘

’’میری دو بیٹیاں ہیں بڑی کی عمر 19 سال اور چھوٹی کی 17 سال ہے۔‘‘

’’اور ان کے نام بھی بتا دو۔‘‘

’’بڑی کا نام کامنی اور چھوٹی کا نام شامنی ہے ہمارا ٹھکانہ گاؤں کے شمال کی جانب رائے حیات خان کھرل کی زمین میں درخت کے نیچے ہے اور اس درخت کے نیچے تمہاری باجی نے پیشاب کیا تھا۔‘‘

میں نے کہا تم نے بیس پچیس دن سے میری باجی کو اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ جس کو میں تکلیف پہنچا رہی ہوں اس کے بھی دو ننھے منے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں بڑی بچی چار سال کی اور چھوٹا بچہ ڈیڑھ سال کا جس کا ابھی ماں کے دودھ پر ہی گزارہ ہے ان بچوں کی تکلیف تمہیں معلوم نہیں لیکن تمہیں اپنی چھوٹی چھوٹی بچیاں 17 سال کی شامنی اور 19 سال کی کامنی ایک دن میں ہی یاد آنے لگیں کہ وہ گھر میں اکیلی تم کو یاد کر کے رو رہی ہیں جبکہ تمہیں ان کے پاس آئے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا میں ان معصوم بچوں کو دیکھوں۔‘‘

’’میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔‘‘ میں نے پھر شروع سے یٰسین شریف پڑھنا شروع کی تو اس نے بھی میری منتیں کرنا شروع کی جیسے جیسے میں پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے وہ بھی زور زور سے بلند آواز سے چیخ و پکار کر رہی تھی ساتھ ہی ساتھ منت سماجت بھی جاری رکھے ہوئے تھی رو رہی تھی۔

’’میں جل گئی ہائے میں مر گئی تمہیں تیرے نبی کا واسطہ، خدا کا واسطہ مجھے چھوڑ دو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں دوبارہ ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گی۔‘‘

’’اس کی کیا گارنٹی ہے کہ پھر نہیں آؤ گی۔‘‘

’’میں اپنے بھگوان کی قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں کہ پھر کبھی نہیں آؤں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں اپنے خدا اور رسولؐ کے طفیل تم کو چھوڑتا ہوں لیکن جانے سے پہلے تم کوئی نشانی دے کر جاؤ تاکہ ہمیں مکمل یقین ہو جائے کہ تم چلی گئی ہو۔‘‘

بولی۔ ’’ٹھیک ہے میں صحن کی دیوار کی چند اینٹیں گرا جاتی ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’نہیں ایسا نہ کرنا بلکہ ہم اس

ضرورت رشتہ

ایک نوجوان کریانہ فروش کو ایسی نیک دل خاتون کا رشتہ درکار ہے جس کا دل آٹے کی بوری کی طرح محبت سے بھرا ہوا ہو، اور جس کی چاہت میں بے وفائی کے برادے کی ملاوٹ نہ ہو۔

خاتون عام گھریلو عورتوں کی طرح بات کو نمک مرچ لگا کر کرنے کی عادی نہ ہو تو یہ ایک اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔ تاہم دشمنوں کے سینے پر مونگ دلنے کی پوری اجازت لڑکی کو ہوگی۔ بشرطیکہ وہ تیل دیکھے تیل کی دھار نہ دیکھے۔ نکاح انتہائی سادگی مگر پروقار طریقے سے ہوگا۔ گویا ہینگ لگائی جائے گی نہ پھٹکری۔ صرف رنگ چوکھا لانے کی کوشش کی جائے گی۔

جہیز میں مٹی کا تیل اور مسور کی دال آنا ضروری ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کو حلف اٹھانا ہوگا کہ وہ جوتوں میں دال نہیں بانٹے گی۔

(ثمینہ خان۔منڈی بہاالدین)

باہر والی دیوار پر ہانڈی رکھ دیتے ہیں تم اسے گرا کر چلتی بنتا اور پھر کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کرنا۔"

کہنے لگی۔ "مجھے منظور ہے میں ایسا ہی کروں گی۔"

میرے اشارے پر گھر والوں نے دیوار پر ہانڈی رکھ دی میں نے جیسے ہی باجی کی انگلی کو چھوڑا آیت الکرسی اور چاروں قل شریف پڑھ کر چھری کو زمین سے نکالا تو ہانڈی دھڑام سے نیچے زمین پر گری اس کے ٹوٹنے سے زوردار آواز آئی، اس کے بعد باجی اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری اس کامیابی پر سب گھر والے بہت خوش تھے سب ہی مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔

اگلی صبح سب گھر والے اور تمام آئے ہوئے رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے میں تقریباً پندرہ بیس دن وہاں پر رہا اس دوران میرا بخار بھی اتر گیا اور اتنے دن اس چڑیل نے بھی کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا اکیسویں روز میں بھی اپنے گھر ننکانہ صاحب واپس آ گیا۔

جیسے میں گھر پہنچا تو اسی وقت وہ چڑیل پھر باجی کے اندر آ گئی باجی کی پھر وہی پہلے جیسی بے ہوشی کی کیفیت بہنوئی احمد علی بڑے پریشان کہ اب کیا کروں تنہا ہوں بچوں کو سنبھالوں یا بیوی کو دیکھو آخر اللہ کا نام لے کر بچوں اور بیوی کو ہمسایوں کے حوالے کر کے مجھے بلانے کی بجائے سائیکل کو نکالا اور پندرہ سولہ کلومیٹر کا فاصلہ درمیان میں دریائے راوی کو کراس کر کے شیخوشریف اپنے مرشد سید مشکور حسین شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور سرکار کو سارا واقعہ من وعن سنایا کہ کیسے باجی بیمار ہوئی کس طرح اسپتالوں میں بیس پچیس دن پھرتے پھراتے وہاں سے جواب ملا کیسے چڑیل کا علم ہوا اور پھر جس طرح عامل کو لائے لیکن وہ شکست کھا کر چلتا بنا پھر حنیف شاکر نے اس کو کس طرح قابو کر کے نکالا جتنے دن حنیف ہمارے ہاں موجود رہا تو چڑیل نے بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کیا جیسے ہی وہ چلا گیا تو اس کم بخت چڑیل نے پھر آنا شروع کر دیا ہے اب بھی بے ہوشی کی حالت میں بیوی اور اپنے دونوں معصوم بچوں کو ہمسایوں کے حوالے کر کے سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

سرکار نے کہا۔ "احمد علی پریشان نہ ہو محمد حنیف شاکر میرا مرید ہے مجھ سے اس نے ایک دفعہ ایک چلہ 40 روز کاٹنے کی اجازت لی تھی میں نے نہ صرف اس کو اجازت بھی دی بلکہ اس کے پیچھے روحانیت کے ذریعے خیال بھی رکھا اور مکمل طور پر تحفظ بھی دیا اس لئے چڑیل کو حنیف نے قابو کر لیا۔

"ہاں ہمارے مرید سے ایک غلطی ہو گئی اگر وہ غلطی نہ کرے تو چڑیل کی کیا مجال کہ دوبارہ واپس آتی۔"

بہنوئی احمد علی نے عرض کی۔ "سرکار محمد حنیف سے کیا غلطی ہوئی؟"

تو سرکار نے فرمایا۔ "حنیف سے یہ غلطی ہوئی کہ چڑیل پر قابو پا کر نکال تو دیا لیکن تعویز لکھ کر دینا بھول گیا۔ چلو دیر آئے درست آئے اب ہم یہ کام کئے دیتے ہیں۔"

سرکار نے تعویز لکھ کر دیتے ہوئے فرمایا۔ "احمد علی یہ تعویز اپنی بیوی کے گلے میں ڈال دینا، چڑیل اب کبھی بھی اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی اور نہ ہی اندر داخل ہو سکے گی اگر ایسا کرنا چاہے گی تو جل کر راکھ ہو جائے گی ہاں البتہ ایک بات وہ یہ کہ تم اب اس گاؤں کو خیر باد کہہ دو فوری طور پر نہ سہی لیکن جس وقت تمہارے پاس ہجرت کر کے دوسری جگہ رہنے کی گنجائش اور ہمت ہو اس وقت ضرور اس پر عمل کرنا۔"

احمد علی نے سرکار سے اجازت لے کر گھر واپس آ گئے اور آتے ہی سرکار کے دیئے ہوئے تعویذ کو باجی کے گلے میں ڈال دیا وہ دن اور آج کا دن وہ چڑیل پھر کبھی بھی نہیں آئی۔

لیکن میرے بہنوئی نے مرشد کے کہنے پر عمل کیا اس گاؤں سے ہجرت کر کے جڑانوالہ شہر میں رہائش اختیار کر لی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

☠

کالو

نینا خان-کراچی

موذی کتنی لوگوں کی دل کی دھڑکن بن گیا تھا اگر وہ ایک پل کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہوتا تو گھر والے بے چین ہو جاتے تھے لیکن اس موذی نے ایک وقت پر لوگوں کو حیران کرکے رکھ دیا اور پھر……

ایک ایسی حقیقت جسے دل و دماغ کسی صورت قبول نہیں کرتا مگر یہ حقیقی واقعہ ہے

آج جو میں کہانی اپنے قارئین کو سنانے جا رہی ہوں وہ دراصل ایک حقیقت ہے، جسے پڑھ کر ہو سکتا ہے کہ آپ سب اس حقیقت کو محض کہانی سمجھیں ایک من گھڑت قصہ سمجھیں یا پھر ایک ذہنی بناوٹی بات سمجھیں۔ لیکن یہ کہانی سو فیصد سچی ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔

یقین مانئے کبھی کبھی انسان کے ساتھ کچھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں جنہیں فراموش کرنا اس لئے ناممکن ہوتا ہے کہ جو حقیقت ہونے کے باوجود حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ان واقعات پر یقین کر لیں اور جب کہ دماغ کہتا ہے کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ دل اور دماغ کی جنگ میں کبھی جیت دل کی ہوتی ہے اور کبھی دماغ کی۔ اور جس بات کی گواہی اگر دل دے تو اسے مان لینا چاہئے۔

اپنے بچپن سے یہ واقعہ میں سنتی آئی ہوں تو سوچا کیوں ناں اس واقعہ کو میں اپنے قارئین سے شیئر کروں اس واقعہ کے کچھ اور پہلو کو ذہن میں اجاگر کرنے کے لئے میں اپنی نانی کے گھر گئی اور نانی سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ نانی کی پیدائش کیوں کہ ہندوستان کی ہے ہجرت کر کے

پاکستان اپنے بچپن میں آگئی تھیں بہت سے رشتہ دار ہندوستان میں ہی مقیم ہیں آج بھی تو نانی کا اکثر آنا جانا ہندوستان میں لگا ہی رہتا تھا تو بہت سے واقعات نانی سے سنتے ہی رہتے ہیں۔

تو نانی نے اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں بتائی کہ:

"میری نانی کے تایا کی جب شادی ہوئی تو پورا گھرانہ بہت خوش تھا۔ تایا کی دلہن یعنی تائی جان بہت خوش اخلاق باکردار اور ایک سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ بہو بن کر تمام گھر والوں کا دل اپنی خوش اخلاقی اور سلیقہ شعاری سے جیت لیا۔ پہلی بہو ہی گھر میں بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔ چند ماہ میں ہی بہو نے خوشی کی نوید سنادی بہو کی امید کی خبر سن کر تو پورا گھرانہ خوشی سے دیوانہ ہوئے جا رہا تھا۔ تمام گھرانے میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ کس طرح یہ نو مہینے کا وقت بیتے گا اور کوئی ننھا مہمان گھر کے آنگن میں دوڑے گا۔

چند مہینے گزرنے پر گود بھرائی کی رسم بھی کی گئی رت جگے کا اہتمام کیا گیا طرح طرح کے پکوان بنائے گئے، گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا خوب گانے باجے کی محفل سجائی گئی خوشی خوشی دن گزرے اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب تائی جان نے ایک بچے کو جنم دیا۔

جس بچے کی پیدائش کی دھوم پورے گھرانے میں مچی ہوئی تھی۔ جس بچے کی پیدائش کا ہر ایک فرد کو شدت سے انتظار تھا بچے کی پیدائش پر سب گھرانے والے حیرت میں مبتلا ہو گئے بچے کو دیکھ کر سب گھر والے حیرت سے زیادہ خوف زدہ تھے۔ دائی اماں جنہوں نے کئی بچوں کو جنوایا تھا وہ خود بھی ڈیلوری کروا کر حیرت زدہ رہ گئیں کہ یہ کیسا بچہ دنیا میں آیا ہے۔ اللہ کا یہ کیسا معجزہ ہے یا پھر کوئی عبرت ہے کیوں کہ وہ جو بچہ تائی جان نے پیدا کیا تھا وہ کوئی انسان کا بچہ نہیں تھا" وہ ایک سانپ تھا ایک کالے رنگ کا سانپ پیدا ہوا تھا۔"

دائی اماں نے میری نانی جان کی دادی سے کہا۔"

مہرالنساء یہ کیسی انہونی ہوئی ہے یہ کیا تمہاری بہو نے ایک سانپ کو جنم دیا ہے اگر لوگوں کو پتا چلا تو کتنی بدنامی ہوگی کہ ایک مسلمان گھرانے میں سانپ پیدا ہوا ہے اگر ہندوؤں کو پتا چلا تو وہ اس سانپ کو لے کر چلے جائیں گے کہ یہ دیوتا بھولے ناتھ کا اوتار ہے۔ اس سانپ کو تم ابھی سے مار ڈالو تاکہ ہندوؤں میں کوئی بات نہ پھیلے۔ خاندان بھر اور محلے بھر میں یہ کہہ دیں گے کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔"

دائی اماں کی بات سن کر دادی جان نے کہا۔"

ہاں دائی اماں تم بالکل ٹھیک کہتی ہو میں ابھی قاسم کے ابا سے بات کرتی ہوں۔ تم بھی محلے میں یہی بات رکھنا کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔"

دادی جان کی بات سن کر دائی اماں فوراً بولیں۔" ہاں ہاں! مہرالنساء میں محلے میں یہی بات رکھوں گی اب تم جلدی سے اس سانپ کو مارنے کی تیاری کرو ، اچھا میں اب چلتی ہوں۔"

دائی اماں تو اپنی بات کر کے چلی گئیں تو دادی جان دادا جان اور اپنے بیٹے قاسم کے پاس آ کر بولیں۔

"ارے قاسم تم اور تمہارے ابا جلدی سے جا کر اس سانپ کو مار کر دفنا کر آ جاؤ...... اگر یہ بات ہندوؤں تک پہنچی تو وہ اپنے بھگوان کا اوتار سمجھ کر لے جائیں گے۔ پورے خاندان میں بدنامی ہوگی۔"

دادی جان کی بات پر دادا جان بولے۔

"جاؤ قاسم جلدی سے اپنی بیوی سے اس سانپ کو جا کر لے آؤ ہم رات کے اندھیرے میں ہی اسے قبرستان میں دفنا آئیں گے۔"

ابا کی بات پر قاسم اپنی بیوی شہناز بیگم کے پاس جا کر کہنے لگے۔

"شہناز بیگم لاؤ اس سانپ کو مجھے دے دو میں اور ابا رات کے اندھیرے میں اسے دفنا آئیں۔"

اپنے شوہر قاسم کی بات سن کر شہناز بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیوں کہ ماں تو پھر ایک ماں ہی ہوتی ہے نا۔ نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھ کر ایک بچے کو پل پل بڑھتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس کی حرکت کو محسوس کرنا اس کی دھڑکنوں کو محسوس کرنا۔ پھر وہ کیسے اپنے ہی ہاتھوں اپنے بچے کو مرنے کے لئے کیسے دے سکتی ہے۔ شہناز بیگم نے روتے ہوئے

قاسم سے کہا۔

"سنئے جی میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے بچے کو مت ماریئے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اسے کسی کے سامنے نہیں آنے دوں گی آپ لوگ خاندان بھر میں کہہ دیں کہ ہمارا بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے اپنے اماں ابا سے کہیں کہ میرا بچہ مت ماریں میں اسے اپنے پاس سب سے چھپا کر رکھوں گی۔"

شہناز کا رونا اور منت کرنا قاسم سے نہ دیکھا گیا تو انہوں نے کسی طرح اپنے اماں ابا کو راضی کر لیا کیوں کہ قاسم بھی اس بچے کے باپ تھے اماں ابا یہ کہہ کر راضی ہو گئے کہ وہ سانپ کسی کے سامنے نہیں آئے گا۔"

شہناز پیالے میں اپنا دودھ نکال کر اس سانپ کو پلاتی اسے سب کی نظر سے چھپا کر رکھتیں اور اسے پیار سے کالو پکارتیں۔ پرانے وقتوں میں گھروں میں دیواروں کے اندر طاق بنائے جاتے تھے شہناز نے اپنے کمرے کی دیوار میں بنے طاق کے اندر کالو کو چھپا دیا کرتیں اور گھر کا کام کرتیں کالو کی زبان تو نہ تھی کہ وہ بول پاتا مگر شہناز بیگم کی ہر بات کو بخوبی سمجھتا تھا ان کی بات کو مانتا بھی تھا۔

کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ شہناز بیگم پھر سے امید سے ہو گئیں سب گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں اس بار بھی کالو کی طرح کوئی سانپ نہ پیدا ہو جائے۔ بہر حال اللہ اللہ کر کے دن گزرے تو اللہ نے قاسم اور شہناز کی دعاؤں کو سن کر انہیں ایک بہت پیاری سی بیٹی سے نوازا مہرالنساء نے پوتی کا نام بڑے پیار اور محبت سے فردوس رکھا۔ فردوس گھر بھر کی لاڈلی اور ہر ایک کی آنکھوں کا تارا تھی۔ فردوس جب بھی کھیلتے ہوئے کمرے میں آتی تو کالو کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتی تو اماں شہناز بیگم سے کہتیں کہ" اری شہناز اپنے اس کالو سانپ کو طاق میں رکھ دیا کر میری بچی فردوس ڈر جاتی ہے کتنی بار کہا ہے مجال ہے کہ تیرے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔"

"اماں کالو نے آج تک کبھی کسی کو نقصان تک نہیں پہنچایا وہ تو بہت معصوم ہے میری ایک آواز پر فوراً طاق میں جا کر بیٹھ جاتا ہے..... فردوس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔"

شہناز بیگم کی بات سن کر مہرالنساء بولیں۔" بس بس میری فردوس اس سانپ کے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ اس کالے ناگ نے اگر میری بچی کو ڈس لیا تو پھر کیا ہوگا بس میں نے کہہ دیا کہ اس کالے ناگ کو میری فردوس سے دور رکھو۔

اماں کی بات پر شہناز بیگم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اماں میں خیال رکھوں گی۔"

اپنے کمرے میں آ کر شہناز بیگم نے کالو کو اٹھا کر بستر پر بیٹھا کر بڑے پیار سے کہا۔

"کالو میرے بچے میں جانتی ہوں کہ میں نے تجھے جنم دیا ہے تیری ماں ہوں، پر بیٹا تو انسان نہیں ہے۔ اس لئے میرے کمرے سے جاتے ہی طاق میں جا کر بیٹھ جایا کر۔ یہاں سب تجھ سے گھبراتے ہیں خوف زدہ ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی کی آہٹ سنا کر تو چھپ جایا کر ورنہ کہیں لوگ تجھے مجھ سے جدا نہ کر دیں تجھے اپنی کوکھ میں رکھ کر نو مہینے تک سنبھالا ہے، میں تیری جدائی سہہ نہیں سکتی۔"

جیسے ہی کمرے میں کسی کی آنے کی آہٹ سنی تو کالو جھٹ سے طاق میں جا کر چھپ کر بیٹھ گیا قاسم نے کمرے میں آتے ہی شہناز بیگم سے کہا۔

"شہناز اماں تمہاری شکایت کر رہی تھیں بھئی ذرا خیال رکھا کرو۔ کالو کو سب سے چھپا کر رکھو ورنہ تم جانتی ہو کہ ہم نے اپنے کالو کو دنیا کی نظر سے چھپا کر کیوں رکھا ہے اگر ہندو مذہب کے لوگوں کو پتا چلا تو وہ کالو کو لے جائیں گے اور ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔" قاسم کی بات سن کر شہناز بیگم بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں میں نے کالو کو سمجھا دیا ہے آئندہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

دن مہینے اور سال یونہی چھپا چھپا کر کالو کو رکھتے ہوئے گزرے اللہ نے پھر سے شہناز بیگم کی گود میں ایک بیٹا دیا۔ جس کا نام مہرالنساء نے ایوب رکھا اب تو ایوب کو سب گھر والوں کا لاڈلا بن گیا فردوس اور ایوب لاڈ پیار سے پلنے لگے تھے۔ شہناز بہت خوش تھیں لیکن اندر سے اداس بھی تھیں کیونکہ پہلی بار ماں بننے کا احساس دینے والا ان کا کالو کوئی انسان نہ تھا۔ ان کی پہلی اولاد ہوتے ہوئے بھی کالو

کو کسی اپنے کا پیار نہ ملا تھا۔ اس لئے شہناز کالو کو دل و جان سے پیار کرتیں اور اس کے کھانے پینے کا بھی خوب خیال رکھتیں۔

کالو ایک بہت فرمانبردار اولاد تھا شہناز بیگم کی ہر بات سمجھتا اور اس پر عمل کرتا تھا کالو بہت پیار اور محبت سے شہناز بیگم سے لپٹتا اور چپکتا تھا سب گھر والے کالو کا اس طرح پیار کرنا دیکھ کر ڈرتے گھبراتے کہ کہیں وہ کالو شہناز بیگم کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے مگر کالو کی محبت پا کر شہناز بیگم خوش تھیں وہ بھی دل و جان سے کالو کو چاہتی تھیں۔

پرانے وقتوں میں جلدی ہی شادی کر دینے کا رواج ہوتا تھا جیسے ہی فردوس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو مہر النساء اور باقی گھر والوں کو بھی اس کی شادی کی فکر ہو گئی کئی رشتہ دیکھنے کے بعد آخرکار ایک رشتہ سمجھ میں آ گیا اور فردوس کی شادی پکی کر دی گئی۔

شادی کی تیاریاں جب مکمل کر لی گئیں تو لال ابا نے قاسم اور شہناز بیگم کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"دیکھو بھئی قاسم اب گھر میں مہمان جمع ہوں گے شادی کا گھر ہے مہمانوں کے ساتھ ساتھ بیٹی کے سسرال والے بھی آئیں تو اگر کالو کو کسی نے دیکھ لیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ اب سے کالو کو کسی طرح سے چھپا کر رکھنا ہوگا تاکہ بیٹی کے سسرال والوں اور رشتہ داروں سے سارے چھپایا جا سکے۔"

لا اماں کی بات سن کر قاسم بولے۔ "ہاں آپ والدوں ٹھیک کہتے ہیں اب کالو کو طاق میں چھپا کر اس طاق کو ڈھک کر رکھیں گے تاکہ کالو پر کسی کی نظر تک نہ پڑے۔" شہناز بولیں۔

"ہاں..... اماں فکر نہ کریں میں کالو کو طاق میں بیٹھا کر طاق کو اچھی طرح ڈھک دیں گے۔"

مہر النساء جھٹ سے بولیں۔ "ایسا ہی ہونا چاہئے کوئی غلطی نہ ہو۔"

شادی کی رسومات شروع ہو گئیں فردوس کو مایوں بٹھایا گیا گھر کو خوب سجایا گیا روشنیوں سے جگمگاتا گھر شہنائیاں بجائی جا رہی تھیں خوب ہلا گلا اور شور تھا گھر کی سب سے لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی شادی جو تھی مایوں کی رسم ادا کی گئی تو خاندان کی عورتوں نے مل کر خوب گانے گائے ناچ گانے کی محفل نے پورے گھر کو رونق بخشی ہوئی تھی۔

رسم کے بعد جب سسرال والے چلے گئے اور بس قریب کے کچھ خاندان کے لوگ گھر میں رکے ہوئے تھے تو شہناز بیگم سب کی نظر بچا کر پیالے میں دودھ لے کر اپنے کمرے میں گئیں اور طاق میں چھپے بیٹھے کالو کو دودھ پلا کر تسلی کا سانس لیا کافی دیر سے کالو نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا تو وہ بہت بھوکا تھا شہناز بیگم بہت فکرمند تھیں مہمانوں کی وجہ سے اسے کچھ دے نہیں سکی تھیں۔

بارات کی آمد ہونے والی تھی سب تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک خاندان کی ایک خاتون کسی کام سے شہناز بیگم کے کمرے میں گئیں تو طاق پر ڈلے پردے کو دیکھ کر جیسے ہی اسے اٹھایا تو وہ ڈر گئیں وہاں ایک کالے رنگ کا بڑا سا سانپ بیٹھا تھا۔ شہناز بیگم فوراً کمرے میں آ گئیں اس خاتون رشتہ دار کو کہا۔

"تم گھبراؤ نہیں میں اس سانپ کو بھگا دوں گی باہر جا کر اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ سب مہمان گھبرا جائیں گے۔" خاتون نے گھبرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے مگر تم اسے بھگا دو ورنہ یہ سب کو ڈس لے گا۔ جلدی بھگانا اسے۔"

خاتون تو ڈر کر وہاں سے چلی گئیں مگر شہناز بیگم فکرمند ہو گئیں کہ اگر کسی سسرالی رشتے دار نے دیکھ لیا تو فردوس اپنے سسرال میں سب کو کیا بتائے گی کیا جواب دے گی وہ کہ اس کے گھر میں سانپ کا کیا کام ہے کہیں فردوس کے سسرال والوں کو پتا چل گیا کہ فردوس کا بھائی ایک سانپ ہے اس کی ماں نے ایک سانپ کو جنم دیا ہے یا اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ بیٹی کے سسرال کا معاملہ ہے کہیں اسے طعنے سننے کو نہ ملیں کہیں اس کا گھر خراب ہو جائے یا خدا میں کیا کروں اب کالو کو کہاں چھپاؤں، دیر میں تو بارات گھر آ جائے گی اور مہمانوں سے گھر بھرا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔

اپنی فکرمندی میں شہناز بیگم نے طاق میں بیٹھے سے کہا۔

"کالو جو میں تجھ سے کہہ رہی ہوں اسے ذرا غور سے سن آج تیری بہن فردوس کی شادی ہے بارات گھر آئے گی لوگ تجھ سے ڈرتے ہیں تو باراتیوں کے سامنے مت آنا ورنہ لوگ تجھے ایک سانپ سمجھ کر مار ڈالیں گے میں لوگوں کو کیسے بتاؤں گی کہ تو ان لوگوں کو کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہاں کوئی میری ممتا کو نہیں سمجھے گا پھر تیری بہن کا گھر بستے بستے خراب نہ ہو جائے بارات آنے والی ہے مجھے باراتیوں کے لئے شکرانہ بھی تیار کرنا ہے بہت سے کام ہیں۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ اس طاق میں یہ ایک ڈبہ رکھ دیتی ہوں ذرا آگے کر کے تو اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھے رہنا کوئی بھی کمرے میں آئے تو اس ڈبے کے پیچھے سے مت نکلنا ٹھیک ہے ناں..... تو سمجھ گیا ناں۔"

شہناز بیگم کی بات سن کر کالو نے اپنی زبان باہر نکالی اور اپنا سر ہلایا تو وہ مطمئن ہو گئیں اور اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

پہلے شادیوں میں باراتیوں کا استقبال کرنے کے لئے چاولوں کا شکرانہ بنایا جاتا تھا جسے باراتیوں کو کھلا کر ان کا سواگت کیا جاتا تھا یہ بھی ایک رسم تھی شکرانہ دراصل سادے چاولوں کو ابال کر اس کو تھال میں سجا کر اس پر گھی اور شکر ڈال کر پیش کیا جاتا تھا اس ڈش کو شکرانے کا نام دیا جاتا ہے۔

شہناز بیگ بیگم چاولوں کو ابالنے میں مصروف تھیں وہ کالو کی طرف سے مطمئن ہو چکی تھیں کہ اس وقت کمرے میں ایک بچہ چلا گیا اس نے طاق میں رکھے ڈبے کو دیکھا تو وہ ڈبہ مٹھائی کا تھا۔ اس بے چارے نے چارپائی پر کھڑے ہو کر مٹھائی کا ڈبہ اٹھایا تو اس کے پیچھے کالے رنگ کے بڑے سے سانپ کو دیکھ کر ڈر گیا ڈبہ پھینک کر زور زور سے چیخنے لگا کالو کو ماں کی بات یاد تھی وہ فوراً ہی گھر کی نالی میں جا کر چھپ گیا۔ جیسے ہی بچے کی چیخ پر لوگ کمرے میں جمع ہوئے تو وہاں کوئی سانپ نہ تھا بچے کی بات کو گھر والوں نے وہم کا نام دے دیا شہناز بیگم بہت پریشان ہوئیں اور دل میں سوچنے لگیں کہ کالو کہاں جا کر چھپا ہوگا۔ وہ ابھی اپنی پریشانی اور سوچوں میں گم تھیں کہ مہر النساء کی آواز پر چونک گئیں۔

"ارے شہناز اب جلدی سے شکرانہ تیار کرو بارات آتی ہوگی یہاں کوئی سانپ نہیں ہے آپ سب بھی باہر برآمدے میں چلیں۔"

مہر النساء سب مہمانوں کو لے کر وہاں سے بڑے سے برآمدے میں چلی گئیں شہناز بیگم نے کھولتا ہوا ابلے چاولوں کا پانی نالی میں ڈال دیا جہاں کالو چھپ کر بیٹھا تھا انجانے میں شہناز بیگم کے ہاتھوں ہی کالو موت کا شکار ہو گیا جسے دنیا سے چھپا کر کئی سال تک ممتا کے سہارے پالا محبت شفقت اور اپنائیت دی آج ایک ماں کے ہاتھوں انجانے میں ماں کا اپنا بڑا بیٹا کالو جل کر خاک بن گیا۔

ابھی شہناز بیگم کالو کی موت سے بے خبر تھیں کہ بارات آ گئی شکرانہ تیار کر کے باراتیوں کا سواگت کیا گیا قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا نکاح پڑھانے کے بعد سب نے ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارک باد دی پھر کھانا کھلا کر باراتیوں کے ساتھ اپنی لاڈلی بیٹی فردوس کی رخصتی کر دی۔

سب مہمانوں کے جاتے ہی شہناز بیگم اور قاسم نے مل کر پورے گھر میں کالو کو ڈھونڈا پر کالو کہیں نہیں ملا۔ شہناز بیگم کا رو رو کر برا حال تھا کہ قاسم کے چھوٹے بھائی ناظم جب نالی کے پاس گئے تو انہوں نے کالو کا مردہ جسم وہاں دیکھ کر اسے اٹھا کر برآمدے میں لے آئے۔ کالو جل کر مر چکا تھا۔ اسے مردہ دیکھ کر شہناز بیگم خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں اور قاسم بھی بہت اداس تھے انہیں دلاسہ دے رہے تھے۔ ناظم جب کالو کو اٹھا کر باہر لے جانے لگے تو شہناز بیگم روتے ہوئے بولیں۔

"ناظم اسے مت لے کر جاؤ آج رات میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی اسے جی بھر کر دیکھوں گی۔" شہناز بیگم رو رو کر سب سے التجاء کر رہی تھیں تو سب نے انہیں اجازت دے دی رات بھر کالو کے مردہ جسم کو اپنے سینے سے لگائے روتی رہیں روتے روتے ان کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہیں کالو ان کے پاس آ کر قدموں میں بیٹھا ہے اور سر اٹھا کر بولنے لگا ہے اسے بولتا دیکھ کر حیران ہو کر اسے دیکھتی ہیں وہ کہتا ہے کہ۔

"ماں میں یقیناً بڑا بیٹا ہوں خدا نے مجھے انسان نہیں بنایا تو کیا ہوا مجھے آپ کی محبت سے تو نوازا ہے آپ روحت ماں میں اب اپنی صحیح جگہ پر ہوں، آپ نے مجھے بہت محبت دی میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ جاتے جاتے آپ کی بڑی اولاد ہونے کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ میرا مردہ جسم بیچ دینا جب ضرورت ہو تو سمجھ لینا کہ تمہارے بیٹے نے ایک اچھا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا۔" اتنا کہہ کر کالو ان کے قدموں سے چلا گیا اور وہ نیند کی حالت میں زور زور سے کالو کالو کہہ کر پکار رہی تھیں کہ سب گھر والے ان کے اردگرد جمع ہو گئے شہناز بیگم بھی جاگ گئیں تو سب نے کالو کے مردے جسم کو دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا سب حیران تھے شہناز بیگم نے جب مردہ جسم دیکھا تو وہ سونے کا بن چکا تھا وہ اٹھیں اور اس کا مردہ جسم لے جا کر ساس کے قدموں میں رکھ دیا اور روتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ماں ساری عمر آپ نے جس کالو سے نفرت کی آج وہ جاتے ہوئے اس گھر کا بڑا بیٹا ہونے کا فرض نبھا گیا وہ میرے خواب میں آیا تھا اور کہا کہ "ماں میں اپنے بیٹا ہونے کا فرض ادا کئے جا رہا ہوں اسے بیچ کر اپنے تمام مسائل حل کر لینا۔"

مہر النساء کے ساتھ ساتھ گھر کے ہر فرد کی آنکھ اشکبار تھی۔ کالو تو اب نہیں رہا تھا مگر اس نے ایک بیٹا ہونے کا فرض ادا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو نانی کے خاندان میں پیش آیا تھا اس کے علاوہ میں نے نانی سے پوچھا کہ:

"نانی یہ جو ڈراموں فلموں میں دکھاتے ہیں کہ ایک سانپ کو مارو تو وہ انتقام لیتا ہے۔ یہ بات سچ ہے یا صرف ڈرامائی اور فلمی بات ہے۔"

میرے سوال پر نانی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اس بات کی تو میں خود چشم دید گواہ ہوں، ہمارے چچا سسر انڈیا میں رہتے تھے۔ ہم سب انڈیا گئے ہوئے تھے کہ وہ رات کو اپنی گاڑی تیز چلاتے ہوئے شہر کی طرف جنگل سے گزر رہے تھے ان کی گاڑی کے سامنے ایک سانپ آ گیا وہ اسے کچلتے ہوئے گاڑی سے تیزی سے شہر کی طرف آ چلے گئے جب ان کے گھر لڑکا پیدا ہوا تو اس کے نچلے ہونٹ پر یعنی تھوڑی پر دو پھن تھے۔ دور دور سے لوگ اس بچے کو دیکھنے آ رہے تھے۔ میں نے خود اس بچے کو دیکھا تھا کہ اس کی تھوڑی پر دو سانپ کے پھن تھے اب ماں اس کو اپنا دودھ پلانے سے بھی ڈرتی تھی پیالے سے پلاتی تھی بچا سسر نے معلوم کیا مسجد کے امام صاحب سے تو انہوں نے بتایا کہ: "تم نے اپنی گاڑی سے ایک سانپ کو کچل ڈالا تھا یہ اس کی بدعا ہے اور انتقام۔"

نانی کی بات سن کر میں نے پھر پوچھا۔" نانی اس بچے کا کیا ہوا؟"

نانی نے بتایا۔" وہ بچہ تو کچھ دن میں ہی مر گیا تھا جو نہیں سکا وہ سانپ انتقام تو لیتا ہے۔" نانی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ اس دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر کوئی اور یہ واقعات بتاتا تو میں بھی شاید یقین نہ کرتی مگر نانی خو اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہیں اور کالو والا واقعہ ان کے خاندا میں پیش آیا غلط نہیں ہو سکتا۔

انہی واقعات سے جڑا ایک واقعہ مجھے میری دوست رمشاء نے بھی سنایا وہ واقعہ سن کر تو میں مزید حیران ہوئی رم نے بتایا کہ:

"میرے خاندان میں بھی کچھ اس طرح کا واق پیش آیا ہے اور میں اپنے بچپن سے یہ واقعہ بھی کے منہ سنتی ہوئی آئی کچھ لوگ نہیں خاندان کے تمام مع اور بزرگوں نے چشم دید گواہ ہونے کا بتایا ہے کہ میری دا کی بہن کے دو بچے ایک ساتھ پیدا ہوئے وہ جڑواں پتا ہے کون تھے ایک لڑکی جو بہت ہی خوب صورت تھی او دوسرا اس لڑکی کے ساتھ بیٹا ہونے والا سانپ تھا۔"

اس کی بات پر میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا "واقعی ایک انسان لڑکی اور دوسرا اسی کے ساتھ آ ہی کوکھ سے پیدا ہوا سانپ۔ یا اللہ یہ کیسی قدرت ہے؟ ہم انسان اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

رمشاء نے مزید بتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار تمہاری نانی کی بات سے میں ا

کرتی ہوں کہ سانپ انتقام لیتے ہیں کیونکہ یہ واقعہ میرے ابو کی سگی خالہ یعنی دادی کی سگی بہن کے ساتھ پیش آیا۔ میری دادی اس بات کی چشم دید گواہ ہیں دادی چونکہ بڑی بہن تھیں اور میرے ابو ان کی پہلی اولاد اس لئے ابو بھی اس واقعہ کے گواہ ہیں۔"

اس کی بات پر میں نے جھٹ سے پر تجسس ہو کر کہا۔" بس کر یار رمشا اور کتنا سسپنس کریئیٹ کرے گی اب جلدی سے مدعا بتا نا میں بے تاب ہو رہی ہوں اصل واقعہ جاننے کے لئے۔"

میری بات سن کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"مجھے پتا ہے یہ ساری بے تابی اپنی نئی اسٹوری کے لئے ہے OK بتاتی ہوں۔"

"اب سن واقعہ کچھ ایسا ہے کہ میرے ابو کی خالہ کے گھر جب جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تو اس میں ایک لڑکی اور دوسرا سانپ تھا۔ خالہ خالو نے لڑکی اور اس سانپ یعنی اس کے جڑواں کو لوگوں کی نظر سے چھپا کہ پالنا شروع کر دیا وہ لڑکی اپنے ہی جڑواں سے ڈرتی اور خوف زدہ ہو جاتی تو خالہ نے اسے الگ کر کے اس کی دیکھ بھال کی وقت گزرتا رہا سب نے تو اس سانپ کو مارنے کا کہا مگر خالہ اور خالو نہ مانے اور دنیا کی نظروں سے چھپا کر اس سانپ کی پرورش کرتے رہے اب وہ چار سال کے ہو چکے تھے لڑکی تو سب گھر والوں کے ساتھ پیار محبت اور کھیلتے ہوئے رہتی اور جبکہ سانپ کو پوشیدہ رکھ کر صرف ماں باپ کا پیار ملتا تھا۔ ایک دن خالہ خالو گھر میں نہیں تھے اور باقی گھر والے بھی کہیں پروگرام میں گئے ہوئے تھے کہ لڑکی کھیلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی تو وہاں اپنے جڑواں کو بستر پر دیکھ کر ڈر زدہ سے چیخنے لگی اس کے چیخنے پر سارا محلہ جمع ہو گیا لڑکی کے چاچو بھی آ گئے مگر محلے والوں کو یہ نہ بتا سکے کہ یہ اس لڑکی کا بھائی ہے محلے والوں نے مل کر اس سانپ کو مار دیا۔ جب خالہ خالو گھر آئے تو بہت روئے اب رونے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے کسی کو کیا کہتے کہ جس کو تم لوگوں نے مارا ہے وہ ہماری اولاد تھی۔

کچھ ہی وقت گزرا تو اس گھر کی تمام لڑکیاں مر گئیں اس سانپ کی جڑواں لڑکی بھی مر گئی، خالو کے تمام بھائیوں کی بیٹیاں بھی اچانک ایک کے بعد ایک مرتی چلی گئیں اس گھر میں تو کہرام مچ گیا ماتم کا سماں بندھ گیا۔

پھر خالو نے مسجد کے امام صاحب سے معلوم کیا کہ "امام صاحب ہمارے گھر کی تمام بیٹیاں یکے بعد دیگر فوت ہو چکی ہیں میرے چھوٹے بھائی کی ابھی بیٹی ہوئی وہ بھی فوت ہو گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ ہمارے خاندان کی کوئی بھی بیٹی اب زندہ نہیں رہی اور جو پیدا ہوتی ہے وہ بھی نہیں بچی۔"

"امام صاحب کچھ تو ہماری رہنمائی کریں کہ آخر یہ ہمیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔"

امام صاحب نے خالو کی روداد سن کر کافی دیر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور گویا ہوئے۔

"تمہارے گھر ایک سانپ نے جنم لیا تھا؟"

خالو نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔" اس سانپ کو مار ڈالا گیا تھا یہ اسی کی بدعا ہے یا پھر یہ کہہ لو کہ یہ ایک سانپ کا انتقام ہے اب تمہارے خاندان میں کوئی بیٹی نہیں ہو گی کیونکہ اس سانپ کی موت کی وجہ تمہاری بیٹی بنی تھی۔"

امام صاحب کی بات سن کر خالو گھر چلے آئے اس کے بعد ابو کی خالہ کے سسرال میں آج تک کسی بیٹی کی پیدائش نہیں ہوئی صرف لڑکے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

رمشاء کی بات سن کر نانی کی بات کی مزید تصدیق ہو گئی واقعی اللہ کی قدرت اور اس کی مصلحت کو سمجھنا ہم انسانوں کا کام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں صرف ہمیں ہی نہیں بنایا بلکہ کئی اور جہاں آباد کئے ہیں جنہیں ہم سمجھ تو سکتے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے......شاید یہ واقعات بھی انہی جہان میں سے کسی ایک جہان کی نشاندہی کرتے ہوں۔ جسے سمجھنے سے انسانی ذہن قاصر ہے۔

میری سچے دل سے اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اور اس طرح کے واقعات سے ہمیں محفوظ رکھے۔ (آمین)

اسرار

محمد خالد شاہان۔صادق آباد

قسط نمبر 20

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

پھر شاہان نے عمارہ کو لے کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے ڈاکو کی چوری کی ہوئی کشتی کو چھپا رکھا تھا اس نے کشتی کو دوبارہ سمندر میں ڈالا۔عمارہ کو اٹھا کر کشتی میں بیٹھایا ہی تھا کہ جنگل میں لاوے کا کھولتا ہوا گرم آگ کے شعلے بلند کرتا ہوا دریا بڑی تیزی سے بہہ کر اس کی طرف آنے لگا۔عمارہ خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی شاہان نے چپو نکال کر کشتی کو پوری طاقت سے ہٹانا شروع کردیا لاوے کا دریا آگ کا دریا سمندر میں آ کر گرا تو ایک زوردار دھماکہ ہوا۔اور سمندر کی اگلی لہریں بخارات اڑاتی ابلتی ہوئی پیچھے کو دوڑیں۔

شاہان اس دوران میں کشتی کو سمندر میں کافی دور لے گیا تھا کشتی چھوٹی اور ہلکی تھی دور جاتی ایک بڑی لہر کے ساتھ ہی ساحل سے کافی دور نکل گئی۔

شاہان تیز تیز چپو چلا کر کشتی کو کھلے سمندر میں لے آیا اس نے جزیرے کی طرف دیکھا وہاں سوائے آگ کے شعلوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔دور سمندر میں کافی فاصلے پر بحری ڈاکوؤں کا جہاز واپس جا رہا تھا کپتان سمندر میں تیر کر اپنے جہاز میں پہنچ گیا تھا عمارہ کشتی میں بے ہوش پڑی تھی آگ میں لپٹا ہوا جزیرہ اب دور سے ایک دہکتا ہوا انگارہ لگ رہا تھا۔

کشتی سمندر میں کسی نامعلوم ساحل کی طرف بڑھی چلی جارہی تھی۔تھوڑی دیر بعد ڈاکوؤں کا جہاز بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور پھر جزیرے کا دہکتا ہوا انگارہ بھی دکھائی دینا بند ہوگیا۔

شاہان نے اب غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس عمارہ کو پلانے کے لئے نہ تو پانی ہے اور نہ ہی کوئی پھل کہ جس سے وہ اپنی بھوک مٹا سکے۔کیونکہ ابھی کچھ اندازہ نہیں تھا کہ انہیں کب تک سمندر میں بے یار و مددگار سفر کرنا پڑے گا۔

دن غروب ہونے لگا۔شاہان نے عمارہ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اسے ہوش آ گیا مگر اس کی آنکھوں سے اب بھی وحشت ٹپک رہی تھی اس نے چاروں طرف سمندر ہی سمندر دیکھا تو ایک بار پھر غش کھا کر شاہان کی گود میں گر پڑی شاہان نے بڑے آرام سے اسے ایک طرف کشتی میں لٹا دیا اور خود چپو چلانے شروع کردیئے۔سورج ڈوب گیا سمندر پر رات کا اندھیرا چھا گیا۔سیاہ کالے سمندر کے آئینے میں ستاروں کا عکس جھلملانے لگا۔

شاہان نے چپو ایک طرف رکھ دیئے اور ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ اس کی منزل کہاں ہوگی اسے ایک بار پھر ناگن اور شریم کا خیال ستانے لگا۔جو ہیرن کے ہوٹل میں شاہان کا انتظار کر رہے تھے۔اور جن کے بارے میں شاہان کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔

عمارہ ابھی تک سو رہی تھی سورج کی پہلی روشنی کے ساتھ ہی شاہان نے دور ایک بادبانی جہاز کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سوچنے لگا کہ کہیں یہ بھی بحری ڈاکوؤں کا جہاز نہ ہو۔ پراسرار بادبانی جہاز قریب آرہا تھا دن کی روشنی میں اس کے سفید بادبان ہوا میں جھول کر چمک رہے تھے سمندر کی لہریں پرسکون تھیں جہاز جب قریب آگیا تو شاہان نے دیکھا کہ اس کے عرشے پر کوئی ملاح یا مسافر نہیں تھا اس نے سوچا کہ شاید مسافر اور ملاح ابھی تک سو رہے ہوں گے لیکن دن کافی نکل آیا تھا اور ملاح اتنی دیر نہیں سویا کرتے۔

شاہان کی کشتی جہاز کے سامنے سے گزری تو اس نے جہاز کے بادبان کے ساتھ ایک انسانی لاش لٹکتی ہوئی دیکھی جس کے گلے میں پھندہ پڑا ہوا تھا شاہان چپو چلاتا کشتی کو جہاز کے پہلو میں لے آیا جہاز کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بادبانوں میں بھری ہوا کے زور پر اپنے آپ سمندر میں چلا جارہا تھا شاہان بڑا ہی حیران ہوا کہ یہ لاش کس لئے جہاز پر لٹک رہی ہے۔ اس کو خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ جہاز بحری لیٹروں کا ہو اور انہوں نے کسی ملاح کو پھانسی کی سزا دے کر بادبان کے ستون سے لٹکا دیا ہو مگر بحری لٹیروں کے بادبان سفید نہیں ہوتے اور پھر ان کے جہاز پر انسانی کھوپڑی والا جھنڈا لہرا رہا ہوتا ہے پھر اس لاش کا کیا راز ہوسکتا ہے یہ جہاز خالی کیوں تھا۔

عمارہ جاگ چکی تھی۔ شاہان نے اسے سارا حال بیان کیا کہ وہ کشتی کو جہاز کے ساتھ لگا کر جہاز پر چڑھنے کی کوشش کرے گا چلتے جہاز پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے لیکن شاہان نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ عمارہ کو ساتھ لے کر زیادہ دیر تک سمندر میں سفر نہیں کرسکتا تھا اسے ایک جہاز کی ضرورت تھی عمارہ ڈر رہی تھی وہ ایسے جہاز پر نہیں جانا چاہتی تھی جس کے اوپر انسانی لاش لٹک رہی ہو۔ اور جس میں نہ کوئی مسافر دکھائی دے رہا ہے اور نہ ہی کوئی ملاح لیکن شاہان نے کہا۔ ”تمہیں میرے ہوتے ہوئے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس جہاز پر چل کر معلوم کرلے گے کہ یہ جہاز کس کا ہے اور کہاں جارہا ہے۔“ جہاز کے پہلو میں ایک موٹا سا رسہ لٹک رہا تھا اس کا سرا سمندر کی لہروں کے تھوڑا اوپر ہی تھا۔ شاہان کشتی کو اس کے قریب لے گیا اور رسے کو لپک کر پکڑ لیا رسی کو پکڑتے ہی کشتی کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور اس کی رفتار جہاز کے برابر ہوگئی شاہان نے جلدی سے رسے کو کشتی کے ساتھ باندھ دیا اور عمارہ سے بولا۔ ”میں اس رسے کی مدد سے جہاز کے اوپر جارہا ہوں میرے پہنچنے کے بعد تمہیں بھی اسی رسی کے ذریعے اوپر آنا ہوگا۔“ شاہان نے رسے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور پاؤں جہاز کے پیندے سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا عرشے پر پہنچ کر اس نے جہاز کے خالی عرشے پر ایک نگاہ ڈالی وہاں کوئی بھی نہیں تھا ویرانی سی چھائی ہوئی تھی اس نے عمارہ کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ عمارہ نے سات برس جنگل میں درختوں پر الٹا لٹکتے پھلانگتے گزارے تھے وہ رسہ پکڑ کر بڑی جلدی سے اوپر چڑھ آئی۔

شاہان بھائی یہ جہاز تو خالی ہے۔“

”ہاں یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔“ وہ لٹکتی ہوئی لاش کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ لاش کو دیکھتے ہی عمارہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

شاہان نے اسے تسلی دی کیونکہ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی لاش کی حالت خراب تھی گوشت گل سڑ گیا تھا اور جگہ جگہ سے سفید ہڈیاں نظر آرہی تھی کھوپڑی ننگی تھی ناک اور آنکھوں کی جگہ سوراخ بنے ہوئے تھے۔

شاہان نے عمارہ سے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو میں ذرا جہاز کے نیچے جاکر معلوم کرتا ہوں کہ ملاح کہاں ہے۔ اور یہ جہاز خالی کیوں ہے۔“

عمارہ نے کہا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ شاہان عمارہ کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ نیچے جاکر اس کے ساتھ کیسے واقعات پیش آئے۔ اس نے عمارہ کو عرشے پر ایک جگہ ترپال کے پیچھے بیٹھا کر کہا۔

”عمارہ بہن تمہارا نیچے جانا ٹھیک نہیں ہے نہ جانے نیچے کیا کچھ پیش آجائے یا ڈاکو گھات لگائے بیٹھے ہوں میں

تو مر نہیں سکوں گا لیکن تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہاں ٹھہر کر میرا انتظار کرو۔“

عمارہ نے بے تابی سے کہا۔ ”زیادہ دیر نہ لگانا تم۔“

”میں نیچے جارہا ہوں کسی دوسرے شہر نہیں جارہا۔ بس ایک دومنٹ میں واپس آجاؤں گا۔“ عمارہ کو عرشے پر ترپال کے پیچھے چھوڑ کر شاہان جہاز کے نیچے اتر گیا۔ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔

نیچے صرف ایک ہی منزل تھی جہاں ایک جگہ گودام میں ناریل کا ڈھیر پڑا تھا لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اس میں لکڑی کی گول میزیں اور تخت بچھے تھے۔ چھت سے فانوس لٹک رہے تھے مگر یہاں بھی انسان کہیں نہ تھے۔

باورچی خانے میں کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں کنڈوں سے سوکھی مچھلیوں اور پیاز کے چھلکے لٹک رہے تھے کونے میں پانی کا بڑا ڈرم بھرا ہوا تھا چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ صرف ایک چولہے میں راکھ ابھی تک گرم تھی۔ جس سے اندازا ہوتا تھا کہ یہ دو دن پہلے جلی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ دو دن پہلے اس جہاز پر موجود تھے شاہان کپتان کے کیبن میں آگیا یہ چھوٹا سا نیچی چھت والا کمرہ تھا۔ درمیان میں گول میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اوپر شمع دان جھول رہا تھا دیوار کے ساتھ تپائی پر تانبے کا ایک بڑا جگ اور گلاس پڑے تھے۔

یہاں کوئی ایسی چیز شاہان کو دکھائی نہ دی جس سے یہ پتہ چلتا کہ اس جہاز کے لوگ کہاں گم ہوگئے۔ شاہان کپتان کے کیبن سے نکل کر باورچی خانے کے سامنے سے ہوکر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اسے ایسی آواز۔ سنائی دی جیسے کسی۔ نے کیبن کا دروازہ کھول کر زور سے بند کیا ہو۔

وہ وہیں رک گیا اس نے پلٹ کر جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھا۔

تمام گردش سنسان تھی اسے یوں لگا جیسے ایک سایہ سا کپتان کے کیبن سے نکل کر گودام کی طرف گیا ہے شاہان گودام کی طرف آگیا گودام کا دروازہ بند تھا۔ اس نے کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی اندر ہے۔

شاہان نے آواز دی اندر کون ہے باہر آؤں، کوئی جواب نہ آیا شاہان نے دو تین آوازیں دی۔ پر خاموشی چھائی رہی۔

شاہان نے زور لگا کر اندر والی چٹخنی توڑ دی دروازہ کھل گیا شاہان جلدی سے گودام کے اندر آگیا۔ یہاں کوئی بھی نہ تھا نہ کوئی سامان نہ کوئی انسان۔ تو پھر اندر سے کنڈی کس نے لگائی تھی خالی جہاز کا راز اور زیادہ گہرا ہوگیا اور دروازہ کس نے زور سے بند کیا تھا۔

وہ سایہ کس کا تھا جو گودام کی طرف بھاگا تھا۔ شاہان نے دروازے پر دستک دی پھر کہا۔ ”اندر جو کوئی بھی ہے دروازہ کھولے۔“ اندر کسی کے زور زور سے سانس لینے اور خرخرانے کی آواز آئی۔

شاہان نے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا اور لپک کر کیبن کے اندر آگیا وہ بڑا حیران ہوا کیونکہ کپتان کا کیبن ویسے ہی خالی تھا جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا مگر سوال یہ تھا کہ ابھی ابھی جو کسی کے زور زور سے سانس لینے کی اور خرخرانے کی آواز آرہی تھی وہ کس کی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا راز ہے۔

اب اسے عمارہ کا خیال آیا کہ وہ اوپر اکیلی بیٹھی ہوگی وہ پہلے ہی گھبرا رہی تھی۔ چل کر اس کی خبر لینی چاہیے۔

شاہان سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل کے عرشے پر آگیا بادبان پر اوپر لگی سڑی انسانی لاش اسی طرح لٹک رہی تھی ترپال کے قریب جاکر شاہان نے دیکھا کہ عمارہ وہاں نہیں ہے اس نے دل میں کہا کہ اسے منع بھی کیا تھا کہ اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں مت جانا۔

شاہان نے عمارہ کو آوازیں دی کوئی جواب نہ آیا سوائے سمندر کی لہروں کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ شاہان پریشان سا ہوگیا کہ عمارہ کہاں چلی گئی۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کے پیچھے نیچے نہ چلی گئی ہو۔ وہ دوبارہ جہاز کی دوسری منزل پر آگیا اس نے ایک ایک کونہ چھان مارا۔ عمارہ کو آوازیں بھی دیں لیکن وہ کہیں

بھی نہ تھی۔ جیسے اسے سمندر نگل گیا تھا شاہان نے سارا جہاز چھان مارا تھا۔ عمارہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔

شاہان کی پریشانی اور بڑھ گئی وہ کہاں گم ہوسکتی تھی اگر کسی نے اسے اٹھالیا ہے اور وہ اسے اٹھا کر لے گیا ہے تو آخر اسے اسی جہاز پر ہونا چاہئے تھا لیکن جہاز میں تو عمارہ کہیں بھی نہ تھی۔

سارے کا سارا جہاز خالی پڑا تھا اور ہوا میں پھولے ہوئے بادبان اسے سمندر کی لہروں پر کسی نامعلوم منزل کی طرف لئے جارہے تھے۔

شاہان نے عرشے پر چل کر عمارہ کو ایک بار پھر تلاش کرنے کے خیال سے اوپر جانے والی سیڑھی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں پھر وہی زور زور سے سانس لینے اور خرخرانے کی آواز آئی۔

شاہان نے راہداری میں دونوں جانب دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا راہ داری سنسان پڑی تھی یہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔

عمارہ کہاں غائب ہوگئی یہ دونوں سوال شاہان کے دماغ میں بھوت بن کر ناچ رہے تھے اور اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ان سوالوں کا جواب حاصل کرکے رہے گا۔

وہ عمارہ کے گم ہونے اور آسیبی جہاز کا راز حل کرکے چھوڑے گا۔ عین اسی وقت شاہان کو ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بڑے دردناک لہجے میں کسی کو آواز دے رہا ہوں آواز بھاری تھی اور کسی مرد کی لگتی تھی جیسے کوئی بڑی تکلیف میں ہو اور مدد کے لئے پکار رہا ہو جو نیچے جاتا تھا اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی راستہ نیچے ضرور جاتا ہوگا کیونکہ اس قسم کے جہازوں کے نیچے ایک سرنگ قسم کی لمبی گلی ہوتی ہے جہاں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ملازم اس وقت چپو چلاتے ہیں جب سمندر میں ہوا بند ہونے سے بادبان بیکار ہوجاتے ہیں۔ اور وہ جہاز کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ راہداری کے کونے میں شاہان کو ایک گول سوراخ مل گیا جس کے نیچے رسی لٹک رہی تھی شاہان نے کان لگا کر سنا وہ دردناک آواز اسی سوراخ میں سے آرہی تھی۔

شاہان نے سوراخ کے اندر جھانک کر دیکھا نیچے ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اس نے غور سے سنا آواز کسی الوکھی زبان میں تھی لیکن شاہان اسے سمجھ رہا تھا آواز بار بار بڑے درد بھرے انداز میں مدد کے لئے کسی کو بلا رہی تھی یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی سخت تکلیف میں ہے۔

شاہان نے سوراخ کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "تم کون ہو۔" شاہان کے اس سوال پر تہہ خانے میں اچانک خاموشی چھا گئی۔

شاہان نے تین چار بار آوازیں دیں مگر نیچے سے کوئی جواب نہ آیا دردناک آواز آنی پھر بند ہوگئی شاہان رسی کی مدد سے نیچے اتر گیا۔ یہ ایک لمبی سرنگ تھی جس کی چھت شاہان کے سر کو چھو رہی تھی دونوں طرف جہاز کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے گول سوراخ تھے جن میں لمبے لمبے آدھے چپو باہر سمندر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ لکڑی کے تختوں پر لکڑی چلانے والے غلام کی جگہ بنی ہوئی تھی مگر وہاں کوئی غلام یا ملاح نہ تھا۔ درمیان میں ایک جگہ ثابت تھی شاہان حیرانی میں کھو گیا۔ کہ یہاں کے ملاح بھی کہاں غائب ہوگئے وہ خرخرانے کی آواز اور پھر دردناک آواز کس کی تھی۔ وہ چیخ کس کی تھی یہ سب کچھ کیا معمہ ہے۔

جہاز سمندر کی لہروں پر ڈولتا ہوا سمندر میں بہہ جا رہا تھا عمارہ کہاں گم ہوگئی تھی جہاز کے اوپر لاش کس نے لٹکائی تھی اس جہاز کا کپتان اور ملاح کہاں تھے۔ شاہان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ شاہان واپس جانے کے لئے مڑا وہ رسی کی مدد سے اوپر چڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک دل دہلا دینے والی ڈراؤنی چیخ بلند ہوئی اور پھر ایک زرد آنکھوں والی ایک بلی کسی کونے سے نکل کر اچھلی اور شاہان کے سر پر آکر بیٹھ گئی اس نے شاہان کی کھوپڑی کو اپنے خونی پنجوں میں جکڑ لیا اور اسے اپنے خونی پنجوں سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگی اگر شاہان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس خونخوار بلی نے اس کی کھوپڑی بیچ میں سے کھول دی تھی۔ شاہان چونکہ عام انسان نہیں تھا اور اس کی کھوپڑی تو گویا چٹان کے پتھروں کی بنی ہوئی تھی اس لئے بلی اپنے مقصد میں ناکام رہی تھی۔ بلی بھی اپنے دل میں ضرور حیران

ہوئی ہوگی کہ یہ کس قسم کی کھوپڑی ہے کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہورہا۔

شاہان نے ہاتھ مار کر بلی کو نیچے گرادیا کالی بلی الٹ کر لکڑی کے فرش پر گری اور وہیں گم ہوگئی شاہان اس تاریک غار سے نکل کر دوسری منزل پر آگیا وہ ڈیک پر آنے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو اسے پھر ایک سایہ کپتان کے کیبن سے نکل کر گودام کی طرف جاتا دکھائی دیا۔

شاہان نے عمارہ کو آواز دی۔ عمارہ کیا یہ تم ہو۔ جواب میں وہی گہری خاموشی تھی۔ شاہان گودام میں گھس گیا، یہاں اس نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس کی آنکھوں کے سامنے گودام کے فرش پر ایک آدمی کی تازہ کھائی ہوئی لاش پڑی تھی شاہان دھک سے رہ گیا پہلا خیال اسے یہ آیا کہ کہیں یہ عمارہ کی تو لاش نہیں ہے۔ گودام کی دیوار کے گول سوراخ میں سے دن کی روشنی آرہی تھی۔

شاہان نے اس روشنی میں جھک کر دیکھا کہ لاش ایک مضبوط بدن والے بے کٹے آدمی کی تھی۔ اور گلے میں اس کے سونے کی زنجیر تھی۔

شاہان کو اس نتیجے میں پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ یہ جہاز کے کپتان کی لاش ہے لاش کا ایک بازو اور ایک پوری ٹانگ کھائی ہوئی تھی گردن پر گول سوراخ تھا جہاں خون جمع ہوا تھا صاف لگتا تھا کہ یہاں سے کپتان کا خون پیا گیا ہے شاہان مدہم روشنی میں لاش کو غور سے دیکھتا رہا یہ کوئی بڑا ہی خونی قسم کا آسیبی جہاز تھا شاہان کو صرف عمارہ کی طرف سے پریشانی تھی کہ وہ کہاں گم ہوگئی ہے۔

کہیں اس پر تو کوئی مصیبت نہیں ٹوٹ پڑی ہے۔ جس آسیب کا اس جہاز پر سایہ تھا کہیں وہ اسے بھی ہڑپ نہ کر گیا ہو۔ مگر پھر عمارہ کی لاش کہیں تھی شاہان جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا جاتا وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اور اب وہ جلد سے جلد اس جہاز کے رازوں پر سے پردہ ہٹانا چاہتا تھا اس وقت اگر سانگن اور شریم بھی اس کے ساتھ ہوتے تو شاید یہ راز بہت دیر پہلے کھل چکے ہوتے۔

شاہان لاش کو گھسیٹ کر باہر راہداری میں لے آیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان کی لاش کی اور بے حرمتی ہو وہ اسے سمندر میں پھینکنا چاہتا تھا وہ ادھ کھائی لاش اٹھا کر اوپر عرشے یعنی ڈیک پر لے آیا۔ وہ لاش کو سمندر میں پھینکنے ہی والا تھا کہ جہاز کی سب سے نچلی منزل سے بلی کے رونگٹے کھڑے کردینے والی چیخ کی آواز سنائی دی۔

شاہان بھی ایک بار کانپ اٹھا مگر وہ بڑے ہی مضبوط دل کا انسان تھا اور بہادر نڈر بھی اس نے لاش اٹھا کر سمندر میں پھینک دی اس وقت سمندر میں دھوپ چمک رہی تھی لاش کے سمندر میں گرتے ہی آسمان پر جیسے آندھی سی چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا اور تیز ہواؤں میں جہاز کے بادبان غباروں کی طرح پھول گئے اور جہاز لہروں پر بڑی تیزی سے بہنے لگا۔ ہوا طوفان کی شکل اختیار کرنے لگی سمندر میں بڑی بڑی موجیں اٹھ اٹھ کر جہاز کے پیندے سے ٹکراتیں اور اسے اٹھا کر دوسری طرف لے جاتیں بادل زور زور سے گرجنے لگے سمندر میں چاروں طرف دن کے وقت ہی اندھیرا چھا گیا تھا پھر بارش شروع ہوگئی بادبان کے کھلے ہونے کی وجہ سے جہاز زیادہ شدت سے ڈول رہا تھا کیونکہ طوفانی ہوائیں ان میں بھر جانے سے جہاز موجوں پر لکڑی کے کھلونے کی طرح اچھل اچھل کر نیچے گر رہا تھا۔

شاہان کو یقین تھا کہ عمارہ ابھی تک اس خالی اور پراسرار جہاز میں ہے اس لئے وہ اس جہاز کو غرق ہونے سے ہر حالت میں بچانا چاہتا تھا تاکہ عمارہ زندہ رہے۔ وہ جہاز کے اس مستول پر چڑھ گیا جہاں لاش لٹکی ہوئی تھی وہ بادبانوں کی رسی کاٹ کر اسے نیچے گرا دینا چاہتا تھا کہ جہاز کی رفتار میں جو بھیانک تیزی آگئی تھی وہ کم ہوجائے اور جہاز سمندر میں غرق ہونے سے بچ جائے۔

مستول یعنی لکڑی کے موٹے کھمبے پر سب سے اوپر چڑھ کر شاہان نے محسوس کیا کہ وہ گلی سڑی لاش کے بالکل سامنے آگیا ہے بارش بادلوں کی گرج اور گھٹاؤں کے اندھیرے میں لاش کی کھوپڑی اور جسم کی ہڈیاں سڑے گوشت میں سے جگہ جگہ جھانک رہی تھیں کھوپڑی میں آنکھوں کے دونوں سوراخوں میں خنجر کی سرخ چمک سی

محسوس ہوئی اس نے کوئی خیال نہ کیا اور خنجر سے بادبان کے رسے کاٹنے میں مصروف ہوگیا۔

جب رسے کٹ گئے اور پھولے ہوئے بادبان ایک زبردست دھماکے کے ساتھ نیچے جہاز کے عرشے پر دھڑام سے گر پڑے تو جہاز کا مستول بھی زور سے ہل گیا لاش کو بھی ایک دو جھٹکے لگے اور اس کی کھوپڑی میں سے شوں شوں کی آوازیں نکلنے لگی شاہان ابھی تک اوپر اس جگہ پر تھا جہاز کھڑے ہوکر ملاح دور سمندر میں آنے والے جہاز یا سمندری چٹانوں یا زمین کو دیکھ کر آواز بلند کرکے جہاز کے مسافروں اور کپتان کو خبردار کیا کرتے ہیں شوں شوں کی آواز پر شاہان نے چونک کر لاش کی کھوپڑی کی طرف دیکھا بارش شاہان کے چہرے پر پڑ رہی تھی لاش سے بھی بارشوں کا پانی ٹپک رہا تھا لاش کی آنکھوں کے سوراخوں میں سے دو دو سرخ آنکھیں انار کے دانوں کی طرح چمک رہی تھی شاہان نے سوچا کہ اس کھوپڑی میں یہ آنکھیں کس کی ہے واپس اترتے ہوئے شاہان کو لاش کے بالکل قریب سے ہوکر جانا تھا جب وہ لکڑی کے مستول پر آہستہ آہستہ پھسلتا ہوا لاش کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک دم سے کھوپڑی کے سوراخ میں سے پھنکاریں مارتے دو سانپ باہر نکلے اور شاہان کی گردن کے گرد لپٹے اور اس کی آنکھوں پر بار بار ڈسنے لگے اگر وہ دونوں ہاتھوں سے ان کو پکڑ لیتا تو وہ نیچے گر جاتا اگر چہ اسے نیچے گرنے سے کچھ بھی نہ ہوگا پھر وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ اتنی سی بات پر ہاتھ چھوڑ کر سانپوں کے لئے چھلانگ لگا دے۔

اس نے سانپوں کو ڈسنے دیا اور خود پھسلتا ہوا نیچے اتر آیا زہریلے سانپ ابھی تک اس کی گردن کے گرد لپٹے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کو ڈس رہے تھے۔

ڈسنے سے سانپوں کے دانت زخمی ہوگئے کیونکہ شاہان کی آنکھیں پتھر سے بھی زیادہ سخت تھیں۔ شاہان نے دونوں سانپ کو پکڑ کر اتارا اور کچل کر سمندر میں پھینک دیا۔

بادبانوں کے گرنے سے جہاز کے ڈولنے میں کافی فرق آ گیا تھا لیکن بارش اور سمندری طوفان میں کوئی فرق نہ آیا تھا لیکن بارش بھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

وہ حیران تھا کہ وہ کسی جادوگر یا شیطان نگری میں تو نہیں ہے کہ سمندر میں گرنے سے اتنا زبردست طوفان آ گیا تھا یہ معمہ شاہان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ عرشے پر بارش اور سمندر کی لہریں جو چھاڑیں بن کر اس پر پڑ رہی تھی وہ ترپالوں کی اس چھت کے نیچے آ گیا جو جہاز کے ایک سمت میں بنی چرخی لگی ہوئی تھی اس چرخی کو رسی باندھ کر ایک جگہ روک دیا گیا تھا کیونکہ جہاز کی کوئی منزل نہ تھا تو پھر چاہے وہ جس سمت چلا جا۔ئے بادلوں کی گرج بجلی کی چمک اور سمندر کی بڑی بڑی موجوں سے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جہاز لہروں پر ڈولتا ہوا کسی نامعلوم سمت کو چلتا جا رہا تھا۔

شاہان نہیں چاہتا تھا کہ جہاز کسی چٹان سے پاش پاش ہوجائے کیونکہ اس قسم کے طوفانوں میں سمندری جہاز تنہا بے سہارا ہوکر چلا گیا۔

شاہان عمارہ کو اسی جہاز سے واپس حاصل کرنا چاہتا تھا اس کا دل کہہ رہا تھا کہ عمارہ اسی جہاز میں کسی جگہ موجود ہے پر کہاں ہے۔

شاہان یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بادلوں کی گرج ہلکی ہونے لگی طوفان کا زور بھی ٹوٹنے لگا اور بارش بھی کم ہوگئی بادلوں کے ہلکے ہوجانے سے سمندر پر غروب ہوتے سورج کی تیز تیز روشنی کی طرح طوفان ختم گیا تھا مگر سمندر کی بڑی بڑی موجیں جہاز کو اسی طرح دھکیلتی لے جا رہی تھیں۔

شاہان ترپال کے نیچے ایک گٹھے پر بیٹھا عمارہ نا گن اور شریم کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کی پیٹھ جنوب کی طرف تھی جہاں دور سمندر میں سے نکلے ہوئے ایک پہاڑ کی چوٹی کسی محل کا گنبد سورج کی سنہری روشنی میں چمک رہا تھا شاہان اٹھ کر عرشے پر ٹہلنے لگا تو اس کی نظر جنوب کی طرف تھی دور بلند پہاڑیوں کی چوٹی پر چمکتے ہوئے محل کے گنبد کو دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ کھڑے کھڑے سوچنے لگا کہ یہ محل کیسا ہے کہ سمندر کی اتھاہ گہرائی میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا ہے جہاں کو سمندری موجیں بڑی تیزی سے اس محل کی طرف لئے جا رہی تھی۔

دن چھپ رہا تھا سورج سمندر میں ڈوبا۔ سمندر میں اندھیرا چھا گیا شاہان نے پہاڑ کی طرف دیکھا جو کہ اب سمندر میں فاصلے پر نہیں تھا محل میں سب سے اوپر کسی جگہ روشنی ہو رہی تھی کیسے وہاں کوئی روشنی ہوسکتی ہے یہ شام ہوتے ہی جیسے اپنے آپ روشن ہوگئی ہوں شاہان کو ایک بات کی بہت ہی فکر تھی وہ سالوں سے صحراؤں میں میدانوں میں پہاڑوں میں اور سمندروں میں سفر کرتا رہا تھا اسے معلوم تھا کہ جہاز اتنی رفتار سے بڑھ رہا ہے کہ اگر اسے روکا نہ گیا تو وہ کنارے پر چڑھ جائے گا یا ساحل پر موجود کسی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا سوال یہ تھا کہ جہاز کو روکا کیسے جائے شاہان کے پاس نہ تو لنگر تھا اور نہ ہی ملاح جو جہاز کو آگے بڑھنے سے روک سکے۔ لنگر جہاز کا تھا ہی نہیں اور غلام ملاح خدا جانے کس عفریت کا نوالہ بن گئے تھے۔

شاہان نے محسوس کیا کہ پہاڑ کی چوٹی والے محل میں جلتی روشنی کبھی بجھ جاتی اور کبھی روشن ہوجاتی گویا وہاں سے سمندری جہاز کو سگنل دیئے جا رہے تھے۔ یہ کون لوگ تھے۔ جو محل سے سگنل دے رہے تھے۔ شاہان کو اب یہی معلوم کرنا تھا جس بات کا اسے سب سے زیادہ خطرہ تھا وہ یہی تھا کہ جس رفتار سے جہاز ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا یہ ضرور پاش پاش ہوجائے گا مگر اب ایسا بھی ہوا کہ جونہی ساحل قریب آیا جہاز کی رفتار اپنے آپ کم ہوگئی جوں جوں جہاز آگے بڑھ رہا تھا وہ بہت آہستہ ہو رہا تھا جب ساحل قریب آ گیا تو جہاز ...وں کی رفتار سے چلنے لگا اور پھر ایک جگہ سمندر میں ہی ...ک گیا یہاں سے ساحل کی چٹانیں ساٹھ ستر قدموں پر ...تھی شاہان کو تعجب ہوا کہ اس جہاز کو کس طاقت نے پاس ...کر روک دیا ہے۔

مگر راز کے اوپر ایک اور راز کا پردہ گرا ہوا تھا ...سے اتنی ضرورت ہی نہیں تھی کہ جہاز کے اپنے آپ ...ک جانے کے راز پر غور کرتا۔ کیونکہ اس کے سامنے ...پہاڑ تھا اور جس چوٹی پر ایک پراسرار محل تھا اس کی سب ...سے اوپر والی چھت کی کھڑکی میں ایک گول چمنی والی شمع جل رہی تھی شاہان ایک چھوٹی سی ڈونگا نما کشتی پر بیٹھ کر ساحل کی طرف چل دیا۔ سمندر کی جوشیلی لہروں نے بہت جلد اسے ساحل پر پہنچا دیا۔ یہ پتھریلا ساحل تھا شاہان نے کشتی کو پتھروں میں کھینچ کر ایک چٹان سے باندھ دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس جزیرے پر سوائے ایک بلند پہاڑ کے اور کچھ بھی نہیں ہے اس پہاڑ کے اوپر محل تھا۔ جس کی دیواریں پتھر کی تھیں اور برجیوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

محل میں صرف اوپر والی چھت کی کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی باقی سارے محل میں کہیں بھی روشنی نہیں تھی۔ رات کا اندھیرا اس پہاڑی جزیرے پر گہرا ہو رہا تھا یہاں سمندر کی موجوں کا بہت شور تھا کیونکہ وہ سمندر سے اٹھ کر ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی تھی اور جھاگ اڑاتی واپس چلی جاتی تھیں ٹکراتی لہروں کے چھینٹے شاہان تک پہنچ رہے تھے۔

آسیبی جہاز سمندر میں اکیلا کھڑا ڈول رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ لنگر نہ ہونے کے باوجود وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ اور لہروں کا مقابلہ کر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کسی طلسم ہوشربا یا آسیب نے جکڑ رکھا ہو۔

شاہان نے محل کی طرف دیکھا۔ محل پہاڑ کی چوٹی پر کافی اوپر جاکر بنا ہوا تھا خدا جانے اسے کس نے بنایا تھا اور بنانے والے اب وہاں تھے بھی کہ نہیں۔ لیکن وہاں کوئی نہ کوئی رہتا ضرور تھا۔ اس لئے کہ محل سے آسیبی جہاز کو باقاعدہ سگنل دیئے گئے تھے۔ پہاڑ کی ایک طرف پتھروں کا بنا ہوا ایک تنگ زینہ اوپر جا رہا تھا۔

شاہان نے زینہ چڑھنا شروع کیا۔ یہ زینہ پہاڑ کے اردگرد اوپر جاتا تھا پہاڑ کی دوسری طرف بھی سمندر ہی تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں سیاہی مائل دکھائی دے رہا تھا اور اس کی موجیں پہاڑ کے ساتھ پھیلی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ شاہان زینہ چڑھتا چلا گیا سیڑھیوں کے پتھر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے ان کی داڑوں کے درمیان گھاس اگی ہوئی تھی۔ زینے کی

ایک جانب سیاہ کالے پہاڑ کی اونچی دیوار تھی اور دوسری جانب گہرا سیاہ سمندر تھا۔ شاہان بے خوف ہوکر اوپر چلا جارہا تھا۔ اور آسیبی جہاز محل اور عمارہ کی گمشدگی کے راز کو حل کرنا چاہتا تھا چاہے اس کے لئے اسے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے شاہان نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرر ہا تھا۔ پہاڑ کے تین چکر لگانے کے بعد زینہ سیدھا ہوگیا اور دور اوپر پہاڑ کی چوٹی پر محل کا دروازہ دکھائی دینے لگا تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں بھی پھیکا پھیکا سا دکھائی دے رہا تھا۔

شاہان پراسرار محل کے دروازے کے سامنے جاکر رک گیا دروازہ بند تھا۔ محراب پر جنگلی بیل کی گھنی شاخوں نے سایہ کررکھا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے روشنی بہت کم تھی۔ شاہان نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا دروازہ اندر سے بڑی سختی سے بند تھا۔ محل کی دیواریں سیدھی اوپر کو چلی گئی تھیں اور دوسری منزل پر کافی اوپر جاکر دو کھڑکیاں تھیں جو بند تھیں اور وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ان کھڑکیوں میں سے بھی اندر نہیں جایا جاسکتا تھا۔ محل کی پچھلی دیوار کے نیچے اتنی گہری کھائی تھی کہ وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

اندھیرے میں سمندر کی طوفانی موجیں دور نیچے پتھروں سے ٹکرا کر بھیانک شور پیدا کررہی تھیں آسمان پر ایک جگہ سے بادل پھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ چاند کی پراسرار اور زرد روشنی میں سمندر میں کھڑا آسیبی جہاز صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شاہان کی نگاہ جہاز کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک کشتی ساحل کی طرف چلی آرہی ہے چاندنی میں اس کشتی میں بیٹھے چار انسانوں کے سائے نظر آرہے تھے۔ دو کشتی چلا رہے تھے اور دو کشتی میں صندوق رکھے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ یہ آدمی جہاز میں کہاں سے نکل آئے؟ جہاز تو بالکل خالی تھا۔

شاہان پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کشتی کو ساحل کی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا کشتی کنارے پر آکر رک گئی۔ چاروں آدمیوں نے لمبوترا صندوق جو مردہ رکھنے والے تابوت کی طرح تھا۔ اٹھایا اور پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ یہ لوگ اوپر محل پر آرہے تھے شاہان ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہوکر بیٹھ گیا اور ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ پہاڑ کا پورا چکر کاٹ کر وہ چاروں آدمی محل کے دروازے پر آکر رک گئے۔ چاندنی میں شاہان نے دیکھا کہ ان چاروں نے سیاہ لمبے چغے پہن رکھے تھے۔ سروں پر ٹوپیاں تھیں آنکھوں پر سیاہ نقاب تھے۔ اور کمر کے ساتھ تلواریں لٹک رہی تھیں۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے مردے کا تابوت زمین پر رکھ دیا ایک نقاب پوش آگے بڑھا دروازے میں ایک جگہ ہاتھ ڈال کر اس نے کسی شے کو اپنی طرف کھینچ اور دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ یہ چاروں نقاب پوش تابوت کندھوں پر اٹھا کر دروازے میں داخل ہوگئے ان کے اندر جاتے ہی دروازہ اپنے آپ ہی بند ہوگیا۔

شاہان سوچنے لگا کہ اس تابوت میں کسی کی لاش ہوسکتی ہے۔ اور یہ لوگ محل میں کیا کرتے ہیں اور یہ لاش کس لئے اوپر لے کر جارہے ہیں شاہان پتھر کی اوٹ سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے پوری قوت سے اس پر تلوار کا وار کیا یہ وار کھوپڑی کو دو ٹکڑے کردینے والا تھا مگر تلوار شاہان کی فولادی کھوپڑی سے لگ کر ٹوٹ گئی شاہان نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک نقاب پوش آدمی تلوار ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اور یقیناً حیران ہورہا تھا کہ شاہان تلوار کا اس قدر بھرپور وار کھانے کے بعد زندہ کیسے بچ گیا۔

شاہان اس نقاب پوش کو مارنا نہیں چاہتا تھا وہ اس سے خفیہ محل کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا اس نے پوچھا تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو۔ نقاب پوش نے ٹوٹی ہوئی تلوار سے ہی ایک اور زبردست وار کیا اس بار تلوار شاہان کے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہ نکلا تلوار نقاب پوش کے ہاتھ سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔ جب اس نے اپنے دونوں وار خالی جاتے دیکھا تو اپنا لمبے چغے کی جیب سے ایک کنکری نکال کر اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور شاہان پر پھینکی کنکری سانپ، بن کر شاہان کی گردن پر گری اور سانپ نے شاہان کے اوپر والے ہونٹوں پر ڈس لیا شاہان نے سانپ کو پکڑ کر کچل دیا۔

نقاب پوش جادوگر پریشان ہوکر ایک طرف کو بھاگا۔ شاہان نے اس پر چھلانگ لگائی۔ مگر وہ بجلی جیسی تیزی سے اس کے نیچے سے نکل کر محل کی پچھلی دیوار کی طرف دوڑا۔ شاہان اس کے پیچھے بھاگا نقاب پوش کو اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے معلوم ہوچکا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی بہت بڑے جادوگر سے ہے۔

آگے جاکر پہاڑ ختم ہوگیا نیچے سمندر اور چٹانیں تھیں نقاب پوش نے شاہان کو اپنے پیچھے آتا دیکھا تو نیچے چھلانگ لگادی۔ چھلانگ لگاتے ہی نقاب پوش کے بڑے بڑے پر نکل آئے اور وہ بہت بڑے چمگادڑ کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا سمندر کے اوپر جاکر غائب ہوگیا۔

شاہان نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا چاند پھر بادلوں کی اوٹ میں آگیا تھا۔ اور سمندر کے اوپر چاروں طرف اندھیرے کی ہلکی سی سیاہ چادر پھیل گئی تھیں۔ شاہان اب محل میں جاکر یہ پتہ کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اس تابوت میں عمارہ کی تو لاش نہیں تھی اسے شک تھا کہ ان نقاب پوشوں نے کہیں عمارہ کو مار کر یا بے ہوش کرکے تابوت میں نہ ڈال رکھا ہو۔ وہ محل کی طرف بڑھا اس نے وہ جگہ تلاش کرلی جس میں ہاتھ ڈال کر نقاب پوش نے دروازہ کھولا تھا یہاں ایک لوہے کی چھوٹی سی پتھی، لگی تھی شاہان نے پتھر کو اپنی طرف کھینچا تو دروازے کا ایک پٹ آہستہ آہستہ کھل گیا۔

شاہان ایک طرف ہوگیا تھا اس نے سر آگے کرکے دروازے کے اندر دیکھا وہاں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی سوائے سمندروں کی لہروں کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی۔ شاہان دروازے کے اندر آگیا یہاں اندر سے تازہ ہوا آرہی تھی جس میں نمی کی بو تھی۔ اندھیرے میں شاہان کو اب کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا سامنے ایک لمبی ڈیوڑھی تھی جس کی دونوں جانب کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن کے دروازے بند تھے شاہان دروازے سے گزر کر ڈیوڑھی میں آیا تو اس کے پیچھے دروازہ بند ہوگیا یہ کوئی جادو کا محل لگتا تھا۔ جس میں آسیبی روحیں قید تھیں۔

شاہان اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک تنگ گلی آگئی یہ دائیں جاکر مڑ گئیں اور شاہان کو اوپر ہلکی سی روشنی نظر آگئی۔ یہ روشنی ایسی تھی جیسے کسی جگہ آگ جل رہی ہو۔ گلی کا فرش اونچا ہوتا گیا جیسے وہ کسی گھاٹی کی چڑھائی چڑھ رہا ہو روشنی ایک گول سوراخ سے آرہی تھی شاہان نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا اندر ایک گول کمرہ تھا۔ جس کے درمیان میں ایک پتھر کے بڑے پیالے میں آگ جل رہی تھی اس کے اردگرد چھ سات نقاب پوش خاموش کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں کے قریب وہی تابوت رکھا ہوا تھا جس کے اندر شاہان کے خیال میں عمارہ کی لاش تھی یا بے ہوش پڑی تھی۔

نقاب پوشوں نے بھاری آواز میں جادو کے منتر پڑھنے شروع کردیئے منتروں کی آواز کے ساتھ ہی دیوار ایک جگہ سے شک ہوئی اور ان نقاب پوشوں کا سردار نمودار ہوا سردار کے سر پر کالے رنگ کا تاج تھا۔ جس کے اوپر ایک زندہ سانپ پھن اٹھائے بیٹھا تھا اس کے آتے ہی دوسرے نقاب پوش پیچھے ہٹ گئے سردار نے تابوت پر دونوں ہاتھ رکھ کر کوئی منتر پڑھا پھر اس کے ڈھکنے کو کھول دیا شاہان یہ سب کچھ حیرت سے تک رہا تھا تابوت میں عمارہ لیٹی لیٹی اوپر اٹھنے لگی۔ تابوت سے اوپر کوئی پانچ فٹ بلند ہوکر اس کا ہوا میں لیٹا ہوا بے ہوش یا مردہ جسم رک گیا۔

نقاب پوش سردار نے کوئی شے آگ پر ڈالی تو نیلے رنگ کا ایک شعلہ بلند ہوکر بجھ گیا کمرے میں لوبان کا دھواں پھیل گیا اس کی تیز بو شاہان نے بھی محسوس کی۔ خدا جانے یہ نقاب پوش عمارہ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ شاہان نے سوچا کہ وہ

چھلانگ لگا کر ان نقاب پوش کے پاس پہنچ جائے اور عمارہ کو ان سے چھڑائے لیکن شاہان کو خیال آیا کہ اس طرح عمارہ کی زندگی تو خطرے میں پڑ سکتی تھی اسے تو یہ لوگ نقصان تو نہیں پہنچا سکتے تھے مگر ہو سکتا ہے کہ عمارہ کو وہ ہلاک کر دے۔ وہ اسی سوراخ کے ساتھ لگا ان نقاب پوشوں کو تکتا رہا۔

سردار نے ہاتھ کا اشارہ کیا ایک نقاب پوش لپک کر ایک طرف گیا اور دیوار کے ساتھ رکھے صندوق میں سے ایک انسان کا کٹا ہوا سر لے کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ یہ کٹا ہوا سر کسی سمندری جہاز کے ملاح کا لگتا تھا اس کے کانوں میں تانبے کی مندریاں تھیں اور شکل بحری لیٹروں جیسی تھی ہو سکتا ہے کہ آسیبی جہاز کے سارے ملاحوں کو انہی لوگوں نے ہلاک کیا ہو۔ شاہان یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سردار نے بحری لیٹرے کا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لے کر اسے آگ پر رکھ دیا۔ انسانی بال اور کھال جلنے کی بو اٹھی جب انسانی سر جل کر بالکل کوئلہ ہو گیا تو سردار نے اسے ایک سلاخ کی مدد سے آگ سے باہر نکالا اور عمارہ کے بے ہوش جسم کے اوپر لا کر منتر پڑھنے لگا۔

جادوئی منتروں کی آواز کے ساتھ عمارہ کے جسم نے حرکت کرنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ سخت سردی میں کانپ رہا ہو۔ سردار بھنا ہوا انسانی سر اسی طرح سلاخ میں لٹکائے کھڑا پڑھتا رہا جب عمارہ کے جسم نے کانپنا بند کر دیا تو سردار نے انسانی سر پیالے کی آگ میں ڈال دیا۔ جس نے اسی وقت آگ پکڑ لی اور کھوپڑی کی ہڈی چیخ چیخ کر جلنے لگی سردار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر عمارہ کے جسم کی طرف اپنی لمبی لمبی انگلیوں کا اشارہ کیا تو عمارہ کا بے ہوش جسم فضا میں لٹکا جسم آہستہ آہستہ نیچے آنا شروع ہوا۔ پھر وہ اپنے آپ تابوت میں چلا گیا۔

سردار نے تابوت کا منہ بند کر دیا اور اپنی بھاری سوئی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تابوت کو تہہ خانے میں لے جاؤ دس روز بعد پورے چاند آدھی رات کو سمندر میں سے نکلے گا اس روز اس عورت کی گردن کاٹ کر آگ میں ڈال دی جائے گی۔ اور پھر ہم سب غیر فانی ہو جائیں گے۔ پھر ہم کبھی نہ مر سکیں گے اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔“

اس اعلان پر باقی نقاب پوشوں نے ہاتھ بلند کر کے نعرے لگائے اور چار نقاب پوش عمارہ کا تابوت کندھوں پر رکھ کر دیوار کے ساتھ والی سیڑھیاں چڑھ کر اس سوراخ کی طرف بڑھے جہاں شاہان چھپ کر کھڑا یہ بھیانک کھیل دیکھ رہا تھا۔ شاہان جلدی سے پیچھے ہٹ کر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ نقاب پوش تابوت لے کر سرنگ میں اتر گئے۔ اور شاہان ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا سرنگ اندھیرا تھی ایک موڑ پر مشعل روشن تھی اس کی روشنی میں نقاب پوشوں نے دیوار کے آگے تابوت رکھ دیا سامنے لوہے کا دروازہ تھا۔ جس پر بڑا مضبوط اور پرانا تالا پڑا ہوا تھا۔

نقاب پوش نے تالے پر انگلی رکھ کر کچھ پڑھ کر پھونکا اور تالا اپنے آپ کھل گیا وہ نقاب پوش وہیں کھڑا رہا۔ باقی نقاب پوش عمارہ کا تابوت لے کر اندر چلے گئے انہوں نے تابوت اندر لے جا کر رکھ دیا۔ باہر آنے کے بعد نقاب پوش نے ویسا ہی تالا پھر لگا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر چاروں نقاب پوش ہاتھ باندھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سرنگ کا موڑ مڑ کر غائب ہو گئے۔

جب شاہان کو یقین ہو گیا کہ نقاب پوش وہاں سے کافی دور چلے گئے ہیں تو وہ دیوار کی اوٹ سے نکل کر بند دروازے کے پاس آیا اس نے تالے کو دیکھا اور پھر ہلکا سا جھٹکا دیا تالا کھل گیا شاہان دروازہ تھوڑا سا کھول کر کوٹھری کے اندر آ گیا اندر گھپ اندھیرا تھا یہاں وہی خراٹے اور کسی درندے کے سانس لینے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی وہ اندھیرے میں ہی دیوار کے ساتھ لگ کر ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔ یہ کوٹھری میں ایک اور سرنگ تھی اور نقاب پوشوں نے اس سرنگ کے آخر میں جا کر ایک چبوترے پر عمارہ کا تابوت رکھا تھا شاہان پھونک پھونک کر آگے قدم بڑھا رہا تھا اچانک اندھیرے میں ہی اس کا پاؤں ایک خالی جگہ پر پڑا۔ اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا وہ

ایک گہرا اندھا اور خشک کنواں تھا جس میں اوپر کو اٹھے ہوئے نیزے اور تلواریں لگی تھیں۔

شاہان نیزوں اور تلواروں کے اوپر جا گرا اور اگر وہ شاہان نہ ہوتا تو اس کے جسم کو ان تلواروں اور نیزوں نے چھلنی کر دیا ہوتا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا الٹا اس کے گرنے سے نیز تلواریں ٹوٹ گئیں جیسے ان پر کوئی بھاری پتھر گیا ہو شاہان نے اندھیرے میں ٹٹولا وہ ایک چھوٹے سے مگر بڑے سے کنویں میں قید ہو چکا تھا۔ کنویں کی گول دیوار تھی جس کی وجہ سے وہ اوپر نہیں چڑھ سکتا تھا شاہان کو دنیا کا کوئی ہتھیار ہلاک نہیں کر سکتا تھا لیکن اگر وہ گہرے کنویں میں گر پڑے تو رسی کے بغیر اوپر نہیں جا سکتا تھا اور پھر عام انسانوں کی طرح بے بس ہو جاتا تھا اس وقت بھی شاہان بے بس تھا وہ کسی کو آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔

شاہان نے اسی وقت ناگنی اور شریم کو یاد کیا اگر کسی طرح ان میں سے کوئی یہاں آ جاتا تو اسے کنویں کی مصیبت سے نجات دلا سکتا تھا مگر نہ کوئی خبر نہ تھی کہ شاہان کو کب تک اسی کنویں میں رہنا پڑتا۔

دوسری طرف ذرا ناگنی اور شریم کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کس حالات میں ہیں۔ ناگنی اور شریم پیرس کے ایک ہوٹل میں آمنے سامنے والے کمرے میں رہتے تھے اور شہر میں دن بھر شاہان کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے کہ شاید انہیں شاہان کسی جگہ مل جائے جب دونوں شاہان کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ شاہان پیرس میں نہیں ہے تو انہوں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”اب ہمیں کس طرف جانا چاہئے۔“ شریم نے پوچھا۔ ناگنی کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں ملک اندلس کی طرف جانا چاہئے کیونکہ میں نے شاہان کی زبانی ایک بار سنا تھا کہ وہ اسپین کی سیر کرنا چاہتا ہے۔“

شریم نے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اندلس کی سیر کا اسے خیال بھی نہ رہا ہو۔“

”پھر تمہارا مشورہ کیا ہے؟“ ناگنی نے شریم سے پوچھا۔

سریم اس وقت ناگنی کے کمرے میں ہی تھا۔ ناگنی صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اور شریم پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ جو دکھائی نہیں دے رہا تھا اس نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ ”کیا خیال ہے کہ اگر ہم اسپین کی طرف نکل جائیں تو اچھا نہ ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ شاہان اپنی مصیبت سے نکل کر اسی ملک کی طرف سفر کر رہا ہو۔“

ناگنی نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں اس طرح ہم کم از کم یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے سے تو بچ جائیں گے۔ کیونکہ شاہان زیادہ دیر مصیبت میں پھنسنے والی چیز نہیں ہے۔“

شریم ہنس پڑا۔ ”مصیبت تو اس سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔“ اتنے میں بیرا ناگنی کے کمرے میں داخل ہوا بیرا خود خوف بھری نظروں سے کمرے میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کیونکہ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک لڑکے کی آواز سنی تھی۔ یہ شریم کی آواز تھی جو اس کمرے میں موجود تھا مگر کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا ناگنی سمجھ گئی کہ ہوٹل کا بیرا کیا دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے بیرے کی طرف چٹکی بجا کر پوچھا۔

”ادھر ادھر کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ کیا تمہاری کوئی شے گم ہو گئی ہے۔“

”نہیں تو میری کوئی شے گم نہیں ہوئی۔ میں تو ویسے ہی دیکھ رہا تھا میڈم کھانا کس وقت کھائیں گی آپ۔“

ہوٹل کا بیرا گول میز کے بالکل سامنے کھڑا تھا اس میز کے پاس ہی پلنگ پر شریم دودھ کا گلاس لئے بیٹھا تھا۔ ناگنی نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر تک لے آنا کھانا۔“

بیرے نے ہنس کر کہا۔ ”آج ہم نے ایک جاپانی ڈش بنائی ہے وہ لے آؤں۔“

”کون سی ڈش ہے وہ؟“

ہیرا بولا۔ ”سانپ ابالے ہوئے۔“ ناگنی یکدم اٹھ کھڑی ہوئی اور غصے سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ خود ایک ناگنی تھی اور اپنے بھائیوں کو ابلتے اور ان کا سوپ بنتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہیرا ڈر کر سہم گیا ناگنی نے ہیرے کو کچھ نہ کہا اور اپنے غصے پر قابو پالیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ خبردار جو میرے سامنے ابلے ہوئے سانپوں کا ذکر کیا۔“

ہیرے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”ایک موٹا جرمنی کپتان ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے وہ سانپوں کا گوشت بڑے شوق سے کھاتا ہے۔“

ناگنی نے پوچھا۔ ”کون سے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے وہ......؟“

”سترہ نمبر میں میڈم۔“

”ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔“ ہیرے کو بھی پتہ نہ تھا کہ ان کے سامنے والے دونوں کمروں میں ایک بھوت رہتا ہے چنانچہ وہ بھی سہا سہا اندر آیا کرتا تھا وہ جانے لگا تو شریم کو شرارت سوجھی اس نے ہیرے کے آگے آ کر اس کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اور کیا حال ہے تمہارا مسٹر ہیرا؟“

ہیرا چیخ مار کر کمرے سے بھاگ گیا۔ شریم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

ناگنی نے کہا۔ ”بے چارہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا اب تو وہ کبھی ہمارے کمرے میں نہ آئے گا۔“

شریم بولا کہ ”نہ آئے ہم بھی تو شام تک یہ ہوٹل چھوڑنے والے ہیں۔“

ناگن نے کہا۔ ”اندلس کو جانے والے جہاز کا پتہ کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ پیرس کی طرف ہر دوسرے تیسرے روز جہاز جاتا تھا وہاں چل کر معلوم کرلیں گے۔“

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور تیار ہو جاؤ۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم دوپہر کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

دوپہر کا کھانا شریم اور ناگنی نے مل کر بند کمرے میں کھایا اس کے بعد ناگنی نے کہا۔ ”میں نیچے جا کر ہوٹل کا بل ادا کر کے آتی ہوں اور ساتھ ہی ذرا اس موٹے جرمن کپتان کی بھی خبر لیتی آؤں جسے سانپوں کا گوشت بہت پسند ہے۔“

شریم نے پوچھا۔ ”کیا سلوک کروں گی اس کے ساتھ؟“

ناگنی بولی۔ ”ایسا سلوک کروں گی کہ آئندہ سات نسلوں تک وہ سانپ کھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔“ ناگنی کمرے سے نکل گئی۔ شریم غسل خانے میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

ناگنی نے ہوٹل کے منیجر کے پاس آ کر بل کی رقم ادا کی منیجر نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ دونوں آسیبی کمرے خالی ہو رہے ہیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس نوجوان ناگنی کی وجہ سے سامنے والے کمرے میں بھی کوئی بھوت آباد ہے۔

ناگنی نے کہا۔ ”میری وجہ سے اگر آپ کو کوئی تکلیف ہوئی تو میں معافی مانگتی ہوں۔“ منیجر نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا جی نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“ ناگنی نے ویسی ہی ہنسی کا جواب دیا۔ اور اوپر والی منزل میں آ کر سترہ نمبر کے کمرے کے باہر آ کر باہر رک گئی۔

اس کمرے میں سانپوں کے گوشت کا موٹا شوقین جرمن ٹھہرا ہوا ہے ناگنی نے کمرہ کی گھنٹی بجائی بھاری بھرکم موٹا بڑی بڑی مونچھوں والا جرمن کپتان ابلے ہوئے چار پانچ سانپوں کو مزے لے لے کھا رہا تھا اور سانپوں کو کھانے کے بعد رومال سے اپنی مونچھوں کو بار بار صاف کر رہا تھا گھنٹی کی آواز سن کر وہ غرایا۔

”کون ہے؟“

ناگنی دروازہ کھول کر اندر آ گئی موٹے کپتان نے اپنی لال لال آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے سوٹ بوٹ میں دبلی پتلی نوجوان لڑکی کو دیکھا تو اس نے بے پروائی اور غصے سے پوچھا۔ ”کس کی تلاش کرتی پھر رہی ہو“ ناگنی کو تو بڑا غصہ آیا۔

"میں دراصل اپنے بھائیوں کی تلاش میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"تمہارے بھائیوں کا میرے ساتھ کیا واسطہ لڑکی۔" موٹے کپتان نے کرخت آواز میں پوچھا۔

ناگنی نے اس کو ادب سے کہا۔ "جناب آپ نے میرے بھائیوں کو ابھی ابھی کھایا ہے۔"

"کیا مطلب؟" موٹا جرمن اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا وہ ناگنی کو کوئی پاگل لڑکی سمجھنے لگا تھا جو ہوٹل والوں کی نظر بچا کر اندر آگئی تھی اس نے ناگنی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سب سے پہلے پیرس کے کسی پاگل خانے سے باہر آئی ہو لیکن یقین کرو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ میرے کمرے سے نکل کر چپ چاپ واپس پاگل خانے چلی جاؤ۔"

ناگنی نے کہا۔ "جناب آپ کی ہمدردی کا شکریہ مگر آپ نے ابھی ابھی کھانے میں کیا کھایا؟"

موٹا جرمنی اب ناگنی کی باتوں سے خوش ہوتے ہوئے مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے تو ابھی ابھی چار سانپ کھائے ہے جو خاص طور پر میرے لئے ابالے گئے تھے۔"

ناگنی نے کہا۔ "جناب وہی چار سانپ میرے بھائی تھے۔ آپ نے انہیں کھالیا میں آپ سے اپنے بھائیوں کا بدلہ لینے آئی ہوں۔" موٹا جرمنی اب پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی پاگل لڑکی ہے اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اچھا تو وہ سانپ تمہارے بھائی تھے۔"

ناگنی بولی۔ "ہاں۔"

"تو اب تم کیا چاہتی ہو؟" موٹے جرمنی نے پوچھا۔

ناگنی نے کہا۔ "میں چاہتی ہو جناب کہ آپ مجھے بھی ابال کر کھائیں۔"

"کیا تم بھی سانپ ہو۔" موٹے جرمنی نے مسکراتے ہوئے سوال کیا ناگنی نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"ہاں جناب میں ناگن ہوں۔" اس پر جرمنی نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کی توند کرسی پر ہلنے لگی وہ بولا۔

"اچھا تو پھر تم سانپ بن جاؤ۔ میں تمہیں بھی ابال کر کھا جاؤں گا۔"

"ابھی بن جاتی ہوں جناب۔" ناگنی نے اتنا کہا آنکھیں بند کر کے ایک گہرا سانس لیا اور سیاہ رنگ کا بڑے پھن والی ناگن بن گئی جرمنی اپنی کرسی پر سن ہو کر رہ گیا اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جو کچھ اس نے دیکھا تھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا اس کے سامنے میز پر ایک سیاہ ناگن کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی گردن میز سے تین فٹ بلند تھی اور وہ پھن اٹھائے جھوم رہی تھی اور اپنی لال لال آنکھوں سے زبان نکال کر اسے گھور رہی تھی۔

جرمنی کا تو سارا خون خشک ہو گیا تھا ایک تو اس کے سامنے ایک زندہ لڑکی ناگن بن گئی تھی۔ اور دوسرا ایک زہریلی ناگن اس کی طرف پھن اٹھائے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جرمنی اٹھ کر بھاگنے والا ہی تھا کہ ناگنی اچھل کر اس کی گردن سے لپٹ گئی ناگنی کا پھن جرمنی کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔ اسے کالی ناگن کی سیاہ مونچھوں کے خوف ناک سیاہ بال صاف نظر آرہا تھا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا ناگن اسے اور سانپ کھانے کے لئے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی ناگنی نے اپنا پھن بڑے آرام سے کانپتے ہوئے جرمنی کے ماتھے پر لے جا کر ڈس دیا جرمنی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ ناگنی اس کی گردن سے اتر کر فرش آگئی اور پھر گم ہو گئی۔

کمرے میں لوگ جمع ہو گئے جرمنی کی زبان بند ہو چکی تھی زہر بے حد خطرناک تھا اس کا سفید رنگ نیلا پڑ چکا تھا اور منہ ناک اور کانوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مگر ادھر کچھ بھی نہ تھا۔ ناگنی ایک بار پھر ناگن کی شکل میں آ کر وہاں سے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

شریم نے ناگنی کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب جرمنی کبھی بھی سانپ نہیں کھا سکے گا۔"

ناگنی نے کہا۔ "میں نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ آئندہ کوئی سانپ کھا سکے۔" تیسرے پہر کے قریب ناگنی اور شریم نے ہوٹل چھوڑ دیا پیرس کی ایک کارواں سرائے سے وہ بند بگھی میں سوار ہو کر اور ساری رات سفر کرنے کے بعد دوسرے روز وہ سیلز شہر پہنچ گئے۔ یہاں ایک بہت بڑی بندرگاہ تھی۔

جہاں سے ایک سمندری بادبانی جہاز روم مصر اور اسپین کے لئے روانہ ہوتے تھے یہاں بھی ناگنی نے ایک پرانے قسم کے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا شریم کو اس کمرے میں ٹھہرنے کو کہا اور خود جہاز کا پتہ کرنے بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ شہر فرانس کے پرانے شہروں کی طرح تھا۔ زیادہ آبادی نہیں تھی مگر بندرگاہ ہونے کی وجہ سے بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ بندرگاہ پر بڑی چہل پہل تھی کئی جہاز بندرگاہ پر کھڑے تھے۔ ناگنی نے فرانسیسی زبان میں ایک آدمی سے پوچھا کہ اسپین کی طرف جہاز کب روانہ ہو گا۔ معلوم ہوا کہ تین روز بعد ایک مسافر جہاز جانے والا ہے اس کی ٹکٹ پہلے ہی بک کر رہے تھے۔ ناگنی نے فرسٹ کلاس میں ایک کیبن اپنے نام سے بک کروالیا۔ اور شریم کو آ کر خبر کر دی وہ تین دن انہوں نے سیر و تفریح میں گزار دیئے۔

چوتھے روز ناگنی اور شریم بندرگاہ پر آ گئے۔ ایک بڑا جہاز اسپین جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اس کے سفید اور سرخ بادبان مستولوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے مسافر سیڑھیاں چڑھ کر سوار ہو رہے تھے۔ دوسری طرف سے مزدوران کا سامان جہاز پر لا رہے تھے۔ ناگنی اور شریم کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جس میں ضرورت کی چند ایک چیزیں تھیں جہاز کے ڈیک میں عرشے سے اوپر والی منزل پر فرسٹ کلاس کے صرف چار کیبن تھے ان میں سے ایک کیبن ناگنی کے نام بک تھا۔

سستے کا انجام

بیوی کے ڈسے ہوئے شوہر نے وکیل سے مشورہ کیا۔ "اگر میں اپنی بیوی کو طلاق دوں تو کم سے کم کتنی رقم خرچ ہوگی؟"

وکیل! "ہزار روپے فیس میری۔ تقریباً اتنے ہی روپے کا خرچ اور بیوی کا حق مہر اس کے علاوہ ہوگا۔"

شوہر۔ "اتنا خرچ تو شادی میں بھی نہیں آیا تھا۔ سو روپے نکاح خواں نے لئے تھے۔ اور تین سو روپے کی مٹھائی آئی تھی۔"

وکیل: (منہ بنا کر) سستے کام کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔"

(ڈاکٹر ندیم ساگر۔ کھڈرو ضلع سانگھڑ سندھ سے)

ناگنی کیبن میں آ گئی شریم بھی اس کے ساتھ تھا اس کی ٹکٹ لینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا ناگنی نے کہا۔

"تم پلنگ پر سویا کرنا میں قالین پر سو جایا کروں گی۔"

"ناگنی بہن میرے لئے تم کیوں تکلیف کروں گی میں تو باہر عرشے پر بھی جا کر سو سکتا ہوں۔"

"نہیں شریم بھائی میں یہ نہیں پسند کرتی کہ میرا بھائی باہر سوئے تم آرام سے پلنگ پر سونا میرا کیا ہے میں تو ناگن بن کر جہاز کے کسی بھی کونے کھدرے میں سو سکتی ہوں۔"

جہاز کے بادبان کھول دیئے گئے تھے لنگر اٹھا دیا گیا کپتان کے حکم سے سیڑھی پہلے ہی اوپر کھینچ لی گئی تھی جہاز نے دو تین بار بھونپوں سے وسل بجائی اور وہ سمندر میں روانہ ہو گیا سارا دن ساری رات جہاز

سمندر میں بڑے سکون کے ساتھ روانہ ہورہا تھا اسی طرح تین دن سمندر میں گزر گئے شریم پلنگ پر سوجاتا اور ناگنی کبھی قالین پر اور کبھی کیبن سے باہر نکل کر کہیں بھی سوجاتی تھی۔ اس وقت وہ ایک چھوٹے سے سانپ کی شکل میں ہوتی۔

جہاز پر ناگنی اور شریم کو سفر کرتے تیسرا دن تھا کہ آسمان پر بادل سے گھر گئے اور طوفانی ہوا چلنے لگی ناگنی اس وقت جہاز کے عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ انسانی شکل میں تھی جہاز نے رخ بدلنا شروع کردیا ناگنی نے سوچا کہ وہ نیچے شریم کے پاس کیبن میں چلی جائے ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ جہاز کا جنگلا طوفانی ہواؤں کی وجہ سے اچانک ٹوٹ گیا اور ناگنی جنگلے کے ساتھ ہی سمندر میں جاگری یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوگیا کہ ناگنی کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ پرندہ بن کر اڑ جاتی۔ سمندر میں طوفان کی وجہ سے ایک وہیل مچھلی جہاز کے قریب سے ہوکر نکل رہی تھی اتفاق سے وہیل اس وقت سانس لینے کے لئے باہر نکلی ہوئی تھی اور ناگنی وہیل مچھلی کے کھمڑے کے سوراخ پر گری اور اس کے اندر سے ہوکر وہیل مچھلی کے پیٹ میں آ گئی ابھی وہ سمندر کے اوپر جہاز کے عرشے پر تازہ ہوا میں کھڑی تھی اور اب وہیل مچھلی کے پیٹ میں تھی یہ سارا بھیانک کھیل بس ایک منٹ کے اندر اندر شروع ہوکر ختم ہوگیا ناگنی حیران ہوکر رہ گئی وہ وہیل کے اتنے بڑے سرنگ جیسے اندھیرے پیٹ میں آتے ہی بے ہوش ہوگئی وہ مچھلی کے معدے میں جا کر گری تھی اور یہاں وہ معدے کے تہہ کے پانی میں گھٹنوں تک ڈوب گئی معدے کی فضا میں ایسی گیس پھیلی ہوئی تھی جس سے ناگنی کا دم گھٹنے لگا تھا اور اس پر بے ہوشی چھانے لگی اس نے بے ہوش ہوتے ہوتے ایک گہرا سانس کھینچا اور ناگنی بن کر وہیل مچھلی کے معدے کی دیوار کے ساتھ چپک گئی۔

ناگنی ناگن بن جانے پر اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس پر معدے کی تیزابی ہوا نے زیادہ اثر نہ کیا کیونکہ ناگنی تھوڑی سی آکسیجن کے ساتھ ہی کافی دیر تک زندہ رہ سکتی ہے مگر اب ایک خطرہ تھا کہ وہیل مچھلی کے معدے میں سے جو تیزابی ہوا نکل رہی تھی وہ اس قدر تیز تھی کہ ناگنی کا سارا جسم گل سکتا تھا اس کی دیوار سے بھی ہلکی ہلکی رطوبت رسنے لگی تھی۔ ناگنی نے معدے کے آگے کی طرف رینگنا شروع کردیا۔ وہ وہیل مچھلی کی پسلیوں کے بڑے ہال میں آ گئی۔ یہ بیچ ایک گول ہال کمرہ تھا جس پر بڑی بڑی پسلیوں کی چھت پڑی تھی یہاں زیادہ اندھیرا نہ تھا۔

ناگنی نے وہیل مچھلی کی چربی والی کمر کا اندرونی حصہ دیکھا جو اسے ایک میدان کی طرح پھیلا ہوا دکھائی دیا وہ جلدی وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی شاید وہیل مچھلی کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ اس کے اندر کوئی شے مسلسل رینگ رہی ہے وہ بار بار کھانس رہی تھی ہر کھانسی کے ساتھ ہوا کا ایک بگولا سا ناگنی کو اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کرتا لیکن ناگنی پسلیوں کے درمیان ایک جگہ چمٹی ہوئی تھی کیونکہ وہ وہیل مچھلی کے منہ سے باہر نکلنا چاہتی تھی وہاں جان کا خطرہ تھا ناگنی وہیل کے کھمڑے والے سوراخ سے باہر نکلنا چاہتی تھی اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ جہاں سے وہیل نے سانس لیا تھا وہ سوراخ کس جگہ پر ہے اس نے اندازہ لگا کر وہیل مچھلی کی کمر کی طرف رینگنا شروع کردیا ایک جگہ دور گردن کی بڑی بڑی گول ہڈیوں کے درمیان اسے روشنی سی آتی دکھائی دی ناگنی تیزی سے رینگتی ہوئی وہاں پہنچی اس نے دیکھا کہ وہاں وہیل مچھلی کی گردن کے اوپر ایک ایسی مچھلی چمٹی ہوئی ہے جس میں سے روشنی نکل رہی ہے سامنے وہیل کا جبڑا تھا جس کے اندر چھوٹے چھوٹے باریک نوکیلے دانتوں کا دونوں جانب فٹ پاتھ سا بچھا تھا یہاں جانے کا مطلب تھا کہ وہ پس کر رہ جائے گی۔

ناگنی تیزی سے واپس مڑی کیونکہ وہیل مچھلی زور سے کھانسنے لگی تھی نیچے سے ہوا کا دباؤ بڑی تیزی سے اوپر کی طرف آتا ناگنی گلے کے پاس ایک جگہ چمٹ گئی جب وہیل کی کھانسی ختم ہوئی تو ناگنی نے دیکھا کہ

اس کے اوپر روشنی آرہی ہے وہ جلدی سے اوپر گئی یہ جگہ وہیل کی آنکھ تھی روشنی اس کی آنکھ کے ڈیلے میں سے ہوکر اس کے دیوہیکل جسم کے اندر آرہی تھی۔

ناگنی نے اس سے اندازہ لگایا کہ وہیل سمندر کے اوپر ہی تیر رہی ہے اس نے سوچا کہ وہیل کی آنکھوں کو پھوڑ کر باہر نکل جائے وہ آنکھ کی طرف پہنچی ہی تھی کہ اس کی حرکت سے وہیل خبردار ہوگئی وہ تڑپ کر پانی میں الٹی ہوئی اور پوری طاقت سے غوطہ لگا کر سمندر کے اندر چلی گئی وہیل کے جسم کے اندر طوفان آ گیا اس کے معدے میں کھائی ہوئی مچھلیاں ادھر سے ادھر گرنے لگی۔ بڑی بڑی چربی والی دیواریں آگے پیچھے ہونے لگیں۔

ناگنی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی اسے شریم کا خیال آیا کہ رات کو جب وہ کیبن میں اسے شب بخیر کہنے نہ گئی تو وہ پریشان ہوجائے گا ناگنی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا کہ کیا طریقہ اختیار کرے کہ اسے وہیل کے زندان سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ ناگنی نے فیصلہ کرلیا کہ چاہے کچھ کیوں نہ ہوجائے وہ وہیل کے پیٹ سے نکل کر رہے گی اس نے وہیل کی گردن سے ذرا نیچے اوپر والی پسلیوں سے ہوکر وہیل کی چربی سے بھری ہوئی دیوار کو منہ سے کھرچنا شروع کردیا پہلے تو وہیل کو ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ لیکن جب ناگنی نے زیادہ سے زیادہ سوراخ کرلیا تو وہیل نے ایک جھرجھری سی لی اور سمندر میں اچھلنا شروع کردیا اور ناگنی اپنے کام میں لگی رہی۔ اس نے وہیل کے جسم کی دیوار میں گول سوراخ اوپر تک کرلیا اور پھر اپنا سر باہر نکالا دھوپ اور تازہ ہوا میں آ کر اس کی جان میں جان آئی وہ وہیل کے جسم کے سوراخ سے باہر نکل آئی اب وہ وہیل کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی اور وہیل ایک طوفانی جہاز کی طرح بڑی تیز رفتاری سے سمندری موجوں کو چیرتی ہوئی آگے بھاگے جارہی تھی وہ کبھی پانی میں ڈوب جاتی اور کبھی پانی سے باہر آ جاتی۔

ناگنی نے یہ موقع غنیمت جانا اور اس بار جب وہیل پانی سے باہر نکل آئی وہ سفید عقاب بن کر اوپر اٹھ گئی۔ اوپر ہوا میں آتے ہی اس نے سب سے پہلے جو شے دیکھی وہ ایک چھوٹا سا بادبانی جہاز تھا جو تھوڑی دور لہروں پر بھاگا جارہا تھا اس کے عرشے پر جہازی کھڑے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ وہیل پکڑنے والا جہاز ہے اور انہوں نے وہیل کی گردن میں نیزہ مار کر اسے پکڑ لیا تھا اور رسے کی مدد سے سمندر میں گھسیٹے لئے جارہے تھے۔ ناگنی نے اڑتے اڑتے مڑ کر وہیل کو دیکھا اس کے جسم پر کئی ایک نیزے کھبے ہوئے تھے۔ اور خون سے سمندر لال ہورہا تھا اب اسے معلوم ہوا کہ وہیل جو بار بار تڑپ رہی تھی۔ جو وہیل کا شکار کرنے والے جہازی جہاز کے عرشے سے اس پر پھینک رہے تھے۔

ناگنی نے اس جہاز کو چھوڑا اور سمندر میں شریم والے جہاز کو تلاش کرنے لگی۔ شریم کا جہاز دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گویا اسے سمندر نگل گیا ہے خدا جانے وہیل مچھلی اسے سمندر کے نیچے ہی نیچے کہاں سے کہاں لے آئی تھی ناگنی نے شریم کے جہاز کی تلاش برابر جاری رکھی وہ سمندر میں آگے تک نکل گئی۔ لیکن شریم کا جہاز کہیں دکھائی نہ دیا۔ اصل میں ناگنی شمال مغرب کے بجائے سمندر میں شریم کے جہاز کو جنوب مشرق کی طرف تلاش کررہی تھی۔

ناگنی پریشان ہوگئی اس نے سوچا کہ وہیل مچھلی پکڑنے والے جہاز پر جا کر کم از کم یہ تو معلوم کیا جائے کہ وہ کس سمندر میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شریم کے مسافر بردار جہاز کی سمت بتا سکے۔

سوال یہ تھا کہ ناگنی کس شکل میں ان سے معلوما حاصل کرے۔ پرندہ بن کر وہ ان سے کچھ معلوم نہیں کرسکتی تھی اگر انسان کی شکل میں جائے گی تو کیا کہے گی۔ کہ وہ کون ہے اور جہاز میں کیسے آ گئی شکل و صورت سے وہیل کا شکار کرنے والے گورے تھے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ان کا تعلق جزیرہ سائیرس سے ہو۔ کیونکہ اس جزیرے کے لوگ وہیل کا شکار کرکے ان کی چربی

اور تیل کی تجارت کیا کرتے تھے ناگنی کے لئے بہر حال وھیل کے شکاری جہاز پر جانا ضروری تھا۔ وہ غوطہ لگا کر واپس پلٹی جہاز کافی فاصلے پر تھا ناگنی جہاز کے اوپر آ گئی۔ جہازی وھیل کو جہاز پر لاد چکے تھے اور اب چھرے سے اس کا جسم کاٹ کر چربی الگ کر رہے تھے وہ اپنے کام میں اس قدر مصروف تھے کہ کسی کا خیال اس سفید عقاب کی طرف نہ گیا جوان کے جہاز کے اوپر منڈلا رہا تھا اور ناگنی سوچ رہی تھی کہ کہاں اترے۔

آخر ناگنی کو خیال آیا کہ وہ کتنی دیر تک یونہی اڑتی رہی گی۔ پھر وہ جہاز کے مستول پر جا بیٹھی یہاں اس نے ایک زرد رنگ کی چڑیا کی شکل بدلی اور پھر سے اڑی مار کر جہاز کے ڈیک پر رکھے تیل کے بڑے بڑے خالی ڈراموں کے درمیان آ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ سوچنے لگی کہ کس شکل میں ظاہر ہو کر شریم کے جہاز کے بارے میں ان لوگوں سے معلومات حاصل کرے۔ ناگنی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

وقت بھی گزرتا جا رہا تھا اور شریم کا جہاز بھی دور ہوتا جا رہا تھا ناگنی کا خیال تھا کہ اسے شریم کے جہاز سے جدا ہوئے صرف سات آٹھ گھنٹے ہی گزرے تھے کیونکہ وہ دن کے وقت سمندر میں وھیل کے پیٹ میں گزرا تھا اور اب شام ہو رہی تھی اور سورج سمندر کے اوپر سنہری کرنیں بکھیرتا مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ ناگنی ہر حالت میں واپس شریم کے جہاز میں جانا چاہتی تھی اسے اور تو کچھ نہ سوجھی بس ایک خیال ذہن میں آیا۔ اور اس نے ایک انسانی شکل بدل لی۔

جہاز کے عرشے پر ڈوبنے والے سورج کی لال پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی ذرا دور جہازی وھیل کے ٹکڑے کر رہے تھے اس کی چربی نکال نکال کر بڑے بڑے ڈرموں میں ڈالی جا رہی تھی دو آدمی خالی ڈرم لینے اس کی طرف آئے جہاں ناگنی چھپی بیٹھی تھی جہازی ہنسی مذاق کرتے ہنستے مسکراتے وہاں آ کر ڈرموں کو گھسیٹنے لگے ایک جہازی نے خالی ڈرم پرے کھسکایا تو حیران سا ہو کر جھک کر ناگنی کو تکنے لگا۔

''اے لڑکی کون ہو تم؟'' دوسرے جہازی نے بھی غور سے ناگنی کو دیکھا۔

''یہ کون ہے؟'' اور پھر سارے جہاز پر شور مچ گیا۔ کہ ایک چور پکڑا گیا ہے جہازیوں نے ناگنی کو چور سمجھا تھا جو وھیل کی چربی چرانے بندرگاہ سے کسی جگہ جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ ناگنی کو پکڑ کر اس کے ہاتھوں میں رسی ڈال دی اسے جہاز کے کیپٹن کے سامنے پیش کیا گیا کیپٹن کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور یہاں کا تجربہ کار جہاز راں تھا کسی زمانے میں وہ بحری ڈاکوؤں کے ہاتھ بھی رہ چکا تھا۔ اور کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اس نے ناگنی کو گردن سے دبوچ لیا۔ اور غراتے ہوئے پوچھا۔

''کون ہے تو اور کہاں سے جہاز پر سوار ہوئی ہے؟''

ناگنی کو کوئی جواب نہیں سوج رہا تھا اس نے یونہی کہہ دیا۔ ''میں، میں بندرگاہ سے ہی چڑھی ہوں۔''

''ہونہہ کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ میں بحری ڈاکو بھی ہوں اور میرے جہاز پر جو چوری کی نیت سے آتا ہے اسے میں قتل کر کے سمندر میں پھینک دیتا ہوں بولو اب بولتی کیوں نہیں۔'' وحشی کپتان ناگنی کو جھنجھوڑ رہا تھا سارے جہازی ہنس رہے تھے قہقہہ لگا رہے تھے اور ناگنی کو گالیاں دے رہے تھے اور کپتان سے کہہ رہے تھے کہ اسے ہمارے حوالے کرو ہم اس کی چربی نکال کر ڈرم میں بند کریں گے۔

ناگنی کو غصہ آنا شروع ہو گیا اور اس کا پارہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا اتنے میں ایک بزرگ جہازی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کپتان اس سے یہ تو پوچھو کہ یہ کس نیت سے ہمارے جہاز میں سوار ہوئی ہے مجھے تو یہ بے گناہ لگتی ہے اس کی شکل چوروں والی نہیں ہے۔'' کپتان نے بوڑھے کے کندھے پر مکا مارا تو وہ بوڑھا گر پڑا۔

''کم بخت بڈھے یہ تیری بیٹی لگتی ہے جو تو اس کا ساتھ دے رہا ہے۔'' سارے جہازی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے ہر کوئی سوائے بوڑھے کے ناگنی کا مذاق اڑا رہا تھا

اور کپتان کو ترغیب دے رہا تھا کہ اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔

ناگنی بالکل پریشان نہ تھی ہاں اسے غصہ ضرور آ رہا تھا اور وہ اس جہاز سے اپنی ضروری معلومات کے بغیر واپس جانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن کپتان باز نہیں آ رہا تھا اس نے خنجر اپنی پیٹی میں سے نکال کر بوڑھے جہازی کی طرف پھینکا اس کی قسمت اچھی تھی کہ خنجر اس کے سر پر سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ کپتان اور زیادہ غصے میں آ گیا اس نے حکم دیا پہلے اس بڈھے کو سمندر میں دھکا دے دو پھر اس چور لڑکی کی کھال اتار دو۔''

جہازی کپتان کے اس حکم پر خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ وھیل مچھلیوں پر نیزے چلا چلا کر اور ان کے جسموں کے ٹکڑے کر کے یہ لوگ سنگدل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لپک کر بوڑھے جہازی کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور سمندر کی طرف لے کر چلے۔ اور ناگنی کے دونوں ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے اسے بوڑھے جہاز کے احسن اخلاق کی وجہ سے اس کے ساتھ ناگنی کو ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ ان ظالموں کے ہاتھوں اس کی موت کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ خواہ کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس بوڑھے جہازی کو ان سے بچانا چاہتی تھی۔

ناگنی نے یہ فیصلہ کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر رسی توڑ ڈالی جہاز کے کپتان نے کہا اس لڑکی کو پکڑو اس نے رسی توڑ ڈالی ہے تین چار جہازی ناگنی کی طرف بھاگے مگر ناگنی بھلا اب ان کے ہاتھ کب آتی۔ اب تو ان لوگوں کو اپنی اپنی جان کی خیر منانی چاہئے تھی۔ ناگنی کو سب سے زیادہ فکر اس بوڑھے جہازی کی تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ سمندر میں گرتے ہی مر جائے گا جہازی اسے لے کر جنگلے کے پاس کھڑے کپتان کے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ انہوں نے ناگنی کو رسی تڑاتے دیکھا ناگنی نے ایک گہرا سانس لیا اور سفید عقاب بن کر جہاز کے عرشے سے تیر کی طرح سیدھا اوپر کو اٹھ گئی۔

جہازی اور کپتان حیران رہ گئے پہلے تو جو کچھ انہوں نے دیکھا اس پر یقین ہی نہ آیا وہ بار بار آنکھیں جھپکا کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی بھلی لڑکی ایک دم سے پرندہ بن کر اڑ جائے نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ان کی نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔''

لیکن ناگنی ان کے درمیان نہ تھی صرف اس کی رسی ان کے پیروں میں پڑی تھی کپتان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے وہ منہ اٹھائے سفید عقاب کو ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں آسمان پر چکر لگاتے دیکھ رہے تھے اس نے کہا یہ جادوگرنی تھی اور افریقہ کے ہی جادوگر ایسا کچھ کر سکتے ہیں لیکن اسکے جہازیوں نے ایسا جادو کبھی بھی نہیں دیکھا تھا کپتان نے حکم دیا کہ اس بوڑھے کو گستاخی کا مزا چکھاؤ اور اسے سمندر میں گرا دو جہاز ویران ہو چکا تھا اور اس کا نقشہ ہی بدل چکا تھا اوپر عرشہ خالی تھا بادبان کھلے ہوئے تھے جہاز ایک طرف اپنے آپ ہی بہے چلا جا رہا تھا اور جو جہازی بھاگ گئے پھر بوڑھا آدمی ناگنی کو لے کر ایک اندھیرے کیبن میں آ گیا یہاں کافی پرانی چیزیں پڑی تھی بوڑھے نے موم بتی روشن کر کے تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ ''ہم بحرہ روم کے سمندر میں ہیں اور دو روز پہلے ایک مسافر بردار جہاز ہم سے کوئی دو میل کے فاصلے پر سے گزرا تھا یقیناً وہ اندلیس کی طرف ہی جا رہا تھا کیونکہ اس کا رخ بھی ادھر کو ہی تھی ناگنی کو بس یہی معلوم کرنا تھا اس نے بوڑھے سے جہاز کا۔

''تم بتا سکتے ہو کہ جہاز یہاں سے کتنی دور ہو گا۔''

بوڑھے جہازی نے کہا۔ ''وہ جہاز میرے اندازے اور تجربے کے مطابق ہمارے جہاز سے شمال مشرق کی طرف کوئی ایک سو میل کے فاصلے پر ہو گا کیا تم وہاں جاؤں گی ہاں میری ایک بہن اس جہاز پر سفر کر رہی ہے میں اس کے پاس جانا چاہتی ہو تمہارا بہت بہت شکریہ انکل اگر ممکن ہوا تو کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی بھی موڑ پر ایک دوسرے سے ملاقات ضرور ہو گی اب

میں جارہی ہو کیا تم رات کے اندھیرے میں جاؤ گی۔

ناگنی نے ہنس کر کہا۔ ''آپ تو جانتے ہیں کہ میں اڑ بھی سکتی ہوں میں اڑ کر جاؤں گی۔'' ناگنی نے بوڑھے جہازی کو سلام کیا اور کیبن سے نکل کر جہاز کے عرشے پر آ گئی سڑھیوں میں سے ایک جہازی ملاوہ ناگنی کو دیکھ کر چیخ مار کر بھاگا ''بھوت بھوت آ گیا۔''

ناگنی ہنستی مسکراتی عرشے پر آ گئی دو جہازی تیزی لے کر اس کی طرف لپکے ناگنی اب انہیں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی تھی کیونکہ وہ احمق تھے ناگنی نے سفید عقاب کا روپ بدلا اور اڑان بھری اور ہوا میں اڑ کر شمال مشرق کی طرف اڑ کر شمال مشرق کی طرف پرواز شروع کر دی۔

آدھی رات تک وہ پرواز کرتی رہی رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ اس نے دور سمندر میں روشنی کا ایک نقطہ ٹمٹماتا دیکھا ناگنی اس کی طرف اڑنے لگی کافی دیر اڑتے رہنے کے بعد اس نے دیکھا کہ روشنی کا نقطہ اصل میں ایک چراغ ہے جو ایک بحری جہاز کے عرشے کے آگے موٹے شیشے کے اندر روشن ہے ناگنی نے شریم کے جہاز کو جالیا مسافر عرشے پر کمبل اوڑھے سو رہے تھے ناگنی نے جہاز پر اتر کر انسانی شکل اختیار کر لی وہ سیدھی کیبن میں چلی گئی اسے شریم تو نظر نہ آیا لیکن شریم نے اسے دیکھ لیا وہ جاگ رہا تھا۔

''ناگنی بہن تم کہاں چلی گئی تھی۔''

ناگنی نے جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھ کر کہا۔ ''شریم بھائی صرف اور صرف قسمت اچھی تھی۔''

اس کے بعد ناگنی نے شریم کو اپنی زندگی کی کہانی سنائی تو وہ بہت ہی حیران ہوا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم تو واپس آ گئی نہیں تو شاہان کے ساتھ بار بار میں تمہاری بھی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔''

ناگنی تھک گئی تھی وہ بستر پر گر پڑی اور گرتے ہی خراٹے لگانے لگی شریم نے ہنستے ہوئے ناگنی پر کمبل ڈال دیا۔

جہاز اندلس کی طرف سفر کر رہا تھا۔ سمندر میں جہاز کو سفر کرتے سات روز گزر چکے تھے ناگنی ایک رات کیبن کی چھت پر سو رہی تھی رات آسمان پر تارے چمک رہے تھے سمندر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناگنی کی ایک آہٹ سے آنکھ کھل گئی اس نے اپنی گردن اٹھا کر نیچے عرشے پر دیکھا دور جنگلے کے بانس پر جلتی لالٹین کی روشنی میں ناگنی کو دو سائے نظر آئے جو ایک لمبا سا صندوق اٹھائے کیبن کی طرف آ رہے تھے ناگنی حیران ہوئی کہ مسافر تو اپنا سامان نیچے گودام میں رکھواتے ہیں پھر یہ صندوق کس لئے اپنے کیبن میں لئے جا رہے ہیں۔

ناگنی کو دال میں کچھ کالا دکھائی دیا ویسے بھی اس کی طبیعت اسرار پسند تھی اور وہ خفیہ رازوں کو حل کرنے میں بڑا مزہ لیا کرتی تھی وہ چھت پر سے کھسک کر نیچے ڈیک پر آ گئی۔ دونوں سائے لمبے صندوق کو گھسیٹ کر اپنے کیبن میں لے گئے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

ناگنی کیبن کی دیوار پر رینگتی ہوئی چھوٹے سے روشن دان کے پاس آ گئی اس نے اندر جھانک کر دیکھا کیبن کی چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی اس کی روشنی میں دو ہٹے کٹے آدمی کھڑے تھے درمیان میں وہی لمبا صندوق پڑا تھا ناگنی نے دیکھتے دیکھتے صندوق کا ڈھکنا اٹھا دیا ناگنی نے گردن اونچی کر کے دیکھا صندوق کے اندر ایک لمبے سیاہ بالوں والی خوب صورت لڑکی بے ہوش پڑی تھی دونوں پراسرار ڈاکو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے انہوں نے صندوق کو بند کیا اور کرسیوں پر بیٹھ کر سگار سلگائے اور باتیں کرنے لگے ناگنی بڑی توجہ سے ان کی باتیں سننے لگی۔ ''یہ کام بڑا جان جوکھوں کا تھا مگر کامیاب ہو گئے۔ اب اس عورت کو اسپین لے جا کر وہاں اس کے مہاراجہ باپ کو خط لکھنا ہو گا کہ تمہاری راج کماری ہمارے پاس قید ہے اگر اسے زندہ واپس لے جانا چاہتے ہو تو دس لاکھ پونڈ کی قیمت کا سونا اور جواہرات روانہ کر دو۔ لو اپنی بیٹی کو لے جاؤ نہیں تو ہم اس کا سر کاٹ کر تمہارے دربار میں بھجوا دیں گے۔ پھر دونوں ڈاکو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''صندوق میں تازہ ہوا جاتی ہے تا میں نے خود اس میں بارہ سوراخ بنا دیے ہیں راج کماری اسپین تک سکون سے سانس لیتی رہے گی اور بے ہوش بھی رہے گی میری دوائی کا اثر کم از کم دس روز تک رہے گا۔''

ناگنی نے یہ باتیں سنی تو چونک پڑی یہ ایک نیا ڈرامہ اس جہاز پر کھیلا جا رہا تھا وہ جھٹ وہاں سے رینگتی ہوئی واپس اپنے کیبن میں آ گئی۔ اس نے انسانی شکل اختیار کی اور شریم کو جگا کر سارا قصہ بیان کر دیا۔ اسے بھی راج کماری پر بڑا ترس آیا اور ان ڈاکوؤں پر غصہ۔

ناگنی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ راج کماری اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان سے سیر کرنے فرانس آئی ہو گی کہ ان ڈاکوؤں نے اسے اغوا کر لیا اب ہمارا فرض ہے کہ وہ راجکماری کو ان سے چھڑائیں اور اس کو اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔''

ناگنی نے کہا۔ ''لیکن یہ کام ہم اسپین پہنچ کر ہی کر سکتے ہیں چلتے جہاز پر تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے جہاز دو روز بعد میرا خیال ہے کہ اسپین کی بندرگاہ پر پہنچ جائے گا۔ وہاں پہنچتے ہی ان ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر حملہ کر کے انہیں موت کی نیند سلا دیا جائے گا اور راجکماری کو صندوق سے نکال کر واپس ہندوستان یا فرانس اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔''

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم صبح ڈاکوؤں کے کیبن میں جا کر راجکماری کو ہوش میں لاؤ اور اس سے پوچھو کہ اس کے ماں باپ کہاں ہیں۔''

''صبح جاؤں گا رات ابھی بہت باقی تھی آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے حبس بہت زیادہ تھی ہوا تو جیسے بند ہو گئی تھی بادبان ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور جہاز بڑی ہی دھیمی رفتار سے سمندر میں جا رہا تھا۔

لیکن اچانک پھر ایسا ہوا کہ آسمان پر کالے بادل چھا گئے اور آندھی سے بھی تیز ہوا چلنے لگی۔ سمندر میں طوفان آ گیا اس کے باوجود جہاز سنبھلا ہوا تھا اور کپتان اسے بڑی مہارت سے چلا رہا تھا مگر بدقسمتی سے تیز ہوا میں ایک جلتی ہوئی لالٹین راہداری میں گر کر ٹوٹ گئی اور اس کے تیل کو آگ لگ گئی۔ ہوا تیز تھی آگ نے پاس ہی پڑے ہوئے روئی کے گٹے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اس زمانے میں آگ بجھانے کا اتنا جدید سامان نہیں ہوا کرتا تھا ملاح پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر آگ میں ڈالنے لگے مگر آگ بڑھتی جا رہی تھی جہاز لکڑی کا بنا ہوا تھا ایک بار آگ نے شعلوں کی شکل بدلی تو پھر وہ بڑھتی ہی چلی گئی دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کے کیبن شعلوں میں بدل گئے جہاز میں بھگدڑ مچ گئی مسافروں نے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں اور طوفانی لہروں نے انہیں فوراً نگل لیا۔ آگ اب سارے جہاز میں پھیل چکی تھی جہاز کے بادبان جل کر نیچے گر پڑے۔ جہاز رک گیا اور لہریں اسے اچھالنے لگیں جہاز آگ کا گولہ بن چکا تھا۔

شریم اور ناگنی ایک جہاز کے تختے پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے بے ہوش راجکماری کو صندوق سے نکال کر اپنے تختے پر ڈال لیا تھا اس افراتفری میں وہ ڈاکو بھی جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شعلوں میں جل کر بھسم ہو چکے ہوں۔ جہاز شعلے بلند کرتا سمندری لہروں میں دور ہوتا جا رہا تھا ناگنی اور شریم تختے میں بیٹھے جہاز کو دور ہوتا دیکھ رہے تھے جہاز اب جل کر سمندر میں غرق ہونے والا تھا رات کے پچھلے پہر جل کر سمندر میں غرق ہو گیا۔

طوفان کا زور صبح کے وقت تھم چکا تھا سورج نکلا تو سمندر پر سوائے ایک تختے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ جس پر ناگنی اور شریم خاموش بیٹھے تھے اور ان کے سامنے راج کماری بے ہوش پڑی تھی۔ ناگنی نے سانس بھر کر شریم سے کہا۔

''کسی طرح راج کماری کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جائے۔''

شریم نے کہا۔ ''وہ کوشش کرتا ہے۔'' اس نے پہلے تو راجکماری کے سر کو دبایا ہاتھ پاؤں پر مالش کی اور سمندری پانی کا چھینٹا مارا تو راج کماری نے اپنی

آنکھیں کھول دیں راج کماری نے ناگنی کو دیکھا پھر اپنے اوپر آسمان اور اردگرد سمندر ہی سمندر دیکھا تو حیران ہوکر ناگنی سے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟'' شریم تختے پر رج کماری کے پاس ہی بیٹھا تھا اسے کالے کالے لمبے بالوں والی کالی آنکھوں اور ماتھے پر لگے تل کے نشان راجکماری مصور ہی اور پیاری لگی۔ راجکماری شریم کو نہیں دیکھ سکتی تھی ناگنی نے بھی اسے اپنا تعارف کروانے سے منع کیا تھا کہ کہیں راج کماری ڈر نہ جائے راج کماری کو ناگنی نے بڑے ادب خلوص اور میٹھے لہجے میں کہا۔

''آپ یوں سمجھ لیں کہ آج اپنی بہن کے پاس ہیں۔'' راج کماری نے اپنے آس پاس پانی ہی پانی دیکھا تو خوف سے پوچھا۔

''میں یہاں کیسے آگئی اور میرے پتا کہاں ہیں۔'' ناگنی نے راج کماری کو وہ ساری باتیں بتادی جو اس نے دونوں ڈاکوؤں سے سنی تھی کہ انہوں نے راج کماری کو فرانس کے شہر پیرس سے اغوا کیا تھا اور اب اسپین لئے جا رہے تھے کیا سے یرغمال بنا کر اس کے راجہ باپ سے سونا جواہرات وصول کرتے۔ مگر افسوس کہ جہاز کو آگ لگ گئی اور وہ اسے بچا کر لے آئی۔

راج کماری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔'' میرے پتاجی بڑے پریشان ہوں گے اب میں کیا کروں۔ کیسے اپنے پتا کے پاس پہنچوں گی۔''

ناگنی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''راج کماری بس اب گھبرانے اور پریشانی کے اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا ہم آپ کو بڑی مشکل سے جلتے ہوئے جہاز سے بچا کر لائے ہیں۔''

''کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' راجکماری نے پوچھا۔

ناگنی کے منہ سے غلطی سے ہم کا لفظ نکل گیا تھا کیونکہ اسے تو معلوم تھا کہ شریم بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔''میرا مطلب تھا کہ میں صرف میں تو میں کہہ رہی تھی کہ چونکہ میں نے ڈاکوؤں کی باتیں سن لی تھیں اس لئے فیصلہ کیا تھا کہ راج کماری کو ان سے چھڑواؤں گی اور اس کو اس کے پتا کے پاس پہنچا کر رہوں گی اس لئے میں نے آپ کو بے ہوشی کی حالت میں ہی صندوق میں سے نکال کر اس تختے پر ڈالا اور سمندر میں لے کر روانہ ہوئی۔''

اب راج کماری حالت کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی اس نے ناگنی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔''تمہارا نام کیا ہے؟''

''مجھے ناگنی کہتے ہیں۔''

راج کماری نے کہا۔''یہ تو ہم ہندوستان میں رہنے والوں کا ایسا نام نہیں ہے کیا تمہارا سانپ سے بھی کوئی تعلق ہے۔'' ناگنی نے پریشان سی ہوگئی اس قسم کا سوال کسی نے پہلے اس کا نام سن کر کبھی نہیں کیا تھا وہ بات کو ٹالنے کے انداز میں مسکرا کر بولی۔

''میرے ماں باپ نے یہی میرا نام رکھ دیا تھا بھلا مجھ لڑکی کا کسی سانپوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔''

راج کماری مسکراتے ہوئے تختے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ناگنی نے پوچھا کہ ''تمہارا کیا نام ہے راج کماری۔''

''کماری نام ہے میرا اور میرا باپ ہندوستان کی ایک ریاست کا مہاراجہ ہے میں اپنے پتاجی کے ساتھ فرانس کی سیر کرنے آئی ہوئی تھی۔'' پھر وہ اداس ہوکر بولی۔

''میرے پتاجی میرے لئے بہت پریشان ہوں گے کاش کسی طرح انہیں خبر مل جاتی کہ میں زندہ ہوں اور اپنی بہن کے ساتھ ہوں۔''

ناگنی نے کہا۔''ابھی تو ہمیں خود پتہ نہیں کہ ہمارا انجام کیا ہوگا خدا جانے سمندر کی موجیں ہم کو کون سے آدم خور جزیرے پر لے جا کر پھینکیں گی ہاں ہم اگر کسی ملک کی ساحل پر پہنچ گئے تو میں کوشش کروں گی کہ تمہیں وہاں سے لے جا کر ہندوستان لے جاؤں اور تمہاری ریاست میں پہنچ کر تمہیں تمہارے پتا کے حوالے کردوں۔''

راج کماری نے ناگنی کی طرف یوں دیکھا جیسے ایک مصیبت زدہ بہن اپنی مدد کرنے والی بہن کی طرف دیکھتی ہے۔'' ناگنی بہن اگر قسمت نے مجھے اپنے پتا کے پاس پہنچا دیا تو تمہارا یہ احسان ہمارا سارا خاندان بھی نہیں بھلا پائے گا پتاجی تمہارا منہ ہیرے جواہرات سے بھر دیں گے۔''

ناگنی نے ہنس کر کہا۔''ہیرے جواہرات کی مجھے ضرورت نہیں راج کماری۔''

''کیوں نہیں۔''

''بھلا ...... انسان کو دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ تو ہمارا فرض ہوگا کہ ہم تمہیں دولت سے مالا مال کردیں تا کہ تم ساری زندگی آرام وسکون سے رہ سکوں گی۔''

ناگنی نے کماری کا جی رکھنے کے لئے کہا۔'' شکریہ کماری جی...... مگر ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا یہ تختہ سمندر کی موجوں پر تیرتا ہوا کہاں اور کدھر جارہا ہے۔''

راج کماری نے چاروں طرف سمندر میں نگاہ ڈالی اور پھر آسمان کی سمت دیکھا اور کہا میں نے درباری نجومی سے جوتش پڑھی ہے مجھے ستاروں کے حساب کا پتہ ہے میرا حساب کہتا ہے کہ اس وقت ہم سمندر میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔''

ناگنی نے کہا۔''ہمارا جہاز اسپین جارہا تھا اصل میں میرا ایک بھائی ہے شاہان وہ مجھ سے بچھڑ کر اسپین چلا گیا ہے میں اس سے ملنے اسپین جارہی تھی کہ جہاز میں آگ لگ گئی۔ اب اگر ہم تختے پر تیرتے ہندوستان کے ساحل پر جالگیں تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی کیونکہ اس طرح ہمارا آدھا کام پہلے ہی ہوجائے گا اگر اسپین پہنچ گئے تو وہاں سے پھر ہمیں کسی جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان جانا پڑے گا کماری نے فضا کی بو کو سونگھتے ہوئے کہا میرا حساب کہتا ہے کہ جو ہوا میں نمی کی بو ہے یہ مغرب کی سمندروں کی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کے سمندروں کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے ساحل کی طرف بہہ رہے ہیں۔'' کماری نے کہا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم ملک سماٹرا کی طرف نکل جائیں۔'' میرے خدا ناگنی بولی۔

''وہ تو ہم بہت دور نکل جائیں گے۔'' کماری کو اب پیاس اور بھوک محسوس ہونے لگی تھی ناگنی نے سوچا کہ پانی اور کھانے کا کیا کیا جائے اس کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں تھا راج کماری کو بھوک بھی لگے گی اور پیاس بھی لگے گی ناگنی نے کہا اس کا بھی کوئی انتظام کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم مچھلیاں پکڑ کر کھائیں گے کیونکہ اس سمندر میں ہمیں سوائے مچھلی کے اور کچھ بھی نہیں مل سکتا کماری نے آہ بھر کر کہا۔

''اور پانی کہاں سے آئے گا؟''

''ہوسکتا ہے کہ بارش ہوجائے اور اگر ایک ہفتے تک بارش نہ ہوئی تو کیا کریں گے۔'' ناگنی نے جواب میں کہا۔

''تمہارے لئے پانی کہیں نہ کہیں سے ضرور پیدا کروں گی۔ راج کماری فکر نہ کرو اور کیا تم نہیں پیوں گی چلو میں بھی پی لوں گی۔'' ناگنی نے تھوڑا ہنس کر کہا وہ راج کماری کو ہنستے ہنساتے رکھنا چاہتی تھی کیونکہ بھوک اور پیاس اسے برباد کرسکتا تھا۔

دوسری طرف شریم اتنی دیر سے خاموش تھا اسے بڑی الجھن ہورہی تھی اتنے لمبے سمندری سفر میں وہ کہاں تک چپ رہ سکتا تھا۔

ناگنی کو بھی احساس تھا کہ شریم بڑی دیر سے خاموش ہے کہیں اچانک بول کر راج کماری کو ہڑبڑا نہ دے وہ تو بھوت سمجھ کر بے ہوش ہوجائے گی ناگنی نے بہتر یہی سمجھا کہ شریم کے غیبی ہونے کا راز وہ خود ہی کھول دے گی ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ شریم نے شرارت کر ڈالی گرمی کی وجہ سے ناگنی نے اپنی پرانی طرز کی بند کالر والا کوٹ پہنا ہوا تھا وہ اتار کر تختے کے پاس ہی رکھ دیا۔

شریم کو جانے کیا سوجھی کہ بڑے آرام سے

اسے اٹھالیا راج کماری سمندر میں کسی دور شے کو تک رہی تھی کہ اچانک کوٹ اوپر اٹھ گیا اور ہوا میں رک کر سیدھا ہو گیا۔

راجکماری چیخ مار کر ناگنی سے لپٹ گئی بھوت بھوت ناگنی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہا۔ ''آخر تم باز نہیں رہ سکتے شریم بھائی۔'' راج کماری نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''شریم کون ہے اور یہ کوٹ کس نے اوپر اٹھا رکھا ہے کیا یہ کوئی بھوت ہے ناگنی۔''

ناگنی نے شریم سے کہا۔ ''اب خود ہی اپنا تعارف کراؤ۔'' شریم نے کوٹ تختے پر ہی رکھ دیا اور بڑے ہی نرم لہجے میں راج کماری سے اپنا پورا تعارف کروایا اس نے بتایا کہ وہ ناگنی کا بھائی ہے کوئی بھوت نہیں ہے لیکن کسی جادو کے اثر سے وہ غائب کر دیا گیا ہے ہمارا ایک بھائی شاہان بھی ہے جو اسپین میں چلا گیا ہے ہم اس کی تلاش میں میں جا رہے ہیں کہ تم مل گئی مجھ سے ڈرو نہیں رج کماری میں تمہارا بھائی کے برابر ہوں۔''

راج کماری کا ڈر دور ہوا تو اس نے کہا۔ ''کیا تمہیں میں ہاتھ لگا کر چھو سکتی ہوں۔''

''نہیں راج کماری تم ایسا نہیں کر سکتی میں ایک غیر مادی جسم ہوں، تم مجھے چھو نہیں سکتی۔'' راج کماری کا ڈر و خوف پوری طرح دور ہو چکا تھا۔

ان کا سب سے بڑا مسئلہ پانی کا تھا کیونکہ دوسرے روز راج کماری کا پیاس کے مارے برا حال ہونے لگا ناگنی اور شریم پریشان ہو گئے خوش قسمتی سے شام میں کالی گھٹا چھا گئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی راج کماری نے جی بھر کر پانی پیا اور تختے کے ایک گڑھے میں پانی بھی جمع ہو گیا ساری رات بارش ہوتی رہی چوتھے روز ان کا تختہ سمندری چٹانوں کے درمیان پہنچ گیا یہ چٹانیں سمندر کے اندر سے باہر نکلی ہوئی تھی اصل میں یہ چھوٹے چھوٹے آتش فشاں پہاڑ تھے جن کے اندر کھولتا ہوا لاوا ابل رہا تھا۔ اور پھٹ کر باہر نکلنے کو تیار تھا اس کی خبر نہ شریم کو تھی اور نہ ناگنی کو۔ وہ تختہ کو چٹانوں کے درمیان سے بچا کر لے جا رہے تھے کہ اچانک ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ایک چٹان کا منہ پھٹ گیا اور سرخ رنگ کا کھولتا ہوا لاوا نکل کر سمندر میں گرنے لگا۔ ناگنی نے راج کماری کو تختے پر اپنے پیچھے کر لیا شریم نے چیخ کر کہا۔

''تختے کو پیچھے کی طرف کر لو آگے آگ ہے لاوے کے سمندر میں گرنے سے خوف ناک آواز اور خوف ناک دھماکے بلند ہو رہے تھے۔ ابھی ناگنی اور راج کماری تختے کو بڑی مشکل سے پیچھے ہی کر رہی تھی کہ سامنے کی دو چٹانوں میں بھی دھماکے ہوئے اور ان کے اندر سے بھی لاوا ابل ابل کر سمندر میں گرنے لگا۔ ان کا تختہ موت کی کھولتی ہوئی وادی میں آ گیا تھا ان کے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔

ناگنی نے چلا کر شریم سے کہا۔'' شریم راج کماری کو اپنے ساتھ غائب کر کے ان چٹانوں سے دور لے جاؤ، میں تمہیں آگے جا کر سمندر میں ملوں گی میں سمندر میں غوطہ لگا رہی ہوں۔'' شریم نے راج کماری کو کندھوں پر اٹھا لیا لاوا اب ان کے تختے تک پہنچ گیا تھا اور تختہ آگ میں جلنے لگا تھا شریم کے کندھے پر آتے ہی راج کماری بھی شریم کی طرح غائب ہو گئی۔ شریم اسے غیبی حالت میں ہی چٹانوں سے دور ایک ایسی چٹان پر آ گیا۔ جو ٹھنڈی تھی اور جہاں آگ بالکل بھی نہ تھی اس نے راج کماری کو چٹان کے پاس پتھروں پر رکھ دیا اور کہا ''ہمیں ناگنی کا انتظار کرنا ہوگا۔''

راج کماری نے پریشانی سے کہا۔'' ناگنی کو اگر کچھ ہو گیا تو؟''

شریم نے کہا۔'' نہیں وہ سمندر میں غوطہ لگا کر بچ جائے گی تم اس کی فکر نہ کرو وہ ابھی ہمارے پاس آ جائے گی۔'' راج کماری خاموش ہو گئی یہ ایک اکیلی سمندری چٹان تھی اس کے ارد گرد سمندر کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں دور آتش فشاں پہاڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی سمندر میں لاوا ابل رہا تھا۔

ناگنی نے سانپ بن کر سمندر میں غوطہ لگا دیا تھا

اور وہ سمندر کے اندر ہی اندر کافی نیچے گہرائی میں اتر گئی تھی اس جگہ اندر سمندر کے نیچے بے شمار چٹانیں ہی چٹانیں تھیں یہ اوپر ابھری ہوئی آتش فشاں چٹان کی جڑیں تھیں جو سمندر کے اندر تک چلی گئی تھیں۔ ناگنی سانپ بن کر پانی کے اندر ان چٹانوں کے درمیان سے ہو کر آگے نکلتی جا رہی تھی چٹانوں کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا یہاں تک کہ سامنے ایک غار آ گیا یہ سمندر کے اندر کا غار تھا ناگنی نے سوچا کہ شاید اس میں سے گزر کر کوئی باہر نکلنے کا راستہ نکل آئے پس وہ غار میں داخل ہو گئی غار میں سمندر کی لہر بڑی تیز تھی ایک زبردست طوفان تھا جو ناگنی کو سمندری سرنگ کے اندر آگے ہی آگے بہائے لئے جا رہا تھا اس نے رکنے کی بہت کوشش کی مگر پانی کا ریلا اس قدر تیز تھا کہ وہ کسی جگہ بھی نہ رک سکی اور بہتی چلی گئی سرنگ میں آہستہ آہستہ اندھیرا چھا گیا یہاں پانی کا دباؤ بھی بڑھ گیا تھا اور ناگنی اپنے جسم کو یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی اسے سختی سے دبا رہا ہو۔

ناگنی پر غشی طاری ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو سرنگ کے سمندری ریلے کے حوالے کر دیا کافی دیر سرنگ کے اندر رہنے کے بعد جب ناگنی کو ہوش آیا تو وہ سرنگ سے باہر نکل چکی تھی یہاں سمندر کے نیچے قسم قسم کے سمندری پھول کھلے تھے۔ یہاں سبز روشنی بھی پھیلی ہوئی تھی وہ سمجھ گئی کہ سمندر کے اوپر سورج نکلا ہوا ہے اور اسے اب باہر نکلنا چاہئے ناگنی نے منہ اوپر کر کے اوپر کی طرف آنا شروع کر دیا یہاں بھی سمندر کافی گہرا تھا ناگنی کافی دیر کے بعد اوپر آ گئی اس نے اپنا سر سمندری سطح سے باہر نکال کر دیکھا۔

وہ کسی عجیب سمندری علاقے میں آ گئی تھی یہ ایک سمندری گھاٹی تھی جس کی تینوں جانب اونچے اونچے سرسبز پہاڑ تھے اور ایک طرف کھاڑی کھلے سمندر کو جاتی تھی ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ ہوا میں لہرا رہے تھے پہاڑ کے دامن میں کیلے کے باغ ہی باغ تھے ایک طرف کھیت تھے دور گول چھتوں والی کھپریل کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں ناگنی سانپ کی شکل میں کھاڑی کے پانی میں تیرتی ہوئی نکل گئی۔ یہ کوئی آباد جزیرہ لگتا تھا جہاں کافی لوگ آباد ہوں کیونکہ مکئی کے کھیت دور پہاڑوں تک چلے گئے تھے ناگنی سانپ کی شکل میں گیلی گھاس اور پھر ریت پر رینگتی ہوئی سمندر کی کھاڑی سے باہر آ گئی وہ انسانی شکل میں آنے ہی والی تھی کہ اسے بین کی آواز سنائی دی سپیرے عام طور پر بین بجا کر جنگلوں، سمندروں اور دریاؤں کے کنارے سے زہریلے سانپوں کو پکڑا کرتے تھے۔

ناگنی نے سوچا کہ چلو آج سپیرے کے ہاں جاتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ یہ کون سا ملک ہے اور یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں بین کی آواز قریب آتی جا رہی تھی ناگنی نے سر اٹھا کر دیکھا تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کالے رنگ کا بوڑھا سپیرا دھوتی کرتا پہنے سر پر پگڑ رکھے گال پھلائے بین بجاتا ہوا اس کی طرف ہولے ہولے بڑھ رہا تھا سپیرے نے بھی ناگنی کو دیکھ لیا تھا۔

ناگنی نے وہیں اپنا پھن اٹھا لیا اور بین کی آواز پر یونہی جھومنے لگی سپیرا اس کے سامنے آ کر زمین پر بیٹھ گیا وہ ایک ہاتھ سے بین بجا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی پٹاری آگے کھسکاتا جا رہا تھا اس پٹاری میں وہ ناگنی کو بند کرنا چاہتا تھا۔ موت کا اسے ڈر تھا وہ ان سپیروں کا بھی تجربہ کرنا چاہتی تھی اسے کوئی ڈر نہ تھا کیونکہ ذرا سی بھی خطرے کی صورت میں وہ بڑی آسانی سے پٹاری سے باہر نکل کر کوئی بھی جانور بن کر ہوا میں اڑ سکتی تھی۔

ناگنی پٹاری کے پاس آ کر جھومنے لگی سپیرا بڑا خوش تھا کہ اس کو بڑا قیمتی اور زہریلی ناگنی مل گئی ہے۔ یہ ایک کافی بڑا جزیرہ تھا جو آباد تھا اور جہاں فرانس کی حکومت تھی اس جزیرے میں فرانس کی ایک کروڑ پتی بیوہ اپنے اکلوتے بچے کے ساتھ اپنے شاندار محل میں رہتی تھی اس اکلوتے بچے کی عمر آٹھ سال تھی بیوہ کی موت کے بعد یہی بچہ اس کی کروڑوں روپے کی جائیداد

کا مالک بننے والا تھا اس بیوہ کا بھائی نہیں چاہتا تھا کہ جائیداد اس لڑکے کو ملے لڑکے کا نام لونی تھا بھائی لڑکے لونی کو اس طرح ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ اس کی موت قدرتی ہو اور کسی کو اس پر شک نہ پڑے۔ اس نے سوچ سوچ کر ایک ترکیب نکالی کہ لڑکے کو سانپ سے ڈسوا کر ہلاک کر دیا جائے بیوہ کے بھائی وکی نے خفیہ طور پر ایک افریقہ کے سپیرے کی خدمات حاصل کی اور اسے کہا کہ کوئی زبردست زہریلا سانپ لاک کر دے سپیرے کو دو سو پاؤنڈ دیا گیا تھا۔

سپیرے نے جو ناگنی کو پٹاری کے قریب آ کر جھومتے دیکھا تو اپنی کامیابی پر وہ خوش ہوا اس نے بین بجاتے بجاتے پٹاری کا منہ کھول کر اس کے آگے رکھ دیا ناگنی بڑے آرام سے پٹاری کے اندر چلی گئی سپیرے نے جھٹ پٹاری کا منہ بند کر دیا اور اسے بغل میں دبا کر شہر سے باہر والی کوٹھی کی طرف اٹھ دوڑا۔

وکی اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ سپیرے نے جا کر پٹاری اس کے آگے رکھ دی اور کہا۔ ”صاحب ایسی سمندری زہریلی ناگنی پکڑ کر لایا ہوں کہ جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔“ اور سپیرے نے پٹاری کا منہ کھول کر وکی کے سامنے رکھ دیا۔

وکی نے ذرا گردن آگے کر کے پٹاری میں کنڈلی مارے بیٹھی ناگنی کو دیکھا تو فوراً پیچھے ہٹ گیا سبز اور سرخ دھاریوں والی یہ دبلی پتلی ناگنی اپنے خطرناک زہر کی وجہ سے سارے علاقے میں مشہور تھی وکی نے جیب سے بٹوا نکالا اس میں سے دو سو پاؤنڈ کے نوٹ نکال کر سپیرے کو دیئے اور کہا۔ ”خبردار اگر کسی سے بات کی تو میرے آدمی تمہیں قتل کر دیں گے۔“

سپیرے نے کہا۔ ”مالک میں غلام ہوں کسی سے بات نہیں کروں گا میں کل ہی ملک سوڈان چلا جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے یہ لو اور پچاس پاؤنڈ کرایہ اور کل اس جزیرے سے دفعہ ہو جانا۔“ وکی نے پچاس پاؤنڈ کے نوٹ سپیرے کی طرف اچھال دیئے۔ سپیرے نے نوٹ زمین سے اٹھا کر اپنی پگڑی میں رکھے اور سلام کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا اس کے جانے کے بعد وکی نے مسکراتے ہوئے ناگنی کی پٹاری اٹھائی اور کوٹھی میں آ گیا یہ پرانی طرز کی بجی سجائی کوٹھی تھی جس کے بیڈروم میں پتھر کے ستون کھڑے تھے ستون کے پاس لکڑی کی الماری تھی وکی نے پٹاری اس الماری میں رکھ کر باہر سے تالا لگا دیا۔ اتنے میں اس کا رازدار دوست آ گیا وکی نے اسے بتایا کہ سانپ آ گیا ہے دوست بولا۔

”ٹھیک ہے آج رات لونی کا کام تمام ہو جائے گا یہ پٹاری مجھے دے دو میں آدھی رات کو لونی کے بیڈروم میں جا کر سانپ اس کے بستر پر چھوڑ دوں گا اس کے بعد صبح اس کی لاش ملے گی اور تمہارا راستہ صاف ہو جائے گا پھر میں اپنی بوڑھی بہن کے مرنے کے بعد اس کی ساری جائیداد کا اکیلا وارث ہوں گا اور مجھے میرا حصہ مل جائے گا ضرور تمہیں تمہارا حصہ ملے گا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لونی کی موت کے بعد تمہیں بیس ہزار پاؤنڈ کی رقم کی ضرورت تھی۔

”لاؤ پٹاری مجھے دے دو میں آج ہی رات یہ قصہ ختم کر دوں گا۔“ وکی نے لکڑی کی الماری میں سے ناگنی والی پٹاری نکال کر اپنے قاتل دوست کے حوالے کر دی وہ پٹاری کو کپڑے میں لپیٹ کر نکل گیا۔ ان کی باتوں سے ناگنی سمجھ گئی تھی کہ یہ ظالم لوگ صرف جائیداد کے چکر میں کسی معصوم بچے کو قتل کرنے کی سازش پر عمل کرنے والے ناگنی کو خیال آیا کہ یقیناً وہ لڑکا خوش قسمت ہے کہ وہ اس جائیداد کا سچا وارث ہے کہ اسے دوسرے سانپ کی جگہ ناگنی مل گئی تھی اگر ناگنی کی جگہ کوئی اور دوسرا سانپ آ جاتا تو وہ یقیناً اس بچے کو ہلاک کر دیتا مگر ایسا خدا کو منظور نہیں تھا۔

قاتل سانپ کی پٹاری لے کر آدھی رات کے وقت کروڑ پتی بیوہ عورت کے محل میں کھڑکی کے راستے سے داخل ہوا لڑکا محل کے کونے والے کمرے میں سویا تھا ساتھ ہی اس کی ماں کا کمرہ تھا قاتل اس محل میں آتا جاتا تھا مگر آدھی رات کو اسے بھی اس لڑکے کے کمرے میں جانے کی اجازت تک نہ تھی۔

قاتل اندھیرے میں چھپتا چھپاتا لڑکے کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا اس نے پٹاری کا منہ کھول کر ناگنی کو کمرے میں داخل کرا دیا۔ ناگنی نے کمرے میں پہنچ کر دیکھا کہ ایک شاندار مسہری پر بڑا ہی پیارا لڑکا سو رہا ہے اس کے سرہانے کی طرف شمع روشن تھی لڑکے لونی کی شکل بالکل معصوم اور پاکیزہ تھی۔

ناگنی نے اندر جاتے ہی انسانی شکل میں آ گئی تھی کچھ دیر لڑکے کو دیکھتے رہنے کے بعد ناگنی نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گی جو جائیداد کے جائز حق دار کو مارنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ وہ تو اپنی طرف سے تو اس بچے کو ہلاک کر چکے تھے۔

ناگنی دوبارہ ناگنی بن کر کمرے سے باہر آ گئی راہ داری میں اس وقت اندھیرا تھا قاتل بیوہ عورت کی کھڑکی سے نیچے اتر رہا تھا وہ واپس فوراً وکی کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ناگنی کو بچے کے کمرے میں چھوڑ دیا ہے اور ناگنی نے بچے کو ڈس کر ہلاک کر دیا ہوگا اس لئے میری رقم میرے حوالے کرو۔

ناگنی دیوار پر سے رینگتی ہوئی قاتل کے قریب آ گئی تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں قاتل نے جو اپنے سامنے دیوار پر اسی ناگنی کو دیکھا جس کو وہ ابھی ابھی بچے کی خواب گاہ میں چھوڑ کر آیا تھا تو دہشت کے مارے اس کی چیخ نکل گئی اور رسی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ آدھی منزل اوپر سے پھسل کر دھڑام سے نیچے گرا ناگنی نے اسے اٹھنے کی مہلت ہی نہ دی وہ بھی دیوار چھوڑ کر اس کے اوپر آن گری۔

قاتل نے ایک اور چیخ ماری مگر ناگنی نے اسے تیسری بار چیخنے کی مہلت ہی نہ دی اس نے قاتل کی گردن پر بڑے ہی پیار سے ڈسا اور اپنے منہ سے اچھا خاصا زہر اس کے جسم میں داخل کر دیا زہر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ قاتل کو بالکل سن کر دیا پھر وہ لرزا کانپا اور ٹھنڈا ہو گیا ناگنی اس کام سے فارغ ہو کر سیدھا جنگل والی اس کوٹھی میں اس آدمی کے پاس آ گئی جس نے بچے کو سانپ سے ڈسوا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اس بدنصیب قاتل کو بھیجا۔

جنگل میں خاموشی تھی قاتل کی کوٹھی میں اندھیرا تھا صرف کونے والی کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی قاتل بچے کی موت کی خبر کا انتظار کر رہا تھا ناگنی گھاس میں رینگتی ہوئی برآمدے میں سے گزر کر کوٹھی کی دیوار پر چڑھ گئی اس نے کھڑکی میں سے دیکھا وکی اندر بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا ناگنی کھڑکی میں سے پھسل کر کمرے میں آ گئی فانوس کی روشنی میں وکی نے ناگنی کو دیکھا تو ایک سلاخ لے کر اس کی طرف بڑھا اسے ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ وہی ناگنی ہے جسے اس نے قاتل کے ہاتھ جائیداد کے حقیقی وارث کو ڈسوانے بھیجا تھا ناگنی نے سلاخ کو اپنے اوپر آتے دیکھا تو ایک دم سے غائب ہو گئی۔

وکی نے خیال کیا کہ ناگنی پلنگ کے نیچے چلی گئی ہو وہ جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھنے لگا تو ناگنی فوراً انسانی شکل میں آ گئی اور اس نے پیچھے سے وکی کی کمر پر انگلی سے ٹہوکا دے کر کہا۔ ”کہو مسٹر بچے کو ناگنی سے ڈسوا دیا۔“

وکی یہ سن کر ہڑبڑا کر اٹھا اور پلٹا اور سامنے ایک اجنبی لڑکی کو دیکھا تو اور زیادہ حیران ہوا۔

”کون ہو تم؟ یہاں کیسے آ گئی ہو؟“

ناگنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تو میں ہر جگہ چلی جاتی ہوں مگر یہاں میں خاص طور پر تمہیں مارنے آئی ہوں۔“ وکی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اس نے دیوار پر لٹکی ہوئی تلوار کھینچ کر ناگنی پر حملہ کر دیا بڑا مکارانہ اور چالاک حملہ تھا اگر ناگنی ہوشیاری سے کام نہ لیتی تو تلوار نے اس کا کام کر دیا ہوتا۔ ناگنی نے سوچا کہ ذرا اس کے ساتھ تو مقابلہ ہو جائے۔

ناگنی نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک دم سے شیر بن گئی اس نے اتنے زور سے دھاڑ ماری کہ وکی کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر پڑی اس پر شیر کی بھی دہشت

تھی اوراس بات کی بھی دہشت تھی کہ ایک زندہ لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے ببر شیر کیسے بن گئی شیر نے وکی کی گردن پر ایک ہلکا سا پنجہ مارا اور وکی چیخ مار کر نیچے گر پڑا ناگنی اس کے فوراً بعد ایک بار پھر کالی ناگنی کی شکل میں ظاہر ہوگئی وہ کنڈلی مار کر قالین پر بیٹھ گئی اس نے اپنا پھن اٹھالیا اوراپنی سرخ زبان لہراتی پھنکاریں مارتی قاتل کی طرف بڑھنے لگی۔

قاتل وکی کا حلق خوف سے خشک ہوگیا تھا بلکہ اس کا تو سارا خون ہی خشک ہوگیا تھا ناگنی نے انسانی زبان میں کہا۔ ''تم نے ایک معصوم بچے کو صرف دولت کے لئے ہلاک کرنا چاہا تھا خدا نے اسے بچالیا اب تم اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوجاؤ کیونکہ جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے پہلے خود اس میں گرتا ہے۔''

وکی نے کہا۔ ''مجھے معاف کردو۔'' ناگنی بولی۔

''تم معافی کے لائق ہی نہیں ہو۔ تم میرے جانے کے بعد پھر سے اس بچے کو قتل کردو گے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم خود اس دنیا سے رخصت ہوجاؤ۔ فکر نہ کرو میرا زہر تمہیں ذرا بھر بھی تکلیف نہ دے گا۔'' اور ناگنی ناگنی کی شکل میں وکی کے بالکل سر پر آگئی پھر اس نے قاتل کو ڈس لیا، قاتل الٹ کر گرا اور اوندھا ہوگیا زہر بے حد زہریلا اور خطرناک تھا اس کام سے فارغ ہوکر ناگنی رینگتی ہوئی کوٹھی سے باہر آگئی۔

رات ڈھلنا شروع ہوگئی تھی ناگنی کوٹھی کے باغ کی کیاریوں میں رینگتے ہوئے باہر ایک چھوٹی سی پکی سڑک پر آگئی جو شہر کی طرف جاتی تھی اس نے سوچا کہ اب اسے دوبارہ انسانی شکل میں آجانا چاہئے اور یہ پتہ لگانا چاہئے کہ یہ جزیرہ اسپین سے کتنی دور ہے۔

ناگنی لڑکی بن گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی رات کے اندھیرے میں شہر کو جانے والی پکی سڑک پر آکر رک گئی ناگنی کو شریم کی بھی فکر تھی کہ وہ راج کماری کو لے کر سمندر میں کہا ہوگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شریم بس زیادہ سے زیادہ ان آگ اگلتے پہاڑوں کے اوپر تک ہی اڑ سکتا تھا ناگنی اڑ کر وہاں پہنچ جاتی اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ شریم سمندر کے کس علاقے میں ہے ابھی تو اسے یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سے علاقے میں ہیں۔

ناگنی کو سب سے زیادہ شاہان کا خیال آرہا تھا کیونکہ اس کی کوئی خبر ابھی تک نہ ملی تھی ناگنی کو یقین تھا کہ وہ ملک اسپین کی طرف نکل گیا ہوگا ناگنی نے دل میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ یہاں سے اسپین جانے کی کوشش کرے گی شریم اور راج کماری کی طرف سے وہ مطمئن تھی کیونکہ شریم بھی ایک بہادر تھا کہ وہ راج کماری کو اس کے راجہ باپ کے پاس ہندوستان پہنچادے گا اس کے بعد شریم کی ناگنی سے کہاں ملاقات ہوتی ہے یہ بات ناگنی نے خدا کے سپرد کردی تھی۔

ناگنی اپنے خیالوں میں تھی کہ دور سے اسے گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ پھر پچھلے پہر کے ماند پڑتے ہی اندھیرے میں اسے ایک گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دی ناگنی نے ہاتھ کا اشارہ کرکے اسے رکوادیا! ایک گھنی مونچھوں والے آدمی نے سر باہر نکال کر نیچے سے کہا۔ ''کون ہو تم؟'' ناگنی نے کہا۔

''مجھے شہر لے چلیں میرا جانا ضروری ہے۔'' اس آدمی نے کچھ سوچا اور پھر کہا۔

''آجاؤ..... اندر۔'' بگھی کا دروازہ کھل گیا ناگنی اندر داخل ہوکر گھنی گھنی مونچھوں والے آدمی کے سامنے بیٹھ گئی بگھی میں سوائے اس آدمی کے اور کوئی نہیں تھا اس نے ناگنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کی رہنے والی ہو۔''

ناگنی نے کہا۔ ''میرا نام ناگنی ہے اور میں شمالی مصر کی رہنے والی ہوں اس ملک میں روزگار کی تلاش میں آئی ہوں۔ مونچھوں والے نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''تمہارا نام مصری نہیں ہے خیر کوئی بات نہیں میرا نام ولیم ہے میرا اپنا سمندری جہاز ہے میں مال لے کر ملک ملک کا سمندری سفر کرتا ہوں کیا تم میرے جہاز میں نوکری کروگی۔''

ناگنی کو اور کیا چاہئے تھا یہی تو وہ چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح جہاز میں بیٹھ کر اسپین چلی جائے اس نے جھٹ حامی بھرلی ولیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم بڑی جلد باز ہو۔ مجھے جلد فیصلہ کرنے والی پسند نہیں، لیکن میں تمہیں نوکری پر رکھتا ہوں آئندہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا کرو۔'' ولیم کی زبانی ناگنی کو پتہ چلا کہ وہ مڈغاسکر کی بندرگاہ پر ہے اور اس کا جہاز مال لے کر دو روز بعد پرتگال کے ملک کو جانے والا ہے ولیم ناگنی کو لے کر اپنے جہاز پر آگیا یہ مال بردار جہاز زیادہ بڑا نہ تھا دو دن ناگنی نے شہر کی سیر گشت میں گزار دیئے تیسرے دن جہاز نے صبح صبح لنگر اٹھادیا اور سمندر کے نیلے پانی پر اپنا طویل اور خطرناک سفر شروع کردیا۔

☆......☆......☆

ادھر شاہان ابھی تک پراسرار آسیبی محل کے تہہ خانے کے کنویں میں پڑا تھا اس کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا تہہ خانے میں چبوترے پر عمارہ کا تابوت رکھا تھا عمارہ اس میں بے ہوش پڑی تھی اور پورے چاند کی رات کو اس کی گردن کاٹ کر نقاب پوش نے ایک طلسم تیار کرنا تھا جس کی مدد سے وہ ہزاروں سال تک زندہ رہ سکتے تھے۔

شاہان ناگنی کے بارے میں سوچتا کبھی اسے شریم کا خیال آتا کہ وہ کہاں ہوگا اور کبھی اس بات پر غور کرنے لگا کہ وہ اس کنویں سے کیسے باہر نکل سکتا ہے دوسری طرف شریم ایک چٹان پر راج کماری کو ساتھ لئے بیٹھا تھا سمندر کی موجیں چٹان سے ٹکرا کر شور مچاتی واپس چلی جاتیں اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

راج کماری سخت گھبرا رہی تھی ان کے پاس کچھ کھانے کو تھا نہ کچھ پینے کو تھا شریم بھی اسی فکر میں تھا کہ وہاں سے کہاں جائے راجکماری تو دو تین دن میں بھوکی پیاسی مر جائے گی پھر بھی وہ راج کماری کو تسلی دیتا اور یہی کہتا کہ ''کوئی نہ کوئی سبیل ان کے وہاں سے نکلنے کی ضرور بن جائے گی۔'' لیکن راجکماری بڑی مایوس ہوچکی تھی اس کی مایوسی درست لگتی تھی کیونکہ وہ بیچ سمندر میں باہر کو نکلی ہوئی ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھے تھے ان کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا وہاں کسی جہاز کے آنے کی امید بھی نہ تھی۔

اس نے کہا۔ ''شریم بھائی تم تو زندہ رہو گے اس لئے کہ نہ تو تمہیں کھانے کی ضرورت ہے اور نہ پینے کی اور میں اسی چٹان پر دم توڑ دوں گی۔'' پھر وہ اپنے ماں باپ کو یاد کرکے رونے لگی جو فرانس میں اس کی یاد میں رو رہے ہوں گے شریم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا راج کماری خداوند کی رحمت بے حساب ہے وہ پتھر میں بھی کیڑے کو روزی دیتا ہے کیا معلوم وہ ہمارے لئے بھی کوئی سبب پیدا کردے گا۔'' مگر راج کماری سسکیاں بھرتی رہی آج اسے نیند آگئی اور وہ وہیں چٹان کے پہلو میں پتھریلی اور ڈھلان جگہ پر لیٹ گئی اور سوگئی۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے رات اسی طرح گزر گئی دن چڑھا تو شریم نے دیکھا کہ سمندر میں جہاں آتش فشاں پہاڑ تھے وہاں سبز اور سرخ رنگ کی بڑی بڑی سلیں تیر رہی تھیں یہ وہ مودا تھا جو زمین کے اندر سے ابلتے ہوئے لاوے کے ساتھ باہر آگیا تھا اور سمندر کے پانی میں ٹھنڈا ہوکر تیر رہا تھا راج کماری ابھی تک سو رہی تھی دو تین سرخ اور سبز سلیں تیرتی ہوئی اس چٹان کے قریب آگئی جہاں شریم اور راجکماری نے پناہ لے رکھی تھی۔

شریم نے پانی میں تھوڑا سا اتر کر ایک سل کو کھینچ کر اپنی طرف کرکے دیکھا یہ دیکھنے میں پتھر لگتی تھی مگر اسفنج کی طرح نرم تھی خدا جانے یہ کس قسم کی دھات تھی اس قسم کے ہزاروں ٹکڑے سمندر کی موجوں پر تیر رہے تھے شریم ابھی ان پر غور کررہا تھا کہ ایک طرف سے چھ سات کشتیاں نمودار ہوئیں یہ ڈونگیں تھیں اور اسی جزیروں میں رہنے والے جنگلی چلا رہے تھے وہ ان سرخ اور سبز سلوں کو اٹھا اٹھا کر اپنی کشتیوں میں رکھ رہے تھے شریم اور تو سب کچھ بھول گیا اسے کشتیاں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اب اسے امید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ راجکماری کو وہاں سے نکال کر لے جائے گا اسے

میں راج کماری بھی جاگ پڑی۔
شریم نے اسے خاموش رہنے کو کہا کیونکہ ایک کشتی ان کی طرف آ رہی تھی جلدی سے کہیں چھپ جاؤ شریم نے راج کماری کو چٹان کے پیچھے ایک اونچے نکونے پتھر کی آڑ میں چھپا دیا۔ اور خود سامنے آ خر دیکھنے لگا کہ جنگلی لوگ ادھر کشتی کیوں لا رہے تھے یہ کسی قریبی جزیرے کے جنگلی تھے بدن پر صرف جھاڑیوں کے لنگوٹ سا باندھ رکھا تھا ہاتھوں میں نیزہ تھے ہر کشتی میں چار چار جنگلی تھے دو نیزوں کی مدد سے سرخ سیلوں کو اپنی طرف کھینچ کر کشتی میں رکھ رہے تھے اور دو چپو چلا رہے تھے چٹان پر آ کر جنگلی لوگوں نے کشتی پہاڑ کے ساتھ لگائی اور اس میں اکٹھی کی ہوئی سلوں کو اتار کر ایک جگہ جمع کرنے لگے شریم ان کے بالکل قریب کھڑا دیکھ رہا تھا اسے بس ایک ہی ڈر تھا کہ اگر ان میں سے کوئی دوسری طرف چلا گیا تو راج کماری کو دیکھ کر شور مچا دے گا پھر ساری کشتیوں کے جنگلی وہاں آ کر جمع ہو جائے گے اور شریم کے لئے اتنے سارے دشمنوں میں راجکماری کی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔
چنانچہ شریم بالکل تیار ہو گیا تھا کہ جونہی ان میں سے کوئی دوسری طرف گیا وہ اسے وہیں ختم کر دے گا مگر ایسا نہ ہوا چاروں جنگلی سلیں چٹان کے پاس رکھ کر انہیں پانی سے صاف کرنے لگے کشتی ان کے پاس ہی کھڑی تھی شریم کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب آ ہی نہیں سکتی تھی وہ جنگلی آدمیوں کی طرف بڑھا وہ کسی عجیب زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور بڑے مزے سے سیلوں کو پانی سے صاف بھی کر رہے تھے۔
شریم نے ایک جنگلی کے پیچھے جا کر زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور جنگلی کی کھوپڑی پر دے مارا ایک چیخ کے ساتھ جنگلی وہیں ڈھیر ہو کر بے ہوش ہو گیا باقی جنگلی اس کی طرف بڑھ رہے تھے شریم نے پتھر سے دوسرے جنگلی کو بھی بے ہوش کر دیا باقی دو گھبرا کر بھاگے کہ خدا جانے وہاں پر کوئی بد روح آ گئی ہے وہ کشتی کی طرف آ گئے لیکن شریم کو کشتی کی تو ضرورت تھی وہ لپک کر کشتی کے پاس آ کھڑا ہو گیا جونہی دونوں جنگلی کشتی کے پاس آئے شریم نے اونچی آواز میں کہا۔
''بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ۔'' شریم کی زبان جنگلی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھی مگر ان کے لئے کسی کی غیبی آواز کافی تھی وہ ڈر کر سجدے میں گر پڑے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے لگے دیوتا ابوس، دیوتا ابوس، جنگلی شریم کی آواز کو اپنے دیوتا ابوس کی آواز سمجھ رہے تھے اور انہوں نے سمندر میں چھلانگ مار دی ان کی آوازیں سن کر دوسرے جنگلی بھی اپنی کشتیاں ادھر لے آئے شریم پریشان ہو گیا۔ کہ ان کم بخت ساروں سے وہ کس طرح نمٹے گا مگر اس کا آدھے سے زیادہ کام ان جنگلیوں نے کر دیا جنہوں نے شریم کی آواز سن کر ابوس کا نعرہ لگایا تھا انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ چٹان پر دیوتا ابوس کی روح آئی ہوئی ہے وہ چٹان سے دور ہٹ کر اس کے گرد چکر لگانے اور ابوس ابوس کی آوازیں نکالنے لگے۔
اتنے میں شریم نے راج کماری سے کہا۔ ''کشتی پر چل کر بیٹھ جاؤ اور جنگلی لوگوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاؤ انہیں یہ تاثر دو کہ تم دیوتا ابوس کی خاص پجارن ہو۔'' راجکماری ڈر رہی تھی۔
شریم نے کہا۔'' راجکماری اگر ڈرتی رہی تو تمہاری موت یقینی ہے ہمت سے کام لو۔'' راجکماری آخر راجا مہاراجوں کے محل میں پیدا ہوئی تھی اس میں ہمت آ گئی وہ چٹان کے پتھر کی اوٹ سے نکل کر کشتی میں آ گئی اور چٹان کے گرد چکر لگاتے جنگلیوں کی طرف ہاتھ لہرا کر انہیں سلام کیا یا ان کے سلام اور آوازوں کا جواب دیا ایک خوب صورت لمبے سیاہ بالوں والی عورت کو چٹان سے نکل کر کشتی میں سوار ہوتے دیکھ کر جنگلی اور زیادہ اونچی آواز میں ''ابوس، ابوس'' کا شور مچانے لگے شریم نے راج کماری سے کہا۔ ''انہیں ابوس کو یاد کرنے دو اور تم جلدی سے چپو سنبھالو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

(جاری ہے)

بہادر کون

گلاب خان سولنگی۔ نوشہرو فیروز

یہ بات زد عام ہے کہ سیکڑوں سال پہلے جس جگہ جم کاربٹ اور شیروں کی لڑائی ہوئی تھی آگ وہاں سے لگتی ہے اور تباہی پھیلاتی ہوئی جنگل کے کافی حصے تک پھیل جاتی ہے۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی بے رونق ہو جاتی ہے، سبق آموز کہانی

صبح سے شام ہونے کو آئی تھی لیکن لگتا ہے آج بھوکے پیٹ ہی دونوں دوست واپس جائیں گے، اوپر سے بادلوں کے ڈیرے، سر شام ہی پورا جنگل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔
''جان لگتا ہے بارش ہونے والی ہے اور ہمارا گھر بھی دور ہے۔ مجھے لگتا ہے ہمیں جانا چاہئے۔''
اپنے دوست جمی کی بات سن کر میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یار جمی! ایک آخری کوشش کرتے ہیں اور گھنے جنگل میں ہرنوں کے چراگاہ کا رخ تلاش کرتے ہیں، ممکن ہو وہ کوئی ہرن، ہمیں مل جائے، ایسے موسم میں کوئی بڑا شکار کرنے سے تو رہے۔''
''جان میری بات یاد رکھنا، میں نے سنا ہے کہ ''جم کاربٹ'' یہیں کہیں جنگلوں میں دیکھا گیا ہے اور تمہیں تو پتا ہے کہ وہ کتنا ظالم ہے، رات ہونے والی ہے، شکار

کل کریں گے۔"

میں اس کی بات سن کر خوب ہنسا۔ "ڈرپوک کہیں کے! یہ ہمارے جیسے ڈرپوکوں کی وجہ سے "جم کارٹر" جیسے لوگ بہادر بنتے ہیں، تم فکر مت کرو، اس سے نمٹنے کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اگر ہماری مڈبھیڑ ہوجاتی ہے تو تم دور سے ہی صرف تماشہ دیکھنا، میں اکیلا ہی اس کے لئے کافی ہوں، اب چلیں ورنہ ہرن بھی کہیں چھپ جائیں گے، اور آج بھی ابا کی ڈانٹ کھانی پڑے گی، وہ کیا ہے ناں، وہ اب بوڑھا ہوچکا ہے اس لئے اس کے حصے کا شکار بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے، ویسے ہرنوں کی وہ چراگاہ جنگل کے کس سمت ہے؟" اس نے مشرقی سمت اشارہ کیا اور ہم دونوں اس طرف روانہ ہوگئے۔ ہم تھوڑی دیر بعد ہی وہاں پہنچ گئے، ہمارے سامنے گنتی کے چند ہرن گھاس چر رہے تھے، اس سے پہلے کہ ہم ان پر حملہ کرتے۔

اچانک کہیں سے بندوق کا فائر ہوا جس سے ایک ہرن زخمی ہوکر گر پڑا جبکہ دوسرے ہرن فوراً بھاگ نکلے، ہم بھی محتاط ہوگئے۔ "ارے یہ کیا! یہ تو جم کارٹر ہے۔" جم کارٹر ہاتھ میں بندوق تھامے ہمارے سامنے جنگلی جھاڑیوں سے نمودار ہوا، اس نے بڑی مہارت سے ہرن کی کھال اتاری اور کام کا گوشت کاٹ کر ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالا، ادھر ادھر دیکھا اور واپس جھاڑیوں میں چلا گیا، اس کے جاتے ہی ہم باقی ماندہ ہرن کے گوشت اور ہڈیوں پر جھپٹ پڑے۔

"یار جی! اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا، کیوں نہ ہم جم کارٹر کا پیچھا کریں اور اسے نہتا پاکر اس کا کام تمام کردیں، وہ ہماری نسل اور برادری کا دشمن ہے، جم کارٹر جیسے شکاری بڑی تیزی سے ہماری نسل کشی کر رہے ہیں، اگر اس طرح چلتا رہا تو مجھے یہ خدشہ لاحق ہے کہ آئندہ چند سالوں میں یہاں کے جنگلات شیروں سے خالی نہ ہوجائیں، اس لئے کسی ایک شیر نے تو قربانی دینی ہے، اگر اپنی نسل کی بقا اور تحفظ کے لئے میری جان قربان ہوگئی تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے اور ویسے بھی ابا کے سوا میرا یہاں کون ہے۔" مجھے جذباتی دیکھ کر جمی میرے قریب آیا۔ "جان! ابھی یہ موقع نہیں ہے اور ہاں اس لڑائی میں آپ اکیلے نہیں ہو۔ جم کارٹر میرے دوست کو مار دے اور میں چپ رہوں، یہ ہو نہیں سکتا دوست ہم دونوں جم کارٹر سے مقابلہ نہیں کریں گے، اب بارش بھی شروع ہوگئی ہے۔ لہٰذا کسی اور موقع پر ہم جم کارٹر کا مقابلہ کریں گے۔"

دونوں شیروں کی جوڑی واپس اپنے اپنے غاروں میں پہنچ گئے۔ "ابا! جم کارٹر کی وجہ سے آج پھر ہمیں بھوکا سونا پڑے گا۔" بوڑھے شیر نے اپنے بیٹے جان سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹا! وہ آدم زاد شکاری زیادہ دنوں تک یہاں نہیں ٹھہرتا، مجھے وسیع تجربہ ہے، وہ یقیناً کسی مہم پر آیا ہوگا، کافی عرصہ ہوگیا ہے جم کارٹر کو دیکھے ہوئے، جوانی میں ہم بھی کافی مرتبہ اس سے لڑنے کی ٹھان چکے تھے لیکن وہ بلا کا مکار اور پھرتیلا ہے، ہر مرتبہ بچ نکلتا ہے، اسے ہماری برادری کے صرف ایک شیر نے نقصان پہنچایا تھا اس کی بیوی کو اپنا شکار بنا کر، بیوی کی جدائی میں جم کارٹر پاگل ہوگیا تھا اس نے شیر سے تو اپنا بدلہ لے لیا تھا لیکن ہم نے سنا تھا کہ اس نے ہمیشہ کے لئے شکار سے توبہ کرلی تھی، یہی وجہ ہے کہ برسوں بعد وہ اس جنگل میں دوبارہ نظر آیا ہے۔

بیٹا! وہ بہت دلیر ہے اور ڈھیٹ بھی، میری نصیحت یاد رکھنا! تم کارٹر کے نزدیک نہیں آنا اور اس سے لڑنے کا خیال تو دل سے نکال ہی دو، ہم کچھ دنوں کے لئے پڑوس والے جنگل کی طرف ہجرت کرکے جائیں گے، جب وہ خونی آدم زاد واپس چلا جائے گا تبھی ہم سب واپس یہاں آئیں گے، باہر بارش تیز ہوگئی ہے، آپ سوجاؤ، میں تھوڑی دیر پہرہ دے کر واپس آکر سوؤں گا، شب بخیر!"

☆......☆......☆

دروازے پر دستک ہوئی۔ "دروازہ کھلا ہے اندر آجاؤ۔" ایک ادھیڑ عمر موٹے تازے آدمی کو اپنے سامنے پاکر جم کارٹر خوشی سے چلایا۔ "ڈیوڈ! میرے دوست!"

تم! اچانک... ڈیوڈ اس کا پرانا دوست تھا، کافی عرصے بعد اسے یوں اچانک دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھا، جم کارٹر نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا، ڈیوڈ نے کمرے کا جائزہ لیا جہاں کی دیواروں پر جگہ جگہ جنگلی شیر، ہاتھی، لومڑ، بھیڑیے کے کٹے ہوئے سر بطور ڈیکوریشن پیس کے طور پر ٹانگے ہوئے تھے، جبکہ کمرے کے فرش پر قالین کی جگہ ان ہی جنگلی جانوروں کی کھال بچھی ہوئی تھی جسے دیکھ کر ڈیوڈ کو لگا جیسے کچھ دیر کے لئے وہ کسی جنگل میں آگیا ہو، اسے تعجب میں پاکر جم کارٹر بول اٹھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو ڈیوڈ، یہ سب میرا ماضی تھا جسے یاد کرکے میں اپنی تنہائی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔" ڈیوڈ صوفے پر بیٹھا جم کارٹر نے ایک پیک اس کی طرف بڑھایا، ڈیوڈ نے ایک کڑوا گھونٹ لیا۔

"یار تیرے بچے نظر نہیں آرہے؟" جم کارٹر نے ایک ہی سانس میں پورا پیک خالی کردیا۔

"بچے...... ہونہہ! بچے جب بڑے ہوجاتے ہیں ناں تب ماں باپ چھوٹے ہوجاتے ہیں، اور ویسے بھی مغرب میں جب بچے جوان ہوجاتے ہیں۔ تب ان کو پر لگ جاتے ہیں اور وہ ماں باپ کے گھونسلے سے اڑ کر کہیں دور چلے جاتے ہیں۔ میری بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کسی دوسرے شہر میں جا بسی اور بیٹے نے ملٹری جوائن کرلی۔ پیچھے رہ گیا جم کارٹر...... تو میرے دوست میں اپنی مرحومہ بیوی اور ان جنگلی جانوروں کی یاد میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار رہا ہوں۔"

"سوری دوست! میں کافی عرصے بعد تجھ سے مل رہا ہوں۔ اس لئے تمہارے حالات سے بے خبر تھا، دراصل میں اسپین چلا گیا تھا، یہاں امریکہ میں رہتے ہوئے گھٹن محسوس ہورہی تھی اور تم بھی اکثر شکار پر چلے جاتے تھے، مجھے سونا بنانے والی ایک کمپنی میں کام مل گیا اور اس طرح میں اسپین شفٹ ہوگیا۔ ہماری کمپنی وہاں کے جنگلوں میں بنے کانوں میں ہیرے اور سونے کی دھات تلاش کرتی ہے اور وہ سونا دنیا کے کئی ممالک میں بیچتے ہیں۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں تو پرانے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملتا ہوں، آج تمہارے پاس ایک آفر لے کر آیا ہوں۔ سوچا کہ اس طرح تم سے ملاقات بھی ہوجائے گی اور کاروبار کا کاروبار بھی اور سناؤ، اپنے بارے میں، میرا مطلب ہے گزر بسر کس طرح ہوتا ہے؟"

جم کارٹر نے سگریٹ نکالا اور اس کے دو کش لگائے اور پھر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"ڈیوڈ! شکار کی عادت کی وجہ سے میں نے اپنی بیوی کھوئی، جس کی وجہ سے میں نے برسوں سے شکار چھوڑ دیا ہے اور اب تنہا گوشہ نشینی کی زندگی جی رہا ہوں۔"

"جم کارٹر! میرے یار بس ایک آخری کام، اور

خیال اپنا

پروفیسر صاحب نے طلبا کو ایک عنوان سروے رپورٹ کے لئے دیا کہ ہمارے ملک میں بڑھتی ہوئی ناخواندگی کی کیا وجوہات ہیں، ایک طالب علم کی رپورٹ کچھ اس طرح تھی۔

ہمارے ملک میں ناخواندگی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ان پڑھوں کو کچھ پڑھایا نہیں جاتا۔ کیونکہ انہیں پڑھنا نہیں آتا۔

دوسری وجہ غریب عوام پڑھائی کا بوجھ نہ سہار کر ناخواندگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

تیسری اہم وجہ کہ ہائی کلاس طبقے کو اپنے ملک کی تعلیمی پالیسی پسند نہیں آئی اور دوسرے انصاف پسند ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو امریکہ کہ ناخواندگی ختم کرنے کے لئے وہاں بھیج دیتے ہیں۔" (شہر یار خان۔ کراچی)

پھر پوری زندگی عیش ہی عیش۔"

جم کارٹر نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے پوچھا۔ "شکار کے لئے نہیں کہو گے باقی ہر کام ہمرا آنکھوں پر۔"

ڈیوڈ مسکرایا۔ "شکار تو نہیں مگر کام جنگل سے جڑا ہوا ہے۔"

جم کارٹر نے اسے غور سے دیکھا تو ڈیوڈ نے بات جاری رکھی۔ "ہماری کمپنی کو معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کے کیلی فورنیا کے جنگلات میں چھپی ایک پہاڑی ایریا میں سونے کی کان موجود ہے، مگر وہاں خون خوار شیروں کا راج ہے، میرا مطلب ہے وہاں شیروں کا علاقہ ہے جو دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی بھی شکاری اور سرکار ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری بیوی بھی وہیں کسی شیر کا شکار ہوئی تھی اور مجھے پتہ ہے کہ جم کارٹر ہی وہ واحد آدمی ہے جسے شیروں سے ڈر نہیں لگتا اور کسی زمانے میں اس نے اکیلے سب شیروں کا مقابلہ کیا تھا اور اپنی بیوی کا بدلہ لیا تھا۔"

جم کارٹر درمیان میں بول پڑا۔ "پر میں نے اب وہ کام چھوڑ دیا ہے۔"

ڈیوڈ معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے اس لئے تم کو وہاں صرف نصف ماہ کے لئے رکنا ہے اور جنگل میں اپنی دھاک بیٹھانی ہے تاکہ جنگلی جانور اور خون خوار شیر وغیرہ وہاں سے بھاگ جائیں اور ہمارا رستہ صاف ہو جائے تاکہ ہم لوگ اپنی کھوج مکمل کر سکیں۔"

جم کارٹر نے سوال کیا۔ "بھلا جنگلی جانور مجھ سے کیونکر ڈریں گے؟ اور مان بھی لیا کہ شیر میری دہشت سے وہاں سے بھاگ بھی جائیں تو کیا اس میں خود کی سلامتی محسوس کر سکوں گا، یعنی آپ میری جان کے بدلے میں کتنی قیمت ادا کر سکتے ہو؟"

ڈیوڈ نے بریف کیس کھولا۔ "پانچ لاکھ امریکی ڈالر ایڈوانس اور باقی تین لاکھ امریکی ڈالر کام ہونے کے بعد۔"

اتنی بڑی رقم کا سن کر جم کارٹر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اس نے بریف کیس ڈیوڈ سے لیتے ہوئے کہا۔ "ڈیوڈ! میرے یار اتنی رقم کے لئے تو میں امریکہ کے صدر کو بھی مار سکتا ہوں، مان گیا میرے دوست! سونے کا کاروبار کرنے والے لوگ کتنے مال دار ہوتے ہیں، آج دیکھ بھی لیا، اس رقم سے تو میں زندگی کے باقی دن خوش حالی سے آرام سے گزار سکتا ہوں۔"

ڈیوڈ کو کامیابی مل چکی تھی۔ "تو پھر کام کے لئے تیار ہو؟" ڈیوڈ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے جم کارٹر اٹھا اور دیوار پر لگی بندوق اٹھائی اور اسے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں کل ہی کام پر جا رہا ہوں لیکن یاد رکھنا یہ میرا آخری کام ہوگا۔" ڈیوڈ مسکرایا اور کافی دیر تک دونوں گپ شپ لگاتے رہے۔

☆......☆......☆

جمی اور جان جنگل کے نوجوان شیر تھے، وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے، انسانوں کی طرح ان کی بھی دنیا تھی اور وہ بھی اپنی زبان میں ایک دوسرے کے ناموں سے پکارتے تھے، جم کارٹر کی وجہ سے جان کے بوڑھے باپ نے وہاں سے ہجرت کرنے کا پلان بنایا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ جم کارٹر کتنا ظالم شکاری تھا، بظاہر جان کو یہ فیصلہ کرنا پڑا لیکن دل ہی دل میں اس نے جم کارٹر سے اپنے قبیلے پر ڈھائے ہوئے ظلم کا بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔

وہ اپنے بوڑھے والد سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا جو کہ ہم انسان اکثر کرتے ہیں، خیر شیروں کا قبیلہ تیزی سے دوسرے جنگل میں ہجرت کرنے لگا، جم کارٹر جہاں ایک ماہر شکاری تھا وہاں اس میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ پرندوں کی زبان سمجھ لیتا تھا۔

ایک دن وہ ایک گھنے سیاہ دار درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ درخت کی ٹہنی پر دو طوطے آپس میں گفتگو کر رہے تھے، جم کارٹر نے اپنے کان ادھر لگائے۔

"یار مٹھو! آپ کو پتہ ہے اس درخت کے نیچے کون بیٹھا ہوا ہے؟"

دوسرا طوطا بولا۔ "ہوگا کوئی شکاری۔" پہلا طوطا بولا۔

"یہ کوئی عام شکاری نہیں ہے یہ جم کارٹر ہے...... جم کارٹر، میں جب چھوٹا تھا تبھی اسے شیروں کا شکار کرتے دیکھا تھا، بہت ظالم آدمی ہے، جانوروں کا دشمن ہے، برسوں بعد اسے دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس کے ڈر و خوف سے شیر اور جنگلی جانور بڑی تیزی سے ہجرت کر رہے ہیں، لیکن ایک کام کی بات بتاؤں...... جنگل کی ہوائیں بتا رہی ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ مہم جم کارٹر کی آخری مہم ثابت ہو سکتی ہے، جم کارٹر زیادہ دیر ان جنگلوں میں نہیں پھر سکتا، میں نے دیکھی ہیں ہزاروں جانوروں کی روحیں جنہیں جم کارٹر نے اپنی بندوق سے نشانہ بنایا تھا۔ وہ سب اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں، مجھے یہ بھی پتہ ہے اسے جانوروں کی زبان بھی سمجھ میں آتی ہے۔"

"تو سنو! جم کارٹر! بھاگ جاؤ یہاں سے اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔" اور یہ کہہ کر وہ دونوں طوطے اڑ گئے۔

مگر جم کارٹر اپنی جگہ پر بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے خود کلامی کی "بیوقوف طوطا! مجھے ڈراتا ہے جم کارٹر کو، ارے بیوقوف میں یہاں کسی جانور یا پرندے کو مارنے نہیں آیا ہوں، وہ ہرن کا شکار بھی پیٹ بھرنے کے لئے کرنا پڑتا ہے، پہلے بیوی چھوڑ گئی، پھر بچے، اور اب چرند پرند بھی جم کارٹر کے دشمن ہو گئے ہیں؟ لوگ پیسوں کی خاطر بے گناہ انسانوں کا خون کرتے ہیں؟ چوری، ڈاکہ، بدکاری، کرپشن، دھوکہ دہی، فریب، جھوٹ، ماں باپ کی نافرمانی تو نہیں کرتا جم کارٹر؟ اگر میری موت کسی جانور کے ہاتھوں لکھی ہے تو یہ میرے لئے خوش قسمتی کی بات ہوگی، میں انسانوں کے ہاتھوں مرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔"

جم کارٹر نے فرط جذبات سے بندوق اٹھائی اور دو چار ہوائی فائر کر ڈالے لیکن پھر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا، وہ پورا دن طوطوں کی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے جنگلی پھل کھائے اور آج وہ ہرن کا شکار بھی نہیں کر سکا، وہ اپنے کیمپ میں واپس لوٹ آیا۔ وہ آج بہت دکھی تھا۔ رات اندھیری ہو چکی تھی اس نے شمع دان روشن کی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

"یار جمی! اس نئے جنگل میں تو بالکل بھی مزہ نہیں آ رہا، نہ کوئی ڈھنگ کا شکار ملتا ہے اور نہ ہی رہنے کا غار، میرے خیال میں جم کارٹر اب جا چکا ہوگا؟" جمی شیر نے جواب دیا۔

"جان! کچھ دن صبر کرو، میں نے کچھ شیر جاسوسی کے لئے لگائے ہیں، جیسے ہی وہاں سے کوئی اطلاع ملے گی تو اگلا لائحہ عمل بعد میں سوچیں گے۔ کافی بھوک لگی ہے آؤ میرے ساتھ شکار پر چلتے ہیں۔"

وہ دونوں فی الحال بڑے شکار سے محروم تھے لیکن جان کا ذہن بہت تیز چلتا تھا، وہ ہر وقت جم کارٹر کو ٹھکانے لگانے کا سوچتا رہتا تھا، ان کے قبیلے کے 80 فیصد شیر یہاں ہجرت کر کے آ گئے تھے، باقی 20 فیصد شیر پرانے جنگل میں رہ گئے تھے۔ شاید وہ ایسا ہرا بھرا اور شکار کی کثرت والا جنگل چھوڑنا نہیں چاہتے تھے یا شاید انہیں جم کارٹر سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال دونوں دوست شکار کی تلاش میں نکل پڑے۔

☆......☆......☆

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جم کارٹر بندوق اٹھائے ایک سمت جا رہا تھا۔ آج معمول سے زیادہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادلوں کی گرج چمک نے تو جنگل کا ماحول مزید وحشت ناک بنا دیا تھا، الو اور ایک دوسرے پرندے کی ہر تھوڑی دیر بعد آنے والی آوازوں میں ایک انجانے خطرے کی بو آ رہی تھی، بھیڑیا بھی جنگل کی نکڑ پر زور زور سے چیخ رہا تھا، لگتا ہے کسی کو موت کی نوید سنا رہا ہو، لیکن ان چیزوں سے بے نیاز جم کارٹر اپنی ہی دھن میں آگے جا رہا تھا۔

اچانک سامنے والی جھاڑیوں میں سے ایک خون خوار دیو قامت شیر نمودار ہوا جس نے آتے ہی جم کارٹر پر حملہ کر دیا اور جم کارٹر زخمی ہو کر گر پڑا اور اس کی

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

موبائل کی بیل سے جم کارٹر جاگ پڑا۔ خوف ناک خواب کی وجہ سے وہ کافی حد تک پریشان ہوگیا تھا۔ ’’ہیلو ڈیوڈ میں جم کارٹر بول رہا ہوں۔ خیریت ہے؟ صبح سویرے ہی کال کی ہے؟‘‘

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ’’جم کارٹر! کام کی کیا صورتحال ہے؟ سناؤ ہمارا راستہ صاف ہے؟ اور وہ شیروں کا کیا بنا؟‘‘

جم کارٹر بولا۔ ’’ڈیوڈ! میں نے پہلے بھی بولا تھا کہ میں اپنے کام میں مداخلت ہرگز برداشت نہیں کرتا، آپ کا راستہ صاف ہے آپ کسی وقت بھی یہاں معائنے کے لئے آسکتے ہو، سارے جنگلی درندے مجھ سے ڈر کر دوسرے جنگلوں میں چلے گئے ہیں اب یہاں پر مکمل امن و امان ہے۔‘‘ جم کارٹر نے موبائل فون بند کردیا۔

وہ خواب کی وجہ سے بے چین تھا، اس نے بندوق تھامی اور یونہی جنگل کی طرف نکل پڑا، جنگل کے بڑے جانور جم کارٹر کی دہشت سے بھاگ چکے تھے جبکہ چھوٹے موٹے جانور وہاں گھومتے نظر آتے تھے، جم کارٹر نے جنگل کے شمالی حصے میں واقع پہاڑی سلسلے کا رخ کیا، اس نے ڈیوڈ کے بتائے ہوئے ایریا کا معائنہ کیا، مگر وہاں اسے سونے یا ہیروں کی کان نظر نہیں آئی۔

’’پہاڑوں سے سونا تلاش کرنا واقعی بہت محنت طلب کام ہے، پتا نہیں انہیں کتنی گہری کھدائی کرنی پڑے گی۔ اور یہ پتھریلی زمین! توبہ ہے...... جس کا کام اسی کو سوجھے۔‘‘

جم کارٹر پورا دن جنگلوں میں پھرتا رہا۔ وہ آج کافی مایوس تھا، اس کا سر درد کررہا تھا، اس نے جنگلی جڑی بوٹیوں سے بنا قہوہ بنایا اور پینے لگا۔ اس نے جھونپڑی نما ہٹ بنا رکھا تھا جہاں خود کو وہ Safe محسوس کررہا تھا۔ جبکہ رات گئے خونی درندے وہاں چکر لگانے رہتے تھے لیکن ان سب سے بے نیاز وہ اکیلا رہنے کا عادی تھا۔ اس لئے اسے کوئی دشواری پیش نہیں ہورہی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

ڈیوڈ کو دیئے ہوئے ٹائم کے مطابق آج اس کا آخری دن تھا، وہ کیمپ سے دور نکل آیا، وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا، ایک کوا دوسرے کوے سے کہہ رہا تھا۔ ’’یہاں کچھ ہونے والا ہے، جلدی یہاں سے اُڑ چلو۔‘‘

دونوں کوؤں کو اڑتا دیکھ کر جم کارٹر ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دو شیر (جان، جمی) اچانک جھاڑیوں میں سے نمودار ہوئے، اور اس سے پہلے کہ جم کارٹر اپنی بندوق تانتا، دونوں شیر اس پر جھپٹ پڑے، اس اچانک حملے سے وہ سنبھل نہیں پایا اور اس کا دایاں کندھا شدید زخمی ہوگیا جبکہ بندوق بھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی، جم کارٹر گر کر پھر اٹھا اور اپنا شکاری خنجر نکال کر دونوں کو للکارا۔

شیر اس کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے اور غصے سے دھاڑ رہے تھے۔ شیروں کی فلک شگاف دھاڑیں سن کر سارے چرند اور پرند دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔

دونوں شیروں نے جم کارٹر کو دبوچ لیا ادھر شیر اس پر پنجوں سے وار کررہے تھے۔ ادھر جم کارٹر کا شکاری خنجر ان کے جسم سے آر پار ہورہا تھا۔ ادھر شیروں کا وار آہستہ آہستہ کم پڑ رہا تھا۔ ادھر جم کارٹر کا خنجر ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اس طرح چشم زدن میں نظر آیا کہ جان اور جمی شیر اپنے قبیلے سے کھو گئے اور اس دن کے بعد کسی نے جم کارٹر کو نہیں دیکھا۔

سنا ہے کہ کیلی فورنیا کے جنگلات میں جو آگ لگتی ہے، وہ خود بخود نہیں لگتی، امریکہ جیسا ماڈرن ترقی یافتہ ملک بھی اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا کہ آگ کہاں سے لگتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے، لیکن مقامی لوگوں کا کہنا ہے ’’جس جگہ جم کارٹر اور شیروں کی لڑائی ہوئی تھی آگ وہاں سے لگتی ہے اور وہاں ہی پھیلاتی ہوئی جنگل کے کافی حصے تک پھیل جاتی ہے۔‘‘

خوفناک رات

ڈاکٹر رانا عامر شہزاد۔ ننکانہ صاحب

ویران و بیابان میدان میں نوجوان کی کئی حصوں میں بٹی ہوئی لاش پڑی تھی اور ایک شخص اس کے قریب بیٹھا تھا کہ اچانک نوجوان کے کٹے پھٹے جسم کے لوتھڑوں میں حرکت ہونے لگی پھر اس کے بعد......

دل کی دھڑکن کو تہہ و بالا کرتی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراؤنی کہانی

میں آج جو واقعہ سنانے جارہا ہوں وہ ہمارے خاندان کے ایک نہایت معزز اور قابل احترام بزرگ کے ساتھ پیش آیا بقول ان کے یہ واقعہ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے آئیں انہی کی زبانی سنیں۔

میرا نام منظور حسین ہے آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جب میں 20 سال کا نوجوان تھا تب میرے ساتھ حقیقت پر مبنی یہ خوف ناک ہیبت ناک اور پراسرار واقعہ پیش آیا، میں نے اپنی زندگی میں بے شمار چیزیں دیکھیں اور لاتعداد گھمبیر واقعات کا سامنا کیا ہے مگر اس واقعہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ان دنوں جب میں نے میٹرک پاس کیا ہی تھا کہ مجھے محکمہ ریلوے میں ملازمت مل گئی ویسے تو میں آرمی جوائن کرنا چاہتا تھا مگر میری خواہش پوری نہ ہوسکی لیکن پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے

سرکاری ملازمت سے نواز دیا۔

میری پوسٹنگ دور دراز علاقے میں ہوگئی جس ریلوے اسٹیشن پر میری ڈیوٹی لگی وہ بہت چھوٹا اور ملحقہ گاؤں سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا میرے علاوہ اسٹیشن پر کوئی دوسرا ملازم نہ تھا پہلے اسٹیشن ماسٹر حال ہی میں ریٹائرڈ ہوئے تھے اور ان کی جگہ عارضی طور پر آنے والا ملازم بھی چارج میرے حوالے کر کے رخصت ہوگیا۔

گاؤں سے کافی فاصلے پر موجود اس اسٹیشن پر میں اکیلا ہی رہتا تھا اسٹیشن کے ساتھ ہی ایک پرانی اور خوب صورت مسجد بنی ہوئی تھی۔ جہاں میں نماز پڑھ لیتا تھا۔

اکیلا ملازم ہونے کی وجہ سے چھٹی بھی کم ہی ملتی تھی اسی لئے چار چار مہینے گھر سے دور رہنا پڑتا تھا ان دنوں اس ریلوے ٹریک پر صرف تین گاڑیاں ہی چلتی تھیں اور تینوں ہی اسٹیشن پر اسٹاپ کرتی تھیں۔

اسٹیشن چھوٹا ہونے کی وجہ سے کوئی سگنل موجود نہ تھا بس اسٹیشن کی ایک جانب پھاٹک بند کرنا اور کھولنا پڑتا تھا حالانکہ اس بیابان سڑک سے شاذو نادر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا مگر پھر بھی ڈیوٹی لازم تھی ایک رات جب چاند مکمل جوبن پر تھا ہر طرف چاند کی چاندنی بکھری ہوئی تھی میں رات کے وقت آنے والی آخری گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ گزرے اور میں بھی آرام سے نیند کے مزے لوں۔

روزانہ رات گیارہ بجے آخری گاڑی اس ٹریک سے گزرتی تھی پھاٹک بند کرنے کے بعد میں اسٹیشن پر پہنچ گیا کہ شاید کسی مسافر نے ٹکٹ خریدنا ہو عام طور پر اس اسٹیشن پر آمد ورفت بہت کم ہوتی تھی کبھی تو ہفتوں یہ ریلوے اسٹیشن مسافروں کی آمد سے محروم رہتا تھا۔ اس رات سخت گرمی تھی حبس بھی زیادہ تھا اسٹیشن بجلی سے محروم تھا اس لئے میں پلیٹ فارم پر لالٹین ہاتھ میں تھامے گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی سیٹی بجاتے ہوئے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہی تھی مگر پھاٹک سے کچھ پیچھے ہی گاڑی رک گئی میں بہت پریشان ہوا کہ اللہ بہتر کرے آپ گاڑی وہاں کیوں رک گئی حالانکہ ہر چیز کلیئر تھی اور میں یہ سوچتے ہوئے فوراً گاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

وہاں پہنچتے ہی ایک وحشت ناک اور دلخراش منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا کوئی بدقسمت شخص گاڑی کے نیچے آ کر مر چکا تھا۔ جس کی دونوں ٹانگیں اس کے دھڑ سے الگ ہو چکی تھیں بازو اور سر بھی بری طرح چھلنی ہو چکے تھے اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا تمام مسافر گاڑی سے باہر نکل چکے تھے زیادہ تر لوگ اس واقعہ کو خودکشی قرار دے رہے تھے۔

اور بعض ڈرائیور کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ خوف ناک حادثہ کیسے رونما ہوا؟

تو وہ سہما ہوا بولا۔ ”جناب یہ شخص اچانک انجن کے سامنے آ گیا جس کی وجہ سے میں اسے بچانے میں بالکل ناکام رہا۔“ پھر لوگوں کی مدد سے ہم نے اس کی لاش کو اکٹھا کر کے پٹری سے تھوڑے فاصلے پر کسی مسافر سے کپڑا لے کر لٹا دیا میں اس تمام علاقے کے باشندوں کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا مگر یہ شخص اس علاقے کا نہیں تھا اور یہ امکان بھی خارج الامکان تھا کہ شاید یہ اس علاقے میں کسی کے گھر مہمان آیا ہو کیونکہ یہ ٹرین اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے نیچے آ کر لقمۂ اجل بن چکا تھا۔

مسافروں میں مرد بالعموم اور عورتیں بالخصوص بری طرح خوف زدہ ہو چکی تھیں اس لئے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل کر جانا چاہتے تھے اور ڈرائیور سے نکلنے کے لئے مسلسل اصرار کر رہے تھے اس وقت ٹرین میں پولیس کے دو اہلکار موجود تھے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ براہ مہربانی ایک پولیس والا مجھے دے دیں تاکہ ہم دونوں رات اس لاش کے پاس گزاریں پھر صبح کسی نہ کسی طرح اس کے ورثا تک خبر پہنچانے کی کوشش کریں گے مگر پولیس اہلکار نے رکنے سے صاف انکار کر دیا اور گارڈ نے بھی یہ کہہ کر اس کے انکار کو مزید تقویت پہنچائی کہ یہ ٹریک بہت لمبا ہے اس لئے خدانخواستہ کسی ناگوار واقعہ سے نمٹنے کے لئے انہیں بھی سیکورٹی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

لہٰذا دونوں پولیس اہلکاروں کا ہمارے ساتھ چلنا ضروری ہے میں نے بہت اصرار کیا کہ ریلوے اسٹیشن سے گاؤں بہت دور ہے اور میں رات کے اس پہر اس لاش کو اکیلا چھوڑ کر گاؤں سے کسی ساتھی کو بھی نہیں لا سکتا کم از کم مجھے اتنا موقع تو دیں کہ میں گاؤں سے کسی کو تو بلا لاؤں میری حالت دیکھ کر وہ جان چکے تھے کہ میں اندر سے بری طرح خوف زدہ ہو چکا ہوں مگر وہ بھی مجبور تھے انہوں نے مجھ سے فیصلہ کن مگر نرم لہجے سے کہا۔ ”محترم یہ ریلوے اسٹیشن آپ کے زیر سایہ ہے اس لئے اس واقعہ کے بعد لاش کا خیال رکھنے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے لہٰذا جب تک اس کے وارث یہاں پہنچ نہ جائیں اس کا کیا کرنا ہے یہ اب آپ کا معاملہ ہے۔“ اور پھر چند لمحوں میں ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

اور اب میں تنہا ہاتھ میں لالٹین پکڑے اس لاش کے قریب کھڑا تھا میرے کندھے پر ایک سفید کپڑا موجود تھا میں لالٹین ایک طرف رکھ کر اور کپڑا زمین پر بچھا کر اس پر بیٹھ گیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی چاند کی چاندنی میں ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی لاش کی موجودگی کی وجہ سے میں بہت خوف زدہ تھا گرمی ویسے بھی بہت تھی قرب وجوار میں کوئی آبادی بھی نہ تھی اور اس ویرانے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

میں ڈرا اور سہما ہوا لاش کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا آخر بیٹھ بیٹھ کر میں تھک گیا پھر دھیرے دھیرے میں لیٹ گیا مگر میں ہر حال میں جاگنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ ”اگر میت کے پاس بیٹھے سب لوگ سو جائیں تو میت کے مردہ جسم میں جنات وغیرہ داخل ہو جاتے ہیں۔“ف یہ باتیں سوچ سوچ کر میں بہت زیادہ ڈر چکا تھا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔

کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے جاگنے کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی نجانے میں کب نیند کی آغوش میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جانور کسی چیز کو کھا رہا ہے میں نے فوراً اٹھ کر لاش کی طرف دیکھا تو وہ بالکل صحیح حالت میں ویسی ہی پڑی تھی جیسے ہم نے رکھی تھی۔

میں نے اس کو خواب یا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹلا دیا مگر اندر سے میں بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس بار میں سختی سے جاگنے کی کوشش کرنے لگا اس وقت ہوا بھی بند ہو چکی تھی اور حبس بھی بڑھنے لگا چاند کی روشنی میں لاش کا ایک ایک انگ واضح نظر آ رہا تھا جسے دیکھ کر خوف کی ایک خطرناک لہر میرے پورے جسم سے گزر جاتی تھی۔

مگر مرتا کیا نہ کرتا کہ مطابق رات گزارنے کی کوشش کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کیوں میں نے اس اسٹیشن پر نوکری کی حامی بھری جہاں میرے سوا اور کوئی ملازم موجود نہیں شاید آدھی رات گزر چکی تھی اور بدقسمتی سے مجھے نیند نے پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے واضح محسوس ہوا کہ جیسے لاش کو کوئی چھیڑ رہا ہو میں نے لیٹے لیٹے ہی سوچا کہ شاید کوئی جانور لاش کو کھانے کی غرض سے چھیڑ رہا ہے اور میں فوراً اٹھ بیٹھا اور خلاف توقع وہاں کوئی جانور دور دور تک موجود نہ تھا البتہ لاش اپنی جگہ سے کافی سرک چکی تھی جسے دیکھ کر میں تقریباً اچھل پڑا اور خوف سے میرا پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا کیونکہ لاش کے ٹکڑے کو ہم نے اکٹھا کر کے رکھا تھا مگر اب اس کا دھڑ ٹانگوں سے کافی فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا اور خوف سے میرا برا حال ہونے لگا لاش کے اردگرد کسی جانور کے پاؤں کے نشانات بھی موجود نہ تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ کسی جانور وغیرہ نے لاش کو اپنی جگہ سے ہٹایا ہے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا اچانک لاش میں ہلکی سی جنبش ہوئی میں حیران و پریشان یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا

اوپر والا دھڑ ہلنے لگا جسے دیکھتے ہی میری جان جیسے لبوں تک آ گئی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں منجمد ہونے لگیں اچانک لاش کا اوپر والا دھڑ اٹھ کر بیٹھ گیا اف اللہ میرا اس وقت کیا حال ہوگا یقیناً آپ سمجھ سکتے ہیں ۔ہونٹ خشک، دماغ ماؤف جیسے پورا جسم بے جان ہوگیا ہو اس سے پہلے کہ کوئی اور ناگوار صورت سے میرا سامنا ہوتا میں نے اٹھ کر فوراً اسٹیشن کے ساتھ موجود مسجد کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔

میں بار بار مڑ کر لاش کی جانب بھی دیکھ رہا تھا مسجد کافی دور تھی مگر میں فوراً اور جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا اس لئے پوری قوت سے دوڑ رہا تھا ایک بار جب میں نے مڑ کر لاش کی جانب دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ لاش بغیر ٹانگوں کے میرے پیچھے ہوا میں بھاگ رہی تھی اس وقت میری حالت کیسی تھی یہ بتانے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

مسجد دور تھی اور اب میں دوڑ کر کسی صورت بھی مسجد تک پہنچ نہیں سکتا تھا کیونکہ لاش مجھے وہاں تک کبھی نہ پہنچنے دیتی اس لئے میں راستے میں موجود ایک چھوٹے سے کمرے میں گھس گیا جو کہ گاؤں والوں نے اپنی زمین پر بنایا تھا جہاں پر وہ صرف پانی وغیرہ فصلوں کو لگاتے وقت ہی ٹھہرتے تھے میں نے اندر سے دروازہ بند کردیا ابھی میں نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ وہ آدھے جسم پر مشتمل لاش دروازے پر پہنچ گئی اور دروازے پر ہاتھ مارنے لگی۔

میں پوری قوت سے دروازہ بند کئے کھڑا تھا مگر حیرت انگیز طور پر وہ دروازے پر صرف دستک دے رہا تھا اور زور وغیرہ نہیں لگا رہا تھا بس مسلسل ہاتھ سے دستک دے رہا تھا۔

شاید وہ اس شعور سے محروم تھا کہ دروازے کو قوت سے توڑ کر بھی وہ اندر داخل ہوسکتا ہے اس کی دونوں آنکھیں انتہائی سرخ تھیں جن کی وجہ سے کمرے میں روشنی آ رہی تھی یعنی اس کی سرخ آنکھوں سے سرخی مائل روشنی خارج ہو رہی تھی۔

دروازے میں موجود چھوٹے سوراخوں سے اس کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنی میرے جسم سے ٹکرا رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لوہے کی گرم سلاخیں میرے جسم سے ٹکرا رہی ہوں اور سوراخوں سے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی مجھے اندر سے نظر آ رہی تھیں وہ منہ سے کچھ واضح الفاظ کی مدد سے بول نہیں رہا تھا البتہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں مسلسل نکال رہا تھا جنہیں میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

اس کے مسلسل دستک دینے سے مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اسے اس بات کا شعور نہیں ہے کہ وہ قوت کے استعمال سے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوسکتا ہے۔

اسی لمحے میری نظر کمرے میں موجود ایک کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی تو میں فوراً بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے اسے بند کرنے کے لئے دوڑا ابھی میں کھڑکی بند کرنے ہی والا تھا کہ فوراً وہ لاش کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی مگر میں نے پوری طاقت اور زبردست قوت ارادی سے وہ کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا آدھا ہاتھ کھڑکی میں آ گیا جس نے میرے خوف میں اور بھی اضافہ کردیا۔

خوش قسمتی سے کھڑکی اور دروازے دونوں پر کنڈیاں لگی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اب مجھے دروازے کی طرف سے اطمینان تھا لیکن کھڑکی میں آنے والے منحوس ہاتھ کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔

میری تمام تر کوششوں کے باوجود بھی کھڑکی مکمل طور پر بند نہ ہوسکی پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے کھڑکی کو تھوڑا کھول کر بند کرنا چاہا جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ باہر نکل گیا اور میں نے کھڑکی مکمل طور پر بند کردی۔

کمرے میں موجود چارپائی اٹھا کر میں نے کھڑکی کے آگے رکھ دی تاکہ کھڑکی کھل نہ سکے اور میں پھر دروازے پر آ کر کھڑا ہوگیا پھر وہ لاش دروازے اور کھڑکی پر دستک دیتی رہی مگر اندر داخل ہونے سے قاصر رہی اور میں سوچنے لگا کہ لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں

کہ جنات کے پاس ہر طرح کی قوت ہوتی ہے وہ غائب ہوسکتے ہیں کوئی بھی روپ دھار سکتے ہیں لوگوں کے اجسام میں داخل ہوسکتے ہیں دیواروں اور مکانات وغیرہ سے بغیر کوئی رکاوٹ گزر سکتے ہیں مگر یہ کون سی مخلوق ہے جو مردہ جسم میں تو داخل ہوگئی مگر اس کمرے میں داخل ہونے سے قاصر ہے واقعی تمام باتوں کو جاننے والا صرف اللہ ہی ہے۔

پھر تھک ہار کر اس نے دستک کی بجائے دروازہ کھرچنا شروع کردیا لکڑی کا دروازہ ہونے کی وجہ سے جب وہ لاش اسے کھرچنے سے محروم رہی تو غصے سے پاگل ہوکر وہ کمرے کے چاروں اطراف زور زور سے ہاتھ مارنے لگی۔

کبھی دروازے اور کھڑکی سے زور سے ٹکراتی اور کبھی کمرے سے ٹکراتی اور اسے کھرچنے لگتی کمرہ پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے کھرچنے میں دشواری پیش آ رہی تھی مگر وہ ہر حال میں مجھ تک پہنچنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مکمل خاموشی چھا گئی جیسے ہر طرف ہو کا عالم ہو کمرے کے اندر حبس بہت زیادہ ہو چکا تھا گرمی کی شدت کی وجہ سے اندر ٹھہرنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا مجھے اپنی زندگی بہت پیاری تھی اور میں خوفناک چیز سے لڑ رہا تھا، میں اس بات پر حیران تھا کہ آخر وہ لاش کہاں چلی گئی اور اتنے اندھیرے میں بھی کمرے میں عجیب اور مدھم سی روشنی موجود تھی تقریباً آدھا گھنٹہ بالکل خاموشی رہی اور اب شدید گرمی اور حبس نے میرا برا حال کردیا تھا۔ بند کمرے میں مزید ٹھہرنا میرے لئے انتہائی دشوار ہو رہا تھا میں سوچ رہا تھا شاید وہ لاش میری طرف سے مایوس ہوکر کسی اور شکار کی تلاش میں نکل گئی ہو نیز یہ کہ اندر گرمی کی شدت سے مرنے سے بہتر ہے کہ میں باہر ہی نکل جاؤں۔

اور کسی طرح مسجد پہنچ جاؤں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں مسجد میں جا کر مکمل طور پر محفوظ ہو جاؤں گا پھر ہمت کر کے میں نے دروازہ کھولا باہر کوئی موجود نہ تھا اور میں کمرے سے نکل کر مسجد کی طرف دوڑنا ہی چاہتا تھا کہ میرے کندھے پر پیچھے سے کسی نے ہاتھ رکھ دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خوف سے میری رگوں میں خون جم گیا ہو جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی لاش میرے پیچھے کھڑی تھی اس نے فوراً ہی مجھ پر حملہ کردیا اور میں نیچے گر گیا جب وہ میرے اوپر گرا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی پہاڑ مجھ پر آن گرا ہو وہ غصے سے پاگل ہوکر مجھے فوراً ختم کردینا چاہتی تھی۔

مجھے موت بالکل میرے سامنے نظر آ رہی تھی اس لئے میں نے آخری بار اس سے بچنے کے لئے آخری کوشش کی اور پوری قوت سے اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا نجانے مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی اور میں نے بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے کمرے میں داخل ہوکر اندر سے اسے بند کردیا ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا کہ دروازے پر پھر سے "ٹھک ٹھک" ہونے لگی۔

میں سوچنے لگا جیسے آج میری آخری رات ہے اور میں رو رو کر اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ کسی طرح یہ منحوس اور خوفناک رات گزر جائے اور صبح کے اجالے میں زندگی بچنے کی شاید کوئی راہ مل جائے اور میں دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا میں کمرے میں موجود مدھم اور عجیب سی روشنی میں چاروں اطراف دیکھنے لگا کہ شاید

گناہ اور اعتراف

وہ لمحے بدترین ہوتے ہیں جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے لیکن وہ لمحات پرعظمت ہوتے ہیں۔ جب انسان اپنے گناہوں کو سامنے رکھ کر اپنے ضمیر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا ہے کہ "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، یہ گناہ میرے ہیں۔ اور میں نے تم پر ناپاک بوجھ ڈالا اور جب انسان اپنے ضمیر سے یہ کہتا ہے کہ یہ بوجھ میرا ہے۔ میں اسے اتار پھینکتا ہوں تو فرشتے بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

(علی دین محمد۔ کراچی ملیر سے)

کوئی لوہے کا ہتھیار، کلہاڑی وغیرہ مل جائیں جس سے کم از کم میں اپنا دفاع کرسکوں مگر کمرے میں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر دروازے پر ٹھک ٹھک ہونے لگی اور میں خوف سے کانپنے لگا دستک دینے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے عجیب و غریب اور خوف ناک آوازیں نکل رہی تھیں پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد مجھے چھت پر کسی کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں میں سمجھ گیا کہ اب لاش اندر آنے کی کوشش کرے گی۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا وہ تیزی سے پکی چھت کو کھرچنے لگی اور میں انتہائی بے بسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ جلد ہی چھت سے اندر داخل ہوجائے گی کیونکہ چھت دروازے اور اینٹوں کی طرح مضبوط نہ تھی رات کے اندھیرے میں اس کی چھت کھرچنے کی کوششیں واضح محسوس ہورہی تھیں۔

خوف سے میرا حلق خشک ہورہا تھا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مجھے اپنی موت اب یقینی نظر آرہی تھی کسی سیانے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جس پر گزرے وہی جانے میرا پورا جسم موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور لاش تیزی سے چھت کھرچنے میں لگی ہوئی تھی اب تو باقاعدہ اندر مٹی گرنا شروع ہوگئی تھی۔

ایک بار پھر میرے دل میں خیال آیا کہ اب اس کمرے میں تو میری موت یقینی ہے کیوں نہ یہاں سے نکل کر مسجد تک جانے کی آخری کوشش کروں یہ سوچتے ہوئے ابھی میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فوراً لاش دروازے کے سامنے آگئی۔ اور اپنی حرکات سے مجھے دروازے پر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگی اب کسی صورت وہ مجھ سے غافل نہ تھی وہ ہر حال میں مجھے ختم کرنا چاہتی تھی اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے اور موت کو انتہائی قریب دیکھ کر میں سجدہ میں گر کر اپنے رب سے توبہ کرنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ چھت کی مٹی نکال کر آسانی سے کمرے میں داخل ہوگئی اور فوراً ہی مجھ پر حملہ کردیا۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرے میں ایک عجیب سی روشنی پیدا ہوگئی اور اس کی آنکھوں کی روشنی نے کمرے میں انتہائی گرمی پیدا کردی اس کے حملے نے مجھے کافی حد تک زخمی کردیا جب تک انسان کی سانسیں مکمل طور پر بند نہ ہوجائیں تب تک وہ بچنے کی آخری حد تک کوششیں جاری رکھتا ہے چاہے موت بالکل سامنے ہی کیوں نہ کھڑی ہو۔

آخری بار میں نے اس سے بچنے کی خاطر اپنی پوری قوت سے اسے دھکا دے کر دور پھینکنے کی کامیاب کوشش کی اور وہ دیوار سے ٹکرا کر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا وہ میری پریشانی اور بے بسی شیطانی انداز میں قہقہے لگانے لگا جیسے مجھے کہہ رہا ہو کہ اب تم مجھ سے بچ نہیں سکتے اب تمہارا بھیانک انجام یقینی ہے۔

وہ بلند اور خوف ناک آوازوں میں قہقہے لگانے میں مصروف تھا کہ اسی لمحے میری نظر سامنے دیوار پر لگی خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی تصویر پر پڑی اور میں نے فوراً چھلانگ لگا کر وہ مبارک تصویر دیوار سے اتار کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی جانب کردی تو وہ نہایت غصے سے میری طرف لپکا لیکن میرے انتہائی قریب آکر وہ رک گیا جیسے کسی روحانی طاقت نے اسے زبردست قوت سے روک لیا ہو اس کے چہرے سے واضح محسوس ہورہا تھا کہ انتہائی کوشش اور طاقت کے باوجود بھی وہ مجھ تک پہنچنے سے قاصر تھا۔

پھر اچانک اس کے مختلف اعضاء اس کے دھڑ سے الگ ہونے لگے سر، دونوں بازو، کمر، گردن، ہونٹ، ناک، بال، انگلیاں وغیرہ بالکل الگ الگ ہوکر کمرے میں گھومنے لگے وہ اس عجیب اور خوف ناک ترکیب سے مجھے ڈرا کر پھنسانا چاہتا تھا کہ کسی طرح تصویر میرے ہاتھوں سے نکلے اور وہ میرا کام تمام کردے۔

مگر میں نے اپنے اعصاب پر مکمل قابو رکھا اور آنکھیں بند کرکے تصویر اس کی جانب کرکے بیٹھا کافی دیر وہ مختلف عجیب حرکات اور خوف ناک آوازوں سے مجھے ڈراتی رہی مگر میں ہرصورت تصویر اس

جانب کرکے بیٹھا رہا پھر اس کے اعضاء اکٹھے ہونے لگے اور آہستہ آہستہ اس کا دھڑ مکمل ہوگیا اور وہ لاش تھک ہار کر دروازے کے قریب لیٹ گئی اس کے چہرے سے شکست واضح محسوس ہورہی تھی تقریباً ایک گھنٹہ بعد اذان فجر کی آواز آنا شروع ہوگئی اور میں سخت حیران ہوا آج تک گاؤں سے اتنی دور اذان کی آواز نہیں آئی تو آج کیسے اور کہاں سے آرہی ہے۔

پھر یکدم اس لاش میں ہوا بھرنے لگی اور وہ پھولنے لگی پھر اس میں سے سرخ رنگ کا ایک ہیولہ سا نمودار ہوکر دروازے کے سوراخ سے باہر نکل گیا اور چند منٹوں بعد خود ہی دروازے کی کنڈی کھل گئی اور وہ لاش بھی دھواں بن کر کھلے دروازے سے باہر نکل گئی اور میں سجدہ ریز ہوکر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا جس نے آج مجھے یقینی موت سے بچالیا تھا۔

”بے شک اللہ ہر چیز اور ہر کام پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔“

کافی دیر ذکر الٰہی کے بعد میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اور نیند کی آغوش میں چلا گیا باہر دروازے پر دستک نے میری آنکھیں کھول دیں دروازے پر چچا سراج دین موجود تھے جو اس کمرے کے مالک تھے۔ اور اونچی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ”کون ہے اندر؟ خدا کے بندے دروازہ کھولو۔“

میں نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھول دیا اور چچا سراج دین پوچھنے لگے۔ ”آپ...... یہاں خیریت تو ہے؟“

پھر میں نے رات پیش آنے والا سارا واقعہ انہیں سنایا تو انہوں نے ماننے سے انکار کردیا میں نے ان سے کہا آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیئے جہاں لاش رکھی ہوئی ہے اور وہ کمرے میں داخل ہوئے بغیر ہی میرے ساتھ چل پڑے اور میں سوچنے لگا کہ جب لاش باہر نکلی تھی تب تو دروازہ خود ہی کھل گیا تھا پھر یہ بند کیسے ہوگیا۔

خیر لاش اپنی جگہ پر ہی موجود تھی جہاں ہم نے رکھی تھی چچا سراج دین بولے۔ ”اوئے اللہ بخشے پتہ نہیں کس ماں کا لعل (بچہ) تھا بے چارا کتنی بے درد اور خطرناک موت سے مرا۔“

پھر چچا سراج دین بولے۔ ”بیٹا یہ بات تو درست ہے کہ رات یہاں حادثے میں کسی کی موت ہوئی ہے مگر آپ کے ساتھ رات کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا بلکہ خوف کی وجہ سے اور نفسیاتی الجھن کی وجہ سے آپ ڈر کر اس کمرے میں جا گھسے ہوں گے بھلا مردہ کیسے زندہ ہوسکتا ہے۔“

ابھی صبح کی پہلی ٹرین آنے میں دو گھنٹے باقی تھے تھوڑی ہی دیر میں پورا گاؤں وہاں پہنچ چکا تھا سب اس کی شناخت کرنے میں ناکام رہے پھر دوپہر تک اس کے وارث بھی پہنچ گئے اصل میں رات والی ٹرین کا ڈرائیور ہر اسٹیشن پر اطلاع کردیتا تھا کہ فلاں اسٹیشن پر ایک شخص ٹرین کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا ہے جو اس گاؤں کا نہیں ہے اس طرح مرنے والے کی نشانیاں اور حلیہ بھی بتادیتا جس کی وجہ سے ورثا تک اطلاع پہنچ گئی اور دوپہر ڈھائی بجے والی ٹرین کے ذریعے وہ لاش لے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔

مگر گاؤں والے رات میرے ساتھ پیش آنے والے واقعہ سے انکار کررہے تھے پھر جب واپسی پر وہ میرے اصرار پر کمرے میں داخل ہوئے تو چھت اور دیواروں سے لگے خون کو دیکھ کر سب نے میری بات کی تصدیق کردی۔

تب میں نے سب سے کہا۔ ”غور کیجیے کہ صرف خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ کی تصویر نے مجھے انتہائی خطرناک اور یقینی موت سے بچالیا۔ لہٰذا ہمیں ہر حال میں نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔“

اس دن سے میں نماز پنجگانہ ادا کرتا ہوں۔ جب بھی مجھے وہ خوفناک رات یاد آتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

کرامات

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

اچانک درخت پر سے ایک زہریلا ناگ نیچے زمین پر گرا، اور چشم زدن میں وہ مزدور کو ڈس لیا کہ پھر اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے اور ان کی انگلی کا اشارہ پاتے ہی سانپ رفوچکر ہوگیا

دل و دماغ کو فرحت بخشتی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب...... حقیقت پر مبنی کہانی

کمالا اس غار میں کسی بدکے ہوئے بیل کی طرح گھستا چلا گیا اور دیوار کے ساتھ ہلکا سا ٹکرا کر گرنے کے انداز میں لیٹتا چلا گیا اس کی سانسیں کسی غضب ناک بیل ہی کی طرح چل رہی تھیں وہ کانپتے ہوئے زمین پر چت لیٹ گیا اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی گڑگڑا کر مانگنے لگا لیٹے لیٹے ہی اس کی نظر غار کے چھت کے ساتھ پھیلے ہوئے مکڑی کے جالے پر پڑی جس کے درمیان اور عین کمالے کے اوپر ایک کالے رنگ کی مکڑی اپنے تاروں پر قدم جمائے مضبوطی سے کھڑی شاید اسی کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک کمالے کی کمر میں ایک سرد سی لہر گھستی محسوس ہوئی کیونکہ وہ مکڑی آہستہ آہستہ اب بڑی ہونے لگی تھی، کمالا اس مکڑی کی طرف یک ٹک دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

پرانی بس اپنی اسپیڈ پر تارکول کی سڑک پہ چلی جارہی تھی اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا اسی لئے ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس آن کردی تھیں بس خراماں خراماں گھنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے گزر رہی تھی کہ اچانک تین آدمی درختوں سے کود کر اس بس کے سامنے آئے جیسے کہ درختوں نے انہیں اگل دیا ہو ان تینوں کے منہ پر ڈھاٹے اور ہاتھوں میں بندوقیں تھیں جو کہ انہوں نے بس کی طرف تان رکھی تھیں ڈرائیور نے بوکھلا کر بریک پوری قوت سے دبادی۔ بس ان کے عین سامنے جاکر رکی اور بس کے رکتے ہی ان تینوں میں سے ایک سامنے ہی کھڑا رہا جبکہ دو نقاب پوش تیزی سے بس کے اندر داخل ہوگئے بس میں سوار لوگ ابھی جاننے کی سوچ ہی رہے تھے کہ آگے ہوا کیا ہے ان نقاب پوش بندوق برداروں کو بس میں سوار ہوتے دیکھ کر کئی عورتوں اور چند مردوں کی منہ سے بھی چیخیں برآمد ہوئیں اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل ظاہر کرتے پہلے نقاب پوش کی کھرکھرتی آواز نے بس میں گھمبیر خاموشی طاری کردی۔

"چپ کرکے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو ورنہ اگلی بات میری بندوق بولے گی۔"

اس کے بعد کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ چوں چراں کرے۔

"چل بھئی ڈرائیور بس کو دائیں طرف کچے راستے میں موڑ لے۔" اس دفعہ سردار کا حکم ڈرائیور کے لئے تھا جس نے چپ چاپ بس کو درختوں کے جھنڈ کے اندر جاتے ہوئے کچے راستے پر چلا کر ڈال دیا۔ بس تھوڑا ہی اندر گئی تھی کہ ایک موڑ مڑتے ہی روڈ نظر آنا بند ہوگیا بس کے آگے چلتے نقاب پوش نے بس کو رکنے کا اشارہ کیا بس کے رکتے ہی تمام سواروں کو نیچے اترنے کا حکم ملا ڈرائیور سمیت

سب سوار نیچے اتر کر دو لائین بنا کر کھڑے ہوگئے ایک لائن مردوں کی اور دوسری لائن میں آٹھ دس عورتیں۔

"اب اگر آپ لوگ زندہ گھر جانا چاہتے ہیں تو چپ چاپ اپنا سب کچھ نکال کر اس چادر میں ڈالتے جاؤ۔" ایک نقاب پوش نے زمین پر سفید چادر بچھاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مردوں کی لائن کے پیچھے درختوں میں سے ایک سفید کپڑوں والے باریش بزرگ نکل کر لائن میں کھڑے ہوگئے ان تین نقاب پوشوں اور باقی کچھ آدمیوں نے ان کو لائن میں کھڑا ہوتا نہ دیکھ سکے جنہوں نے دیکھا وہ انہیں اپنے پاس دیکھ کر حیران ہوگئے کیونکہ وہ ان کے گاؤں جو کہ قریب ہی تھا گاؤں کی مسجد کے پیش امام تھے گاؤں کے چند لوگ ان کو دیکھ کر یہ سوچتے ہوئے حیران ہوئے کہ امام صاحب نے کیوں اپنی جان یہاں پھنسالی۔

نقاب پوش جب چادر بچھا کر پیچھے ہٹا تو امام کریم بخش صاحب نے للکارتے ہوئے کہا۔

"ان کھلونوں کو دکھا کر ہمیں ڈراتے ہو، ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے دیکھتے ہیں تم ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہو۔"

یہ بات سنتے ہی تینوں نقاب پوش اچھل پڑے۔ "او مولوی اس بندوق کی گولی یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے آگے کون ہے۔"

"ہاں ہاں مجھے پتہ ہے تم اپنی بندوق آزماؤ ہم اپنا سینہ آزماتے ہیں۔" امام صاحب نے نقاب پوش کی بات کاٹ کر سینہ تانتے ہوئے کہا۔

"مولوی نہ کر ضد...... نہ کر ضد......" نقاب پوش یہ کہتے ہوئے تذبذب کا شکار نظر آرہا تھا لیکن امام صاحب سینہ تانے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ نقاب پوش نے جھجکتے ہوئے بندوق ان کے سینے کی طرف کی اور ٹریگر دبادیا۔

وہاں موجود سب لوگوں نے آنکھیں بند کرلیں لیکن ٹریگر دبانے کے بعد دھماکہ کی بجائے ٹرچ کی آواز سنائی دی جسے سنتے ہی سب لوگوں نے آنکھیں کھول دیں مولوی صاحب سینہ تانے نقاب پوش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے ان کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کہ کوئی ورد کررہے ہوں۔

نقاب پوش نے دیکھا کہ جب فائر نہ ہوا تو بھاگ کر دوسرے ساتھی سے بندوق لے کر فائر کرنے کی کوشش کی لیکن اس بندوق سے بھی ٹرچ کی آواز آئی تو اس نے دوسری اور تیسری بار کوشش کی لیکن نتیجہ وہی نکلا نقاب پوش نے بھاگ کر تیسرے ساتھی سے بندوق لی لیکن اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

بس کی سواریاں جو کہ پہلے ڈری سہمی تھی اب انہیں

اس واقعہ پر دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

"بس یہ ہی تھے تمہارے کھلونے.....اب میں بھی کچھ دکھاتا ہوں۔" پیش امام نے طنزیہ لہجے میں کہا اور منہ میں کچھ بدبدانے لگے۔ اب ایسا حیران کن منظر تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں پیش امام صاحب کا کچھ پڑھ کر پھونکنا تھا کہ تینوں نقاب پوش اپنی بندوقوں سے ایک دوسرے کو پیٹنے لگے ان کی چیخیں اور شور ماحول کو چیرے دے رہا تھا لوگ حیران تھے کہ اچانک انہیں کیا ہوگیا۔

جب وہ ایک دوسرے کو پیٹ کر تھکے تو پیش امام صاحب نے کچھ منہ ہی منہ میں پڑھا اور ان کی طرف اشارہ کیا تو وہ تینوں ایک دوسرے کو چھوڑ کے نڈھال سے پیش امام صاحب کی طرف بھاگے اور ان کے پیروں میں گر گئے۔

اب تینوں کی آہ وبکا دل دہلا رہی تھی وہ معافیاں مانگ رہے تھے۔

"میں کون ہوتا ہوں تمہیں معاف کرنے والا معافی اوپر والے سے مانگو اور پھر ایسے غلط کاموں سے توبہ کرو دور رہنا۔"

اس کے بعد وہ تینوں نقاب پوش روتے گڑگڑاتے وہاں سے چلے گئے۔

لوگوں نے ان کے جاتے ہی پیش امام صاحب کے گرد گھیرا ڈال لیا اور ہر کوئی ان کا ہاتھ تھام کر چومنا چاہتا تھا جو چومتا جاتا وہ بس میں سوار ہوتا جاتا، جب سب بس میں سوار ہوگئے تو انہوں نے باہر دیکھا تا کہ پیش امام صاحب کا آخری دیدار کرسکیں لیکن پیش امام صاحب تو وہاں موجود نہ تھے تب نزدیک گاؤں کے لوگوں نے یہ بات فخر سے بتائی کہ "وہ ہمارے گاؤں کے پیش امام ہیں۔"

پیش امام صاحب کے گاؤں کے لوگ جنہوں نے ان کی کرامت دیکھی تھی وہ بہت ہی خوش تھے وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے امام واقعی کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں وہ جب واپس گاؤں پہنچے تو رات کافی ہوچکی تھی سب گاؤں والے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے لیکن امام صاحب کی کرامات دیکھنے والوں نے پیٹ لوگوں کو بتانے لگے پیچھے جارہے تھے اور پھر صبح نماز کے بعد پورے گاؤں میں یہ بات پھیل چکی تھی لیکن سننے والے حیران وپریشان ہوگئے کیونکہ جس وقت کا یہ واقعہ تھا اس وقت پیش امام صاحب عشاء کی نماز کے بعد درس دے رہے تھے۔

"ہاں ایک بات ہے درس دیتے دیتے اچانک امام صاحب خاموش ہوگئے تھے اور ہمیں ذکر کرتے رہنے کا کہہ کر اپنے حجرہ میں چلے گئے تھے لیکن حجرہ میں وہ دس پندرہ منٹ رہے ہوں گے پھر واپس آکر درس دینے لگے۔"

بابا منظور جوکہ امام صاحب کے درس میں شامل تھا اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔

"بس تو پھر وہاں بھی تقریباً دس پندرہ منٹ ہی لگے تھے کہ ڈاکوؤں نے بس روک کر ہم سب کو اتارا اور پھر امام صاحب پہنچ گئے اور انہوں نے ڈاکوؤں کی خوب درگت بنائی۔" ایک بس کی سواری نے کہا تو پورا گاؤں اس بات پر یقین لے آیا کہ واقعی امام صاحب کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جو منٹوں میں درس سے وہاں پہنچے اور ڈاکوؤں کو سبق سکھا کر واپس آکر درس دینے لگے۔

یہ سب باتیں پیش امام صاحب تک بھی پہنچ رہی تھیں جنہیں سن کر ان کے چہرے پر مسکان سی کھلنے لگتی تھی انہوں نے ان لوگوں پر بہت محنت کی تھی تب جاکر یہ لوگ ان کے آہستہ آہستہ گرویدہ ہورہے تھے اس واقعہ کے بعد اس بس کا ڈرائیور اور بہت سی سواریاں وقتاً فوقتاً امام صاحب کے پاس بیعت کرنے آتے رہے اس گاؤں کے علاوہ ان کی شہرت ساتھ کے کئی گاؤں دیہات تک پہنچی وہ لوگ بھی امام صاحب کے معتقد ہونے لگے اب جمعہ کے دن ایک بڑا اجتماع ہونے لگا جس میں امام صاحب ایک بھرپور بیان کرتے اور عشاء کے بعد ان کا درس ہوتا۔

اس علاقے کا چوہدری یاور جوکہ لوگوں کے لئے ان داتا بنا ہوا تھا وہ امام صاحب کی شہرت سے بڑا پریشان تھا کیونکہ لوگ پہلے اس کے بے دام غلام تھے لیکن امام صاحب کے علم سے بھرپور درس نے ان لوگوں کی سوچ آہستہ آہستہ بدلنی شروع کردی اور یہ ہی بات چوہدری

کو ناگوار گزر رہی تھی اب اس سے دبنے والے چند گنتی کے لوگ رہ گئے تھے۔

چوہدری یاور بوڑھا ہوچکا تھا اس کا کوئی بیٹا بھی نہ تھا لیکن اس کی حرص وہوس پہلے ہی جیسی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا رعب ودبدبہ اسی طرح ان ان پڑھ دیہاتیوں پر جمع رہے جبکہ امام صاحب گاؤں کے لوگوں کو نئی آگاہی ایک شعور دے رہا تھا بہت سے لوگ اب امام صاحب کے معتقد ہوگئے تھے انہیں اتنا ماننے لگے تھے کہ جیسے وہ کوئی پیر ہوں اس لئے چوہدری ان کے خلاف کھل کر اب کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

ایک شام چوہدری یاور اپنے کمرہ میں بیٹھا پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ اس کا ملازم خاص کمالا اندر داخل ہوا اور جھک کر سلام کرتے ہوئے چوہدری کے قدموں میں بیٹھ کر گھٹنے دبانے لگا۔

"کمالے یہ گاؤں میں کیا ہورہا ہے؟"

"کیا ہورہا ہے مائی باپ۔" کمالے نے گھٹنے زور سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ پیش امام کریم بخش کے بارے میں لوگ کیا کہتے پھر رہے ہیں۔" اس دفعہ چوہدری نے غصہ سے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"مائی باپ اگر آپ غصہ نہ کریں تو میں ایک بات بتاؤں۔" کمالے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کمالے بات کیا کرتے لے نہ پایا کر۔" چوہدری نے کمالے کو ایک لات رسید کرتے ہوئے کہا تو کمالا لڑھک کر پیچھے صوفے سے جا ٹکرایا اور پھر کھسکا سا ہوکر آگے آکر چوہدری کے گھٹنے پکڑ لئے۔

"چوہدری صاحب دو دن پہلے کی بات ہے ہم کھیتوں میں کام کررہے تھے میں سب مزدوروں کے آگے پیچھے ان کا کام دیکھتا پھر رہا تھا کہ اچانک درختوں کے جھنڈ میں سے ایک بہت بڑا سانپ رینگتا ہوا نکلا دو مزدور اس کی پھنکار سنتے ہی اسے مارنے کے لئے لپکے تو وہ سانپ دم کے بل پر کھڑا ہوگیا وہ تو لمبائی میں ہم سب آدمیوں سے زیادہ تھا اسے مارنے کے لئے لپکنے والے مزدور ڈر کر پیچھے ہٹے اور ہم سب کو تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے پھر......"

"پھر کیا ہوا جلدی بتا۔" چوہدری نے کمالے کو پاؤں سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

تو جھٹ کمالا بول پڑا۔" چوہدری صاحب پھر وہاں امام صاحب آگئے......" انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور سانپ کو واپس درختوں کی طرف جانے کا اشارہ کیا، ہم سب حیران رہ گئے سانپ نے امام صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا دیا اور چپ چاپ رینگتے ہوئے جن درختوں سے نکلا تھا ان میں گھس گیا۔"

"تم نے مجھے کل کیوں نہیں یہ بات بتائی۔" چوہدری یہ ساری بات سن کر آہستہ سے بولا وہ کسی گہری سوچ میں کھو سا گیا تھا۔

"چوہدری صاحب میں آپ کو بتانے سے ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ میں بھی امام کریم بخش کی تعریف کررہا ہوں۔" کمالے نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

لیکن چوہدری تو کسی گہری سوچ میں تھا اس نے کمالے کو جانے کا اشارہ کیا اور کمالا سر کو جھکا کر باہر کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد وہ جتنی دفعہ بھی چوہدری کی حویلی میں گیا چوہدری اسے نہ ملا کمالے کو ایسا لگا کہ چوہدری گوشہ نشین ہوگیا ہے اب تو چوہدری کسی کو بھی نظر نہیں آتا تھا کمالے کو چوہدری کے ٹھاٹ باٹھ یاد آتے تو وہ تلملا جاتا۔

آخر کمالا......امام کریم بخش کے راز کے بارے میں جاننے کے لئے ان کی ٹوہ میں رہنے لگا اور پھر ایک دن جمعرات کو اسے موقع مل گیا جب امام کریم بخش صبح کی نماز پڑھ کر ویرانے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑے تو کمالے نے ان کا پیچھا شروع کردیا۔

امام صاحب اپنی چال میں ذکر کرتے آگے بڑھتے جارہے تھے گاؤں اور کھیتوں سے کافی دور نکل آنے کے بعد کچھ درختوں کے اندر ایک مکان نظر آنے لگا امام صاحب دروازہ کھول کر اس مکان میں داخل ہوگئے کمالا ایک درخت کے پیچھے چھپ کر مکان کی طرف دیکھنے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے کیا مکان کے دروازہ میں سے نظر آنے والے سوراخوں میں سے یا پھر کھڑکی

میں سے اندر کی سن گن لینی چاہئے کہ اندر اور کون ہے اور امام صاحب اس کے پاس کیا کرنے آئے ہیں۔

سورج کی پہلی کرنیں ان درختوں پر پڑنے لگیں تو کمالے کو ایسا لگا کہ اس کے عین پیچھے کوئی کھڑا ہو اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے دیکھ کر اس کے تو جیسے اوسان خطا ہوگئے امام صاحب سفید کپڑوں میں ملبوس جلالی انداز سے اسے گھور رہے تھے اور اوپر سے ان کی جلالی آواز ''کیا کرنے آئے ہو تم یہاں..... کیا دیکھ رہے ہو۔''

جسے سن کر رہی سہی کسر بھی کمالا کی نکل گئی اور کمالے نے ایک طرف دوڑ لگا دی جتنی تیز وہ دوڑ رہا تھا شاید ہی زندگی میں اس سے پہلے اتنا تیز دوڑا ہو دوڑتے دوڑتے اسے ایک ٹھوکر لگی وہ ہوا میں اڑ کر درخت کے نیچے جا گرا پھر جلدی سے اٹھ کر اس نے اپنے سامنے دیکھا تو امام صاحب کو اپنے سر پر کھڑے پایا۔

اب کمالے کو اور کچھ نہ سوجا اس نے بھاگنے کے بجائے امام صاحب کے پاؤں پکڑ لئے تو امام صاحب نے اس کے ہاتھ پرے کئے لیکن وہ رو رو کر معافی مانگنے لگا ساتھ ہی وہ امام صاحب کے پاؤں چھوڑ کر سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگا اور روتے روتے اس کی نظر سامنے گئی تو امام صاحب وہاں نہیں تھے کمالے کی تو سانس بند ہونے لگی اس دفعہ وہ بھاگا تو سیدھا ایک غار میں جا گھسا۔

امام صاحب سانس چڑھے اس مکان میں داخل ہوئے اور اونچی آواز سے بولے۔ ''آج کمالے نے خوب تھکایا۔''

''جی بھائی آج واقعی بہت تھک گئے ہیں۔'' امام صاحب کے پیچھے چند قدم پر امام صاحب کے ہمشکل بھائی دروازہ میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

دونوں کی صورتیں قد کاٹھ حتیٰ کہ داڑھی بھی سیم تھی دونوں ساتھ کھڑے ہوتے تو پہچان مشکل تھی کہ امام صاحب کریم بخش کون ہیں اور مولوی نعیم بخش دونوں ہی آگے پیچھے چلتے ہوئے چارپائی پر جا بیٹھے۔

''اب ہمارا کام اسی فیصد تک مکمل ہوگیا ہے بس 20 فیصد چوہدری اور اس جیسے اکڑ دماغ والوں کو بھی راہ راست پر لانا رہ گیا ہے..... بس مجھے تو ان پڑھ اور سادے لوگوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔''

''جی بھائی لیکن ہمارا یہ اقدام ایک نیکی کی طرف ہے ان پڑھ لوگوں کو شعور دلانا انہیں ان چوہدری جیسے فرعون ذہنیت کی غلامی سے نجات دلانا، اور ان کو حق پر چلنا..... کہ دنیا ترقی کرتے ہوئے کہاں سے پہنچ گئی اور ہمارے دیہاتوں میں ابھی تک غلامی کی زندگی گزاری جارہی ہے آخر ان لوگوں کو بھی تو پڑھنے کا حق ہے اور ان لوگوں کو بھی تو زندگی و دین کی سمجھ آنی چاہئے۔'' دونوں مولوی بھائی آپس میں باتیں کرنے لگے جو کہ سب باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔

''مجھے یقین ہے کہ اب ہمیں اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

☆......☆......☆

ادھر کمالے کو ہوش آیا تو وہ اسی غار میں چت پڑا تھا اوپر وہی مکڑی کا جالا تھا لیکن اسے مکڑی نظر نہ آئی اس نے پورے غار میں نظر گھمائی تو مکڑی ایک کونے پر اپنی چھوٹی سی جسامت میں تھی کمالے کو کچھ حوصلہ ملا اور وہ اس غار سے آہستہ آہستہ نکل آیا راستے میں چوہدری یاور کی زمینوں پر لگے ٹیوب سے نکلتے ہوئے تازہ پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور پانی پی کر اپنی خوب پیاس بجھانے کے بعد وہ چوہدری یاور کی حویلی کی طرف چل پڑا تاکہ اسے امام کریم بخش کی ایک اور کرامت کے بارے میں بتا سکے۔ امام کریم بخش اس کے سامنے مکان میں داخل ہوگئے تھے لیکن باہر اسے ڈرانے کے لئے بھی موجود تھے کمالا اس بات پر حیران اور ڈرا ہوا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ امام صاحب واقعی اللہ کے نیک بزرگ ہیں۔ اور پھر کمالے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ پیش امام صاحب حقیقت میں اللہ کے نیک بندے ہیں جو مظلوموں کی مدد کرتے ہیں..... لوگوں کو راہ راست پر چلنے اور احکام خداوندی پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر ملک سدوز انہ درس دیتے ہیں۔

☠



شیدے کی کرامت

مہر پرویز احمد دولو۔ میاں چنوں

دیکھتے ہی دیکھتے دربدر پھرنے والا نوجوان لوگوں کی نظروں کا مرکز بن گیا کیونکہ اس نوجوان نے وہ گر معلوم کرلیا تھا جس سے لوگ بے وقوف بننے لگے تھے اور نوجوان پر دولت کی دیوی مہربان ہوگئی۔

دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی خودغرضی اور مطلب پرستی کی ناقابل فراموش عبرتناک کہانی

خالہ نذیراں کے بیٹے شیدے کی کرامات کے چرچے دور پار کے علاقوں میں یوں پہنچے ہوئے تھے جیسے نامی گرامی چوروں اچکوں اور ڈاکوؤں کی شہرت ایک گاؤں سے لے کر دور دور کے گاؤں تک یا کسی بجلی کا میٹر چیک کرنے والے میٹر ریڈر کی شہرت پورے ایریا میں پھیلی ہوئی ہے یا عوامی نمائندے کی شہرت جو الیکشن کے دوران ووٹ نہ دینے والوں کو اقتدار میں آتے ہی نشان عبرت بنا دیتا ہے۔

شیدے کے قدموں کی دھول کی شفایابی سے آج تک کوئی بھی مرید، مریدنی اور عقیدت مند ناکام نہیں لوٹا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ اس کے عقیدت مند اکثر علاقے کے لیے لفنگے لڑکے لڑکیوں پر مشتمل تھے۔ جن کو آپس میں ملنے کے لئے سو پاپڑ بیلنے پڑتے تھے،

مگر شیدے کی کرامات کے طفیل دکھی دلوں کا ملنا بہت آسان ہوگیا تھا۔

وہ لوگ شیدے کے در پردم درود کروانے کے بہانے آتے، اسی دوران دورافق پر چاند کے غروب ہونے پر ریت کے ٹیلوں، کپاس کی فصل اور گنے کے کھیت میں ظالم سماج سے چھپ کر ملنے کے وعدے کئے جاتے، شہر کے بدنام ہوٹلوں میں کھانے کے دعوت نامے دیئے جاتے۔

پیار کی کانٹوں بھری پگڈنڈی کو پھولوں سے آراستہ کرنے کے لئے شیدے سے ملنے کا بہانہ بنایا جاتا اس کار خیر میں نذرونیاز کے بدلے شیدا بھی نمایاں کردار ادا کرتا۔

اس کا طریقہ واردات بڑا عجیب تھا۔

☆......☆......☆

ماں باپ نے اپنی بھرپور کوشش کرکے شیدے کو اسکول میں داخل کروایا، لیکن اس کی آزاد منش طبیعت کو اسکول کی پابندیاں راس نہ آئیں۔ سو اس نے بغاوت کرکے اوباش نوجوانوں کا سرغنہ بن کر وارداتیں کرنے لگا، اس دوران دیگر جرائم پیشہ افراد سے تعلق بڑھنے لگا ایک موقع پر چوری کرتے پکڑا گیا۔

پہلے تو لوگوں نے مارپیٹ کرکے خوب دل کی بھڑاس نکالی، پھر پولیس کے حوالے کردیا۔ پولیس کی چھترول سے نانی دادی اور دیگر تمام مرحوم اسے یوں یاد آنے لگے جیسے پانچ سال بعد سیاستدانوں کو غریب مجبور عوام اور ان کے تعلیم، صحت، بے روزگاری اور بے انصافی کے تلخ حقائق یاد آتے ہیں۔

اس چھترول کے دوران اس کے جرائم پیشہ ساتھی ابر رحمت کی مانند مئی جون کی شدید گرمی کے دوران برسنے والی باران رحمت کی طرح سودمند ثابت ہوئے۔

عوام کو تحفظ اور ظلم وستم سے نجات دلانے والی پولیس سے لے کر یوں رفو چکر ہوئے جیسے ہنگامے کے دوران عوامی نمائندے گاڑیاں بھگا کر لے جاتے ہیں۔

ان مہربانوں نے اسے ایک ایسی جیکٹ لے کر دی جو پہننے پر جسم کا حصہ معلوم ہوتی اس پر زخموں، خارش کے داغ دھبے اور آگ سے جلے جسم پر پھپھولے کی مانند بہت سے عجیب وغریب نشانات تھے اس کے نیچے مخصوص جیبیں تھیں جن میں ہیروئن، چرس اور افیون کی پڑیاں ہوتی تھیں۔

اس کو معذوروں والی ریڑھی پر بیٹھا کر بازار کی نکڑ پر بیٹھا دیا جاتا لوگ ترس کھا کر اسے خیرات دیتے ساتھ ہی نشئی حضرات اس سے نشہ آور ادویات خریدنے لگے۔

ایک دفعہ ایک نشئی کو ادھار نہ دینے پر اس کی پولیس کو مخبری کردی گئی پھر کیا تھا بیچ بازار اس کی نقلی کھال یوں اتاری گئی جس طرح ذبح کئے گئے بکرے کی کھال قصائی اتارتا ہے، یا ناجائز منافع خور، غریب عوام کی کھال اتارتے ہیں۔

یا کوئی شرارتی فرد ایک اچھے آدمی کے ہر کام میں بال کی کھال اتارتا ہے کھال اترنے کی دیر تھی کی عوام اور پولیس اس پر یوں ٹوٹ پڑی جس طرح اللہ واسطہ کی دیگ کے چاولوں پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں یا سیلاب کے دوران امدادی سامان کے ٹرک پر سیلاب میں ڈوبے لوگوں کی بجائے بچ جانے والے علاقے کے مردوزن ٹوٹ پڑتے ہیں۔

بے تحاشہ مار پڑنے پر وہ یوں بے ہوش ہوکر گرا جیسے بجلی کا جھٹکا لگنے سے کوئی فرد گرتا ہے۔

ایک بار پھر وہی یار بیلی زخم پر لگنے والے ڈیٹول اور اسپرٹ کی مانند سکھ کا باعث بنے پولیس اور لوگوں سے فراغت پاتے ہی اب تو اس کا دل ان جرائم بھرے کاموں سے اکتا گیا مگر کوئی ہنر بھی تو نہیں جانتا تھا، گھر والے کب کے ہمیشہ کے لئے در بند کرچکے تھے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری تھا۔

اردگرد کے علاقے کے لوگوں اور حالات وواقعات پر نظر ڈالی تو اس کو مشعل راہ جلتی نظر آگئی۔

اس نے ایک ایسے شخص کو آئیڈیل بنا کر زندگی کا باقی سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا جو کسی دور میں گاؤں کے چوراہے پر لکڑی کے کھوکھے میں سائیکلوں کو پنچر لگاتا تھا لڑکیوں کو چھیڑنے پر کئی بار اسے مار کھانا پڑی، لوگوں نے

پیٹرول چھڑک کھوکھے کو آگ لگادی تھی بے روزگاری سے تنگ آکر اس نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کردیا اور آج کل وہ علاقے کی پہنچی ہوئی سرکار تھا۔

دور دور سے مردوزن اس کی زیارت کو آتے تھے، جس لڑکی کی وجہ سے اسے مار پڑی تھی اور کھوکھا جلایا گیا وہ اور اس کا پورا خاندان اس کے خاص مریدین میں شامل تھا اور اس کی شہرت کا طوطی دور دور تک پھیلانے میں اسی خاندان نے نمایاں کردار ادا کیا تھا ایک بابا جی کے پہلے اور اب کے حالات دیکھ کر اس نے بھی "بابا" بننے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆......☆

ننگ دھڑنگ گاؤں کے چوک میں بیٹھ جاتا، جب کوئی گستاخ اس کی سابقہ کارروائیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لعن طعن اور نفرت کرتے گزرتا تو اس کا ننگا جسم کڑاہی میں مکئی کے "پھلے" کی طرح لال ہوکر پھولنے لگتا، آنکھیں جو پہلے ہی کیکر کے بیج کی مانند تھیں لال بھبوکا ہوکر کالے تل کی طرح ہوجاتیں۔ ڈبل روٹی کی مانند چہرہ سوج جاتا، اونٹ کی طرح منہ سے جھاگ بہنے لگتی کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورتا۔

لیکن جب کوئی عقیدت مند یا مندنی دور سے اسی سالہ بوڑھے بابے کی طرح کبڑا ہوکر جھکتا، ایک ہاتھ ماتھے پر اور دوسرا سینے پر دھرے آتا اور آتے ہی پاؤں کو یوں چمٹ جاتا جیسے چیچل مردہ جانور کو، بجلی زندہ انسان کو، غربت مجبور، بے روزگاری انسان کو، پولیس رشوت نہ دینے والے ملزم کو چمٹ جاتی ہے تو اس وقت شیدے کی رعونت فخر وغرور دیکھنے کے قابل ہوتی وہ اس وقت سانپ کی طرح بل کھاتے اور بغیر پانی کے تڑپنے والی مچھلی کی طرح بے قرار مرید سے صرف جھوٹی موٹی شان وشوکت اور کرامت دکھانے کے لئے یوں منہ موڑ لیتا، جیسے الیکشن کے بعد سیاستدان عوام سے، بوڑھے والدین سے آج کل کے بیوی کے اشاروں پر ناچنے والے نوجوان بیٹے، غریبوں سے روزی اور موت، شریف آدمی سے عزت ووقار یہ سب کچھ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لئے کرتا۔ باباجی کی بے اعتنائی پر مرید یوں تڑپتا جیسے میلے کچیلے ڈرم میں بغیر تکبیر پڑھے گردن کٹی مرغی، دوائی نہ ملنے سے غریب مجبور مریض اور نشے والا ٹیکہ نہ لگنے سے نشئی۔

آخرکار اپنی بھرپور کوشش اور عقیدت سے مرید نذرانے کی مد میں روپے خدمت میں پیش کرکے نظر التفات پانے میں کامیاب ہوجاتا۔

عاشق مزاج نوجوان محبوبہ کے آنے تک بلاوجہ شیدے کو کبھی پاؤں دبا کر اور کبھی سر میں سرسوں کے تیل کی مالش کرکے اظہار عقیدت کرتے، کبھی منہ مانگے نذرانے کا لالچ دے کر ترساتے۔

محبوبہ کے قدم رنجہ فرماتے ہی پکے ہوئے آم کی طرح باباجی کے پاؤں میں گرجاتے اور پھر محبوبہ پر رعب ودبدبہ ڈالنے کے لئے ریزگاری کی صورت میں تھیلیاں باباجی کے حضور پیش کرتے اور منزل پانے کے حقدار گردانے جاتے۔

شیدے کی شہرت کو بدنام زمانہ لوگوں کے حلقے میں اس وقت شہرت ملی جب اس کی وجہ سے ایک مریدنی چھ بچوں کو چھوڑ کر محبوب کے ساتھ بھاگ گئی۔

دو دلوں کے ملنے کی خبر آگ کے شعلوں کی مانند معاشرے کے جنگل میں پھیل گئی لوگ جوق در جوق منزل پانے کے لئے حاضری کا شرف حاصل کرنے لگے چوراہے کی جگہ ہر وقت مریدوں کے مجمعے کی وجہ سے کم پڑنے لگی۔ ایک مرید کو یوں منزل ملی کی باباجی نے ہشاش بشاش گھر آباد لڑکی کو صرف نذرانے کے لئے خاوند کے خلاف اکسانا شروع کیا، جب وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو شادی سے قبل چاہنے والے سے ملاقاتیں کروانا شروع کردیں اور بلا آخر عورت نے خلع لے کر پرانے آشنا سے بغیر عدت کے دن پورے کئے شادی کرلی۔

اس کی کرامت کے صلے میں باباجی کو گاؤں سے باہر دو کنال رقبہ اس مرید نے بطور نذرانہ پیش کیا۔ جہاں باباجی کا آستانہ تعمیر کیا گیا پانی کا نل واش روم بنوائے گئے ساتھ ہی ٹھنڈے پانی کے لئے مٹی کے مٹکے رکھ دیئے گئے۔

مریدوں کے بیٹھنے کے لئے چٹائیاں بچھادی گئیں۔

ہر جمعرات کو کوئلے دہکا کر لوبان کی بے تحاشہ

دھونی دی جاتی۔

پھر کئی عقیدت مندوں نے اس آگ میں اگربتیاں ڈال کر ماحول معطر کردیا، دیکھا دیکھی اس آگ میں مزید اگربتیاں جلائی جانے لگیں۔

سردی کے موسم میں مرید کوئلے لاکر دہکانے لگے، ان کوئلوں کی سیاہ خاک شیدا اور اس کے مرید چہروں پر مل کر اپنے کالے چہروں کو مزید کالا کرنے لگے۔ اس مکروہ فعل کو بھی باباجی کی کرامت قرار دیا گیا۔

جمعرات اور اتوار کو چندے کے لئے جھولیاں پھیلائی جانے لگیں ساتھ ہی حق ہو کے نعرے لگنے لگے۔

باباجی کی دعا سے گودیں ہری ہونے لگیں۔ اب تو بیٹے لینے کے لئے خواتین و حضرات جمعرات اور اتوار کو یوں آتے۔

جیسے ووٹ ڈالنے والے افراد لائنوں میں کھڑے ہوتے ہیں یا بل کی ادائیگی کے لئے بینک سے باہر لائن لگتی ہے۔

نمک، مٹھائی اور پانی کی بوتلوں پر دم ہونے لگا، جو مرید زیادہ نذرانہ دیتا اس کی مٹھائی پر باباجی بذات خود پھونک مارتے وگرنہ رش ہونے پر خاص مرید بھی باباجی کا ہاتھ بٹاتے، پھونکیں مارتے اور نذرانہ اکٹھا کرکے حجرے میں پہنچاتے۔

دن رات دولت کی دیوی برسنے سے خالہ نذیراں کے بھی دن یوں بدلنے لگے جیسے دھند چھٹنے پر چمکتا سورج نکلتا ہے سیاست میں قدم رکھتے ہی فراڈ کرکے دو وقت کی روٹی پوری کرنے والے کے فیکٹریوں، کارخانوں، ریتے گاڑیوں اور بینک بیلنس میں اضافہ ہوتا ہے۔

روپے کی ریل پیل سے خالہ نذیراں کے ساتھ اس کا بھاگا ہوا خاوند واپس آ گیا اس کا شمار گاؤں کے معززین میں ہونے لگا۔ شیدے کے علاوہ ان کی اولاد نہیں تھی۔ نسل کو جاری وساری رکھنے کے لئے شیدے کے لئے اس کی خاص مریدنی کا رشتہ منتخب کیا گیا جو کسی دور کے علاقے سے آ کر مریدنی کے خاص عہدے پر فائز ہوئی تھی۔

حجرے پر ہی شادی کا اہتمام کیا گیا مریدوں نے شادی پر پانی کی طرح پیسہ لٹایا مریدنی شیدے کی بیوی حجرے کی منتظم اعلیٰ تھی حجرے کی تمام آمدنی اس کے پاس تھی۔

سہاگ رات کو علی الصبح شیدے کا سب کچھ لوٹ کر وہ مریدنی یوں غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ، گنجے کے سر سے جوئیں، گرمیوں میں میٹروں سے بجلی، ریلوے لائنوں سے ٹرینیں، سرکاری دفاتر سے آفیسر اور سرکاری اسپتالوں سے ڈاکٹر غائب ہوتے ہیں۔

اس ہزیمت نے شیدے کی شہرت کے چمکتے چاند اور سورج کو گرہن لگا دیا لیکن چالاک شیدے نے اگلے دن اہم اعلان کرکے سب عقیدت مندوں اور مریدین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ساتھ ہی ان کے دلوں میں اپنے پیر کی عقیدت کی قوس قزح سات سے چودہ رنگوں میں تبدیل ہوکر اس کی عظمت کے نقارے بجانے لگے شیدے نے اعلان کیا۔

"میں نے اپنی بیوی کو پہلی رات طلاق دے دی ہے کیونکہ اس کی محبت میرے اور مریدین کے درمیان کانٹوں بھری خندق کی مانند تھی، محبت کے پھولوں سے بھر کر میں نے اس خندق کو ہموار کردیا ہے اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے مریدوں سے دور نہیں کرسکتی، میں نے راستے میں آنے والی ہر دیوار گرا دی ہے۔

آستانے کی رونق کو چار چاند لگانے اور اس کو ہمیشہ چمکانے کے لئے باباجی نے ایک اوباش مرید کے آوارہ بیٹے کو لے پالک بیٹا بنالیا۔

شیدے کے ساتھ اب وہ لڑکا بھی آنے والے مریدوں اور مریدنیوں کی مرادیں برلا رہا ہے۔

خدارا۔ تلاش کریں یہ شیدا کہیں آپ کے قرب وجوار کے گاؤں میں تو موجود نہیں۔

تکشک ناگن

محسن عزیز حلیم۔ کوٹھاں کلاں

کئی نوجوان سامنے کھڑے اپنی مستیوں میں مست تھے کہ اچانک ایک طرف سے شعلہ آیا اور اس شعلے نے نوجوان کو اپنی لپیٹ میں لے کر نوجوان کو خاکستر کردیا اور پھر......

محبت کے متلاشی جب محبوب سے بچھڑ جاتے ہیں تو دل کا کیا حال ہوتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

چاند کی چودہ تاریخ تھی اور وہ دونوں اٹھکھیلیاں کرتے سرعت سے جنگل کی حدود میں داخل ہو رہے تھے آج وہ سے آ گیا تھا جن کا ان دونوں نے کئی برسوں سے انتظار کیا تھا ان دونوں کی منزل جنگل میں موجود بھولے ناتھ کا مندر تھا وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے اور پھر آخرکار دونوں مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکے تھے وہ دونوں رینگتے ہوئے مندر میں داخل ہوگئے اور ایک طرف ہوکر کالے پتھر کے پاس بیٹھ گئے۔ ابھی آدھی رات ہونے میں کچھ سے پڑا تھا۔

ان میں سے ایک نے اپنی گول گول آنکھوں سے دوسرے کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

مندر کی چھت پر موجود روشن دان میں سے چاند

کی کرنیں سیدھی ان دونوں کے شریروں پر پڑ رہی تھیں اور وہ مست ہوئے جا رہے تھے اور پھر وہ سمے آن پہنچا جس کا انہوں نے کئی ورشوں سے انتظار کیا تھا...... آج انہیں ان کی تپسیا کا پھل ملنا تھا۔

وہ دونوں منتظر نظروں سے جوگی مہاراج کی طرف دیکھ رہے تھے اور پھر مہاراج نے ایک نظر چاند کی طرف دیکھا جو کہ اپنی تمام تر سندرتا کے ساتھ آکاش پر چمک رہا تھا۔ اور پھر جوگی مہاراج نے پاس پڑی ہوئی بین اٹھائی اسے صاف کیا اور پھر اسے بجانا شروع کر دیا بین کی مدھر لے پورے مندر میں گونجنے لگی۔ بین کا بجنا تھا کہ وہ دونوں اپنی جگہ پر پیر کنے تھرکنے لگے رفتہ رفتہ بین بجانے میں تیزی آ رہی تھی جیسے ہی بین کی لے تیز ہو رہی تھی ویسے ہی ان دونوں میں تیزی آ رہی تھی۔

اور پھر اچانک کالے پتھر سے روشنی پھوٹنے لگی اور وہ روشنی ایک لکیر کی صورت میں ان دونوں سانپوں پر پڑنے لگی وہ کوئی سدھارن سانپ نہیں تھے بلکہ تکشک سانپ تھے جو کہ ایک پھونک سے ہی کسی بھی جاندار کا انت کر سکتے تھے۔

ان دونوں سانپوں نے سو سال تپسیا کی تھی تب جا کے انہیں سانپوں سے کوئی بھی روپ بدلنے کی شکتی حاصل ہوئی تھی اب بہت جلد ہی سمے میں انہیں ان کی تپسیا کا پھل مل جانا تھا۔

جوگی مہاراج مسلسل بین بجا رہے تھے، پتھر سے روشنی نکل نکل کر ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔ پھر یکلخت مندر میں موجود بھولے ناتھ کے مجسمے میں جیسے جان پڑ گئی۔ مہاراج نے بین بجانی بند کر دی اور ہاتھوں کو جوڑ کر کھڑے ہو گئے دونوں سانپ بھی مجسمے کو دیکھ کر رک گئے، پھر مجسمے نے بولنا شروع کیا۔

''میں تمہاری تپسیا سے خوش ہوا ہوں۔ آج سے میں تمہیں روپ بدلنے کی شکتی دان کرتا ہوں۔ پرنتو اس سے پہلے میں تم دونوں کو کچھ بتانا چاہتا ہوں، اگر تم دونوں میں کسی نے انسان کے ساتھ میل ملاپ قائم کیا تو وہ انسان مر جائے گا ہاں اگر تم اپنی شکتیاں تیاگ دو اور عام منش بن جاؤ تو کچھ نہیں ہوگا۔''

پھر ان دونوں سانپوں نے اپنے اپنے پھن زمین پر رکھ دیئے جس کا مطلب تھا کہ وہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں اور پھر بھولے ناتھ کے مجسمے نے اپنا ہاتھ ان دونوں کی طرف کیا تو سفید رنگ کا دھواں سا نکلنے لگا دھوئیں نے آہستہ آہستہ ان سانپوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کچھ ہی سمے بعد جب دھواں ختم ہوا تو وہاں سانپ نہیں بلکہ دو انسانی وجود تھے ایک مرد اور ایک عورت۔

جوگی مہاراج نے ان دونوں کی طرف کپڑے اچھالے جو کہ ان دونوں نے پہن لئے۔

''جاؤ خوش رہو میرا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے سدا سکھی رہو۔''

''ہم دونوں آپ کے بہت ابھاری ہیں کہ آپ نے ہمیں شکتیاں دان کیں بہت بہت دھنے باد۔ بھولے ناتھ کی جے ہو۔'' اور پھر مجسمہ اپنی جگہ پھر سے پتھر کا ہو گیا۔

پھر وہ دونوں جوگی مہاراج کی طرف بڑھے۔

''مہاراج ہمارے لئے کیا آگیا ہے۔''

''کچھ نہیں بس تم دونوں دھیان سے رہنا کسی کو بھی اپنی ذات سے نقصان مت پہنچانا کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کتنے زہریلے ہو، اب تم تکشک ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا دھاری بھی ہو، میری طرف سے تم دونوں کے لئے ڈھیر ساری شبھ کامنائیں اگر تمہیں کبھی بھی میری سہائتا کی ضرورت ہو تو چلے آنا میرے پاس۔ میں تمہیں اسی مندر میں ملوں گا اب تم دونوں جا سکتے ہو۔''

یہ کہتے ہی جوگی مہاراج اپنے جاپ میں مصروف ہو گئے اور وہ دونوں مندر سے باہر نکلتے چلے گئے۔

چلتے چلتے وہ جنگل سے باہر آ گئے صبح ہونے والی تھی وہ کافی تھکے ہوئے تھے قریب ہی بہتی ہوئی ندی سے ان دونوں نے پانی پیا اور ستانے کے لئے ایک جگہ لیٹ گئے کچھ ہی دیر میں نیند کی دیوی نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ نیند کی گہرائی میں ڈوبتے چلے گئے۔

پھر ان کی نیند ہلکے ہلکے شور سے کھلی تھی وہ دونوں آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھے اپنے سامنے چھ سات آدمیوں کو دیکھ کر ان کی تو جیسے جان ہی نکل گئی کیونکہ ابھی وہ ان سب باتوں کے عادی نہیں تھے اس لئے ڈرنا فطری تھا۔

''آ...... آپ لوگ کون ہیں اور ہمیں اس طرح گھور گھور کیوں دیکھ رہے ہیں۔'' ناگ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''ڈرو مت ہم لوگ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور تمہارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے۔''

''لگتا ہے یہ لونڈا اس لونڈی کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے یہی بات ہے نا......؟''

''نن...... نہیں یہ میری پتنی ہے اور میں اس کا پتی۔'' ناگ نے ان لوگوں کو وشواس دلانا چاہا۔

پرنتو ان کی گندی نظریں تو جیسے ناگن پر ہی اٹک چکی تھیں وہ کسی بھی صورت میں لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔

ناگن تھی ہی اتنی سندر جھیل جیسی گہری نیلی آنکھیں یاقوتی ہونٹ اور اس کے شریر کے نشیب و فراز اور اس کے جسم پر متناسب سا لباس انہیں پاگل کئے دے رہا تھا...... ناگن نے جب یہ محسوس کیا تو ڈر کر ناگ کے پیچھے ہو گئی۔

''ارے دیکھو تو کیسے ڈر رہی ہے۔''

ان میں سے ایک آدمی نے کہا تو باقیوں نے ہنسنا شروع کر دیا......

''لڑکے اگر تو اپنی سلامتی چاہتا ہے تو اس چھمیا کو ہمارے حوالے کر دو اور چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو تیرا انجام برا ہوگا۔''

''دیکھئے ہماری آپ لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے ہم نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ ہم تو کچھ دیر کے لئے آرام کی غرض سے یہاں لیٹے تھے اگر آپ لوگوں کو برا لگا ہے تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔'' ناگ نے ان لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ تھے کہ سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔

ناگ چاہتا تو ان لوگوں کو پل بھر میں جلا کر راکھ کر دیتا یا پھر انہیں ڈس لیتا مگر وہ جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''لگتا ہے یہ لوگ ایسے نہیں مانیں گے ان کا کچھ تو کرنا ہوگا۔'' ناگن نے ناگ کے کان میں سرگوشی کی۔

''ٹھیک ہے آپ لوگ ہم سے مقابلہ کریں......؟'' ناگ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مقابلہ اور وہ بھی تم سے...... اے چھوکرے کیوں سمے سے پہلے موت کے منہ میں جانا چاہتا ہے۔ ابھی بھی سمے ہے چلا جا یہاں سے۔'' ان لوگوں کو پتا نہیں تھا کہ ان کے مدمقابل کون کھڑے ہیں اگر انہیں اس بات کا پتا ہوتا تو وہ کب کے یہاں سے بھاگ چکے ہوتے۔

''ارے ایسے کیسے چلا جائے یہ......'' اب کی بار ناگن نے آگے بڑھ کے کہا۔

''تم لوگوں میں اتنی شکتی ہے تو مجھے چھو کر دکھاؤ۔'' ناگن نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اس کی یہ اچھا میں پوری کرتا ہوں۔'' ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور جونہی اس نے ناگن کو چھوا تو ناگن نے ایک زوردار پھنکار ماری اور اگلے ہی لمحے وہ آدمی اڑتا ہوا قریب درخت سے جا ٹکرایا اب اس کی چیخیں پورے جنگل میں گونج رہی تھیں۔

یہ دیکھ کر وہ سب حیران تو ہوئے مگر اگلے ہی لمحے سب کے سب ناگن کی طرف بڑھے۔ اب کی بار ناگ نے آگے ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ ہم کیا ہیں اور تم لوگوں کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔''

مگر ان آدمیوں نے ناگ کی ایک نہ سنی اور آناً فاناً تیز دھار خنجر ناگ کے پیٹ میں گھونپ دیا...... یہ اچانک ہی ہوا تھا جس سے ناگ کو خود کا بچاؤ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ناگن پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی ناگ کو دیکھتی تو کبھی ان آدمیوں کو جن راکھشوں نے پل بھر میں سب کچھ ختم کر دیا تھا۔ ابھی تو انہوں نے جی بھر کر پریم بھی نہیں کیا تھا۔

"ناگ......" ناگن چیخی ان لوگوں نے ناگ کو چھوڑ دیا۔

"ظالموں یہ تم لوگوں نے کیا کر دیا...... ہم نے تم لوگوں کا بگاڑا تھا۔"

ناگن نے نیچے بیٹھ کر ناگ کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ "ناگ اپنی آنکھیں کھولو دیکھو تمہیں کچھ نہیں ہوگا میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔" پاپیوں امیں تم سب کو مار ڈالوں گی اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا...... نا...... ناگ مجھے چھوڑ کر مت جانا میں تمہارے بغیر نہیں جی پاؤں گی۔"

ناگن میرے پاس سمے بہت کم ہے تم...... ان راکھشوں کا انت کرنا۔ ان لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دینا یہ لزیت کے پہاڑ تلے دبے رہیں موت ان پر قہقہہ لگاتی رہے۔ تمہیں ہمارے پریم کی سوگند...... انہیں چھوڑنا مت...... ناگن مجھے وچن دو کہ تم میری موت کا بدلہ لوگی۔" ناگ نے اٹکتے ہوئے سانس سے کہا۔ "بولو ناگن۔"

"ہاں میں تمہیں وچن دیتی ہوں کہ میں ان کو ایسے تڑپاؤں گی کہ نرک میں بھی یہ سب میرے نام سے کانپیں گے۔" اور پھر ناگ نے ناگن کی گود میں ہی دم توڑ دیا...... ناگنی روتی بلکتی رہی...... مگر ناگ مر چکا تھا اور بھلا کبھی مرے ہوئے بھی کبھی لوٹے ہیں۔

ناگن نے ایک قہر برساتی نظر سے ان ظالموں کی طرف دیکھا جو کہ اب بھی ادھر ہی کھڑے تھے اور ناگن کو ہی تکے جا رہے تھے۔ "تم لوگوں نے بہت برا کیا ہے۔ جس کی سزا میں تم سب کو دوں گی اور ایسی سزا دوں گی جو آنے والی پیڑیاں بھی یاد کریں گی میں کوئی سدھارن ناگن نہیں ہوں بلکہ تلکشک اور اچھا دھاری ناگن ہوں۔ جس کا ڈسا تو دور کی بات کیول پھونکا ہی جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اپنے پیچھے دیکھو۔"

اور جب ان لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو جیسے سانس لینا بھول گئے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو ناگ کی موت دیکھنے میں اپنے ساتھی کی خبر لینا ہی بھول گئے تھے جس کو ناگن نے پھنکار سے اڑا دیا تھا۔ اب وہاں اس کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی جو کہ بہت ہی بھیانک لگ رہی تھی وہاں پر موجود دیگروں کی یہ حالت دیکھ کر خوف سے کانپ رہے تھے انہیں اب یقین ہوا تھا اور پھر جیسے ہی انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ وہاں اب نا ہی ناگن تھی اور نا ہی ناگ کی لاش۔

"ارے...... ارے یہ کہاں چلی گئی۔" سب حیرت زدہ تھے اگر اس جگہ خون کے دھبے نہ ہوئے تو وہ اسے نہ مانتے مگر وہاں خون کے دھبے بہت واضح تھے۔ "وہ واقعی اچھا دھاری ناگن ہے جو کہ ہمیں اب کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑے گی ہم نے کئی واقعہ پڑھے ہیں ان اچھا دھاری ناگنوں کے بارے میں یہ اپنے دشمنوں کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑتیں۔ پاتال میں سے نکال لاتی ہیں اپنے دشمنوں کو او بھگوان اب ہم کیا کریں ایسا نہ ہو کہ اب وہ پھر سے یہاں آجائے ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔"

"فوراً یہاں سے نکل چلو چلو۔" اور پھر وہ سب وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کے دوڑ پڑے...... لیکن وہ سب اپنے انجام سے بے خبر تھے۔

☆......☆......☆

ناگن ناگ کے مردہ شریر کو لے کر بھولے ناتھ کے مندر میں پھر سے آ گئی تھی۔ ناگن نے ناگ کے مردہ شریر کو بھولے ناتھ کے چرنوں میں رکھ دیا اور اب وہ متلاشی نظروں سے جوگی مہاراج کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اور پھر کچھ ہی سمے میں ناگن نے جوگی مہاراج کو ڈھونڈ لیا تھا۔

جوگی مہاراج بھولے ناتھ کی مورتی سے ذرا دوری پر اپنے جاپ میں مشغول تھے ناگن چلتی ہوئی جوگی مہاراج کے پاس آ گئی، جوگی مہاراج آنکھیں بند کئے اپنے جاپ میں مصروف تھے۔

اور پھر جیسے ہی جوگی بابا نے ناگن کی بو سونگھ لی

تھی جوگی مہاراج نے فوراً سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ "ناگن تم یہاں اس سمے اور ناگ کہاں ہے اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے۔" مہاراج نے ناگن کو دیکھتے ہی اتنے سارے سوال کر دیے تھے اور ناگن جواب دینے کی بجائے رونے لگ گئی تھی۔ ناگن کو روتا ہوا دیکھ کر جوگی مہاراج تیزی سے آگے بڑھے۔

"کیا ہوا ہے تم رو کیوں رو رہی ہو؟"

"مہاراج میرا ناگ......" ناگن سے شدت غم سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے ناگ کو...... ناگ ہے کہاں......؟"

اور پھر ناگن جوگی مہاراج کو بھولے ناتھ کی مورتی کے پاس لے گئی اور ناگن نے روتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا اور جب مہاراج نے نیچے دیکھا تو جیسے بھونچال سا آ گیا اسے اپنے پاؤں تلے دھرتی کھسکتی محسوس ہوئی۔

"یہ...... یہ سب کیسے ہوا کس نے کیا یہ سب۔"

انسانوں نے مہاراج۔" ناگن نے روتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ انسانوں سے بچ کر رہنا ان کے پاس مت جانا وہ ایسے ہی سنگدل ہوتے ہیں ارے وہ انسان انسانوں کے سگے نہیں ہیں تو تمہارے کیسے بنتے۔" مہاراج چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

"نہیں مہاراج ہم لوگوں نے ان لوگوں کو کچھ نہیں کہا تھا۔" اور پھر ناگن نے روتے ہوئے ساری کتھا جوگی مہاراج کو سنا دی۔

ساری کتھا سن کر بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "ان لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے جس کی سزا انہیں آوش ملے گی۔"

"ہاں بابا میں ان سے اپنے ناگ کی ہتھیا کا ضرور بدلہ لوں گی۔" ناگن نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کہا تھا نا بابا کہ کسی انسان یا کسی بھی جاندار کو نقصان مت پہنچانا پہل انہوں نے کی ہے اب میں انہیں بتاؤں گی کہ دشمنی کیا ہوتی ہے میں انہیں کچھ نہیں کہوں گی انہوں نے مجھ سے جیون ساتھی چھینا ہے میں ان سے ان کی زندگی چھین لوں گی...... میں ان کے لئے کال بن جاؤں گی۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم بیٹی جب بھی کبھی دھرتی پر راونوں نے جنم لیا ہے تو ان کو ملیامیٹ کرنے کے لئے کسی رام نے بھی ضرور جنم لیا ہے پرنتو اس بار راونوں کا انت ایک ناگن کے ہاتھوں ہوگا۔"

مگر اس یدھ میں مجھے آپ کی سہائتا کی آوشکتا ہے۔" ناگن نے بابا سے کہا۔

"میں تمہاری ہر طرح سے سہائتا کروں گا بیٹی۔" بابا نے کہا۔

"آپ مجھے اپنے گیان سے یہ بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ابھی پتا لگا لیتے ہیں۔" اور یہ کہہ کر جوگی مہاراج نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کچھ سمے وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکان تھی۔

"کیا ہوا بابا......؟ پتا چلا ان کا......" ناگن نے جلدی سے پوچھا؟

"ہاں مجھے ان کا پتا چل گیا ہے تمہیں اپنے دشمنوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔" بابا نے ناگن کو بتایا۔

"وہ کیسے، میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"کیونکہ وہ پاس والی بستی کے رہنے والے ہیں۔ جن میں تین آپس میں رشتہ دار ہیں اور باقی تین کوئی اور ہیں لیکن تم ذرا سنبھل کر جانا کیونکہ وہ بستی والے جنگل کے قریب ہونے کی وجہ سے سانپوں کے متعلق بہت جانکاری رکھتے ہیں۔" بابا نے ناگن کو بتایا۔

"آپ فکر مت کیجیے بابا اب میں بہت جلد انہیں موت سے دوچار کر دوں گی اور میں بھی اپنے ناگ کے پاس......" وہ ابھی مکمل نہ کر پائی تھی کیونکہ آنسوؤں نے جیسے اسے بولنے ہی نہیں دیا تھا آنسوؤں کی جھڑی

اس کے گال کو بھگونے لگی تھی۔

اور بدلے کی آگ اپنے سینے میں لئے راکھشوں کا انت کرنے وہ مندر سے باہر نکل گئی تھی۔

جس سے وہ مندر سے باہر نکلی تھی تب ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا جنگل کافی گھنا تھا جس کی وجہ سے دن میں بھی رات کا گمان ہوتا تھا...... جس راستے پر وہ کھڑی تھی وہ راستہ سیدھا بستی میں ہی جاتا تھا اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کیں اور دو تین گہرے سانس لئے اور پھر اگلے ہی لمحے وہ سانپ بن چکی تھی، اب وہ تیزی سے بستی کی طرف بڑھ رہی تھی بستی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا پھن اٹھا کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں کہ کہیں وہ کسی کی نظر میں تو نہیں اور پھر تسلی کر لینے کے بعد وہ دوبارہ ناگن کے روپ میں آگے بڑھنے لگی۔

ناگن سب سے پہلے اپنے دشمنوں میں سے تینوں رشتہ دار کو نشانہ بنانا چاہتی تھی۔

''اگر میں اس روپ میں ان کے سامنے گئی تو وہ مجھے پہچان لیں گے مجھے روپ بدل کر ان کے سامنے جانا ہوگا۔'' اور اگلے ہی لمحے وہ ایک سندر عورت کے روپ میں کھڑی تھی۔ پھر وہ چلتی ہوئی بستی میں داخل ہوگئی کچھ ہی دیر میں وہ اپنا مطلوبہ گھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

وہ اتنی شکتی شالی تھی کہ پل بھر میں پوری بستی کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اسے تو بس اپنا بدلہ لینا تھا۔

''ہمارا بھی ایک گھر ہوتا تھا اگر یہ ظالم ہمیں جدا نہ کرتے میرے ناگ کو مجھ سے نہ چھینتے۔ میری نیندیں اڑا کر کتنے سکون سے سو رہے ہیں پاپی...... جو کسی کو اجاڑتے ہیں وہ خود بھی اجڑ جاتے ہیں۔'' اور پھر اس نے ایک گھر کو دیکھا جو کہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

وہ انہیں ان کے گھر والوں سمیت جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی جو کہ اس کے لئے بہت آسان تھا اور پھر اگلے ہی لمحے ناگن کے منہ سے شعلے نکل نکل کر اس لکڑی کے بنے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے اور پھر اچانک اس کے منہ سے آگ کا ایک بہت بڑا گولہ سا نکلا اور اس نے پورے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

گھر سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور آہستہ آہستہ بستی والے جاگ رہے تھے اور بھاگ بھاگ کر جلتے ہوئے گھر کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بستی والوں کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں سبھی لوگ جلتے ہوئے گھر کو دیکھ رہے تھے مگر اسے بچا نہیں سکے تھے پورا گھر گھر والوں سمیت جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ سبھی لوگ اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہے تھے کوئی کہتا کہ ''لٹیرے آئے ہوں گے تو کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ایک اجنبی عورت کو دیکھا تھا۔

''ارے ہاں یہ تو واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' یہ آواز رادھا موسی کی تھی جو کہ قریب ہونے کی وجہ سے جلدی بھاگ کر آ گئیں تھیں۔

''مگر وہ عورت بھلا کیوں آگ لگائے گی۔''

ایک اور آواز ابھری۔ لوگ طرح طرح کی اور بھی باتیں کر رہے تھے پوری بستی کے لوگ اس جلے ہوئے گھر کے پاس موجود تھے اور ان لوگوں میں وہ تینوں بھی شامل تھے اور انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ آگ کس نے لگائی ہے۔

ناگن عقاب کے روپ میں ایک درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی اب اس کی نظر میں وہ تینوں بھی آ گئے تھے، ان تینوں کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی عنقریب وہ تینوں بھی ناگن کے انتقام کا نشانہ بننے والے تھے۔ اور پھر عقاب کے منہ سے بہت بھیانک چیخ بلند ہوئی اس کے بعد اس نے ایک اڑان بھری اور اندھیرے میں کہیں گم ہوگیا۔

☆......☆......☆

رمیش ان تینوں میں سے ایک تھا اور اپنی وِدوا ماں اور بہن کے ساتھ اسی بستی میں رہتا تھا، ماں سارا دن بستی کے گھروں میں کام کرتی اور بہن گھر کے

کام، یوں ان کی گزر بسر ہوتی تھی ہر رمیش سارا دن آوارہ گردی کرتا رات گئے گھر واپس لوٹتا اور آتے ہی اپنی ماں اور بہن کے لئے عذاب بن جاتا۔ وہ دونوں ماں بیٹی اسے گھر سے نکلنے کا کہتیں جواباً وہ ان دونوں کو مارتا پیٹتا، دونوں ماں بیٹی رمیش سے تنگ آ چکی تھیں یہ ہر روز کا معمول تھا۔

ناگن عقاب کے روپ میں یہ سب دیکھ چکی تھی۔ ''ہر انسان برا بھی نہیں ہوتا اور ہر انسان اچھا بھی نہیں ہوتا۔'' ناگن نے دل میں سوچا۔ ''یہ دونوں ماں بیٹی بھی میری طرح مظلوم ہیں۔'' ناگن کو بس رات کا انتظار تھا آج رات وہ رمیش کو بھی نرک میں پہنچا دے گی۔

دن گزر گیا اور پھر رات کی سیاہی ہر طرف پھیل گئی، رمیش رات گئے نشے میں دھت گھر واپس لوٹا تھا اور آتے ہی اپنی ماں پر گرج برس رہا تھا۔

''ارے تو مر کیوں نہیں جاتا ایسے بیٹے سے تو میں بے اولاد ہی اچھی تھی ہے بھگوان ایسا بیٹا کسی کو مت دینا۔'' اس کی ماں رو رہی تھی۔

رمیش نے آگے بڑھ کر ماں کا گلا دبوچ لیا۔

''مجھے پیسے دے نہیں تو میں تیری ہتھیا کر دوں گا۔'' رمیش کی بہن نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو چھڑانا چاہا۔

''بھیا ماں کو چھوڑ دو۔'' مگر رمیش کے ایک زوردار تھپڑ نے اسے ہوش کی دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔

''ارے کوئی بچاؤ مجھے کوئی سہائتا کرو میری۔''

''میں کہتا ہوں دے مجھے پیسے۔'' رمیش نے اپنی ماں کو دبوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... نہیں دوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے پھر مرنے کے لئے تیار ہو جا۔''

ادھر عقاب نے اڑتے ہوئے رمیش پر حملہ کیا، جس سے رمیش کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر عقاب نیچے آ بیٹھا اور اگلے ہی لمحے ناگن رمیش کے سامنے تھی۔

''پہچانا مجھے......؟ تو میری سوچ سے بھی زیادہ گھٹیا ہے۔ سچ کہا تھا ماں نے کہ یہ انسان کسی کے سگے نہیں

ہوتے۔" ناگن کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر رمیش کے پسینے چھوٹ گئے تھے اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔

"تو اپنی ماں کو مارنا چاہتا تھا...... مگر مرنا تو تجھے ہے آج۔" اور پھر ناگن کے منہ سے شعلے نکلنے لگے جو کہ رمیش کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے کچھ ہی سے بعد رمیش کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

رمیش کی ماں رو رہی تھی اس کی بہن کو بھی ہوش آ گیا تھا...... دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں پھر ناگن نے شروع سے لے کر اب تک کی ساری کہانی انہیں سنادی وہ بھی سمجھ گئی تھیں۔

"باقی اب دو رہ گئے ہیں۔" ناگن جلد از جلد ان دونوں کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتی تھی ناگن سوچ رہی تھی تبھی رمیش کی لاش کو ناگن نے پل بھر میں غائب کر دیا تھا اور یوں اس راکھشش کے وجود سے یہ دھرتی پاک ہو چکی تھی۔

وہ دونوں سدھیر اور ودجے ہیں بہت ہی کمینے ہیں دونوں لڑکیوں کو تو اپنے ہاتھ کا کھلونا سمجھتے ہیں سدھیر تو ہے ہی اکیلا جبکہ ودجے کے ماتا پتا کا پچھلے برس دیہانت ہو گیا تھا مطلب ان کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔" رمیش کی بہن نے اسے سب بتایا تھا۔

"ان سے پورا گاؤں تنگ ہے۔"

"وہ دونوں اس سے کہاں ہوں گے۔" ناگن نے اس سے پوچھا۔

"پہلے تو یہ سب ہی اکٹھے ہو کر برگد کے پیڑ کے نیچے دارو پیتے تھے جن میں سے کئی تو مر چکے ہیں۔" رمیش کی ماں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے سدھیر اور ودجے اب وہاں نہ جاتے ہوں۔" رمیش کی بہن نے کہا۔

"میں جوگی بابا سے پوچھتی ہوں اور پھر ناگن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر بابا سے رابطہ ہو گیا بابا نے اسے بتایا کہ وہ دونوں اپنے دوستوں کی موت سے ڈرے ہوئے ہیں اور اس سے وہ دونوں اکٹھے ہیں سدھیر ودجے کے گھر میں رہے۔"

ناگن نے تو جیسے سوچ لیا تھا کہ آج ہی سارے دشمنوں کو مارے گی اس سے ناگ کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی اور پھر ودجے کے گھر ناگن اپنی تمام تر خونخواری کے ساتھ پہنچ گئی تھی وہ دونوں سوئے ہوئے تھے اس بات سے بے خبر کہ موت ان کے پاس پہنچ گئی ہے۔

"اٹھو ظالمو۔" ناگن نے چلا کر کہا تو وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنے سامنے ناگن کو دیکھ کر خوف سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"تم لوگوں کی موت آج نشچت ہے تم دونوں نے کیا سمجھا تھا کہ مجھ سے بچ جاؤ گے ایک ناگن سے بچ جاؤ گے۔"

ادھر سدھیر نے غیر محسوس طریقے سے اپنے بستر سے خنجر اٹھا لیا تھا جو کہ اس نے اپنی رکھشا کے لئے رکھا تھا۔

ناگن جونہی حملے کے لئے ان دونوں پر جھپٹی تو سدھیر نے پھرتی سے خنجر ناگن کے پیٹ میں اتار دیا ناگن کے لئے یہ حملہ غیر متوقع تھا ناگن نے قہر برساتی نظروں سے سدھیر کی طرف دیکھا دوسرے ہی لمحے ناگن نے ایک تیز پھونک سدھیر کی طرف ماری تو سدھیر پل بھر میں جل کر راکھ ہو گیا اور پھر ودجے کے ساتھ بھی ناگن نے وہی کیا اس کے پاس سے بہت کم رہ گیا تھا۔ وہ جیسے تیسے کر کے مندر آ گئی جہاں اس کے ناگ کا مردہ شریر پڑا تھا۔

"ناگ۔" ناگن کے منہ سے نکلا اور مردہ ناگ پر گر پڑی۔

جوگی مہاراج بھی آ گئے تھے۔ "بابا میں نے اپنا انتقام پورا کر لیا ہے انت کر دیا ہے ان سب کا میں نے میرا ابھی سے پورا ہو گیا؟"

ناگن ہانکا ہانک کر بول رہی تھی۔ "میں، میں جا رہی ہوں بابا اپنے...... اپنے ناگ کے پاس...... زندہ رہ کر تو نہ مل سکے اب مرنے کے بعد۔" اور پھر ناگن بے جان ہو کر ناگ کے اوپر گر گئی اس طرح یہ کہانی کا انت ہو گیا۔



وہ ایک پل

محمد شعیب۔فیصل آباد

وہ عجیب الخلقت لڑکی نما مخلوق تھی لمبے لمبے بال جو کمر تک لہرا رہے تھے آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے اس کا پورا وجود روشنی میں نہایا لگ رہا تھا اور پھر اچانک......

ایک پل نے نوجوان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا...... ایک سبق...... آموز...... کہانی

وہ شام میرے لیے کافی خاص تھی کیونکہ عرصے بعد دوستوں کا ساتھ نصیب ہوا تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے خوب گپ ہانک رہے تھے۔ اسلم، جاوید، وقار اور ثاقب عرصے بعد میرے گھر آئے تھے۔

"یار دانیال تو نے تو کافی ترقی کر لی ہے رائیٹنگ میں۔" برجستہ وقار کہہ اٹھا تھا۔ میں چونکا کیونکہ ابھی بات اسکول کے دنوں کی ہو رہی تھی اور وہ یک دم میرے لکھنے کی بات لے آیا تھا۔

"بس تم سب کی دعا ہے......!" میں نے بھی شانے اچکاتے ہوئے سامنے رکھی میز سے چائے کا کپ اٹھایا۔ رات کا وقت تھا اور بادلوں نے رات کی خنکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

"ہماری تو دعا ہے تیرے ساتھ مگر یہ سب ہوا کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ تم اور ڈر...... دونوں ایک

ساتھ؟'' وہ خاصا حیران تھے کیونکہ میں رومانوی کہانی لکھنے والا اب ہارر ڈائجسٹ میں اپنا مقام بنا چکا تھا۔ تمام ہارر ڈائجسٹ میں میرے افسانے اور کہانیاں تقریباً ہر ماہ چھپتی رہتی تھیں۔ میرے دوست اگرچہ ڈائجسٹ اور افسانوں کی دنیا سے نابلد تھے مگر میرا نام اکثر ان کی سماعت سے ٹکراتا رہتا تھا۔

''بس یار...... ذوق بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں...... ضرور کچھ ہے۔ ہمیں بتاناں......''

جاوید نے زور دیتے ہوئے کہا تو باقی بھی ضد کرنے لگے۔ اب بھلا جہاں چار دوست ایک بات پر ڈٹ جائیں تو وہاں اکیلے بندے کی کہاں چلتی ہے؟

''اچھا اچھا بتاتا ہوں...... میری زندگی میں وہ پل کون سا تھا جب میں نے ہارر لکھنا شروع کیا۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ سب چوکنا ہوکر بیٹھ گئے جیسے میں ان کو کسی مہم جوئی کی داستان سنانے لگا ہوں۔ ویسے یہ ایک داستان ہی تھی جو میری زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ ایک پل جو میری زندگی کے باقی پلوں سے یکسر مختلف تھا۔

اگر وہ پل میری زندگی میں نہ آتا تو شاید میں اس مقام پر نہ ہوتا۔ میرے اس مقام کے پیچھے وہی پل تھا۔

دوست سب میری طرف متوجہ تھے اور میں ماضی کے اس پل میں دوبارہ کھو چکا تھا۔

اس رات میں اکیلا گھر پر موجود تھا۔ گھر والے کسی رشتے دار کی شادی پر گئے ہوئے تھے اور رات وہیں بسر کرنے کا ارادہ تھا۔

''کافی دنوں بعد گھر میں سکون ہے لگتا ہے آج اتنے ہفتوں سے جو ناول زیر تحریر ہے وہ مکمل ہو ہی جائے گا۔'' میں نے سوچا اور ابھی اسٹڈی ٹیبل کی طرف جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مجھے خیال آیا بیٹھنے سے پہلے گھر کے دروازے لاک کردیے جائیں۔ میں نے اپنے خیال کی تکمیل کی اور باہر لان کی طرف آیا۔ جہاں کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔

''اچھا ہوا جو ایک نظر ادھر دیکھ لیا ورنہ رات بھر کھلا رہتا اور کوئی چور وغیرہ ایویں گھر میں داخل ہوجاتا۔'' خودکلامی کرتے ہوئے میں نے دروازہ لاک کیا اور واپس پلٹ آیا۔

میری ٹیبل کھڑکی کے عین سامنے تھی جہاں سے لان صاف دیکھائی دیتا تھا۔ میں آستینیں چڑھاتا ہوا کرسی پر بیٹھا اور لیپ ٹاپ کو آن کیا۔ اب چونکہ اکیسویں صدی تھی اور مجھے زمانے کے ساتھ چلنا آتا تھا تبھی میں ان پیج میں اپنی تحاریر لکھتا تھا۔

زیر تحریر ناول کا عنوان تھا'' پیا سنگ ہوا گر'' یہ ایک رومانوی ناول تھا اور بائے چانس لکھا جانے والا سین بھی رومانوی تھا۔ رات کی سیاہی، سرد ہوائیں اور سامنے ہوا کے سنگ جھومتے پتے شاید میرے ساتھ تھے۔ ذہن میں بھی کئی خیالات امڈ آئے تھے جنہیں اب تحریر کرنا باقی تھا۔ میں نے لکھنا شروع کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ اب بھلا بند کمرے میں کون ہوسکتا تھا؟ میں نے اپنا خیال سمجھا اور گردن جھٹک کر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

ابھی محض پانچ منٹ ہی گزرے ہونگے کہ مجھے اپنے دائیں شانے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا تھا۔ میں بری طرح چونکا اور ایسا چونکنا لازمی امر تھا کیونکہ میں مکمل طور پر کہانی کے سین میں محو تھا۔

''کون ہے؟'' میرے لبوں سے برجستہ جاری ہوا مگر وہاں ہوا اور خاموشی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس بار میری پیشانی پر سلوٹوں کے ساتھ ساتھ پسینہ بھی نمودار ہوگیا تھا کیونکہ میں نے واقعی کسی کے لمس کو محسوس کیا تھا۔ میں اٹھا اور اپنے لیپ ٹاپ کو یونہی آن رہنے دیا۔ باہر آیا اور کچن میں جاکر ایک گلاس پانی پیا۔ شاید میں اس بار بھی اسے اپنا وہم ہی سمجھ رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد میں واپس اپنی جگہ آیا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ میرا لیپ ٹاپ آن تھا۔ وہی کہانی تھی مگر میرا لکھا گیا وہاں موجود نہ تھا۔ میرے حواس منتشر ہوچکے ہیں۔ میں آنکھیں

ٹکائے کئی لمحے وہیں کھڑا رہا اور لیپ ٹاپ کے ان پیج کے خالی صفحے (سکرین) کو تکتا رہا۔

''امپاسیبل......!'' میں بھاگتا ہوا لیپ ٹاپ کے سامنے آیا اور کرسر کو گھما کر آگے پیچھے کیا مگر وہاں ایک لفظ بھی موجود نہ تھا۔ سفید دامن کی طرح ہر شے مٹی ہوئی۔ میرے لکھے گئے پانچ صفحات جو میں نے ابھی ابھی تحریر کیے تھے۔ اب وہاں موجود نہ تھے۔ میں نے آنکھیں ایک لمحے کو بند کیں اور واپس کھول کر دیکھا کہ شاید مجھے دیکھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ میرا لکھا مٹ چکا تھا۔ جس پر مجھے کافی افسوس تھا کیونکہ میں نے جو تحریر کیا تھا وہ ایک ایک پل قدرت نے لکھوایا تھا اور منظر نگاری شاید میں اب دوبارہ تحریر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میری آنکھوں میں وحشت کا سماں تھا مگر میں اپنے آپ کو سنبھالنا جانتا تھا۔ تبھی اپنے حواس کو منتشر ہونے سے بچانے کی خاطر میں وہیں براجمان ہوگیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''کون کرسکتا ہے یہ؟'' میں نے سوچا مگر جواب ندارد۔

''شاید اٹھتے ہوئے میرا ہاتھ غلطی سے پچ ہوگیا ہوگا ڈیلیٹ آپشن پر۔'' اب بھلا دل کو سمجھانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی تھا۔ بظاہر یہ ایک بچے کو سمجھانے جیسا تھا مگر کیا کریں خود کو تسلی دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میں اب دوبارہ لکھنے لگا تھا۔ اب تقریباً چار صفحات تحریر کرچکا تھا۔ اس بار میں ویسا نہ لکھ سکا تھا جیسا پہلے لکھا تھا مگر کام تو چلانا تھا۔ میں ابھی پانچویں صفحے پر پہنچا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ لیپ ٹاپ کو پیچھے کیا اور دھیرے سے وہاں سے کھسکتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

''اتنی رات کو کون ہوسکتا ہے؟'' میں یہی سوچتے ہوئے باہر جارہا تھا۔ میں چونکہ فقط سفید رنگ کے کرتا پاجامے میں تھا اور رات کی خنکی انتہا کی تھی۔ اسی لیے لان میں آتے ہی رات کی سرد ہوائیں مجھ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ میں نے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے دروازہ کھولا تھا مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی نہ تھا۔ مجھے کافی غصہ آیا۔

''اگر انتظار نہیں کرسکتا تھا کوئی تو دروازے پر دستک ہی کیوں دی گئی؟'' میں اس انجان آدمی کو کوستے ہوئے واپس اندر آیا۔ اندر آنے پر مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی سرد طوفان سے لڑکر آرہا ہوں۔ جسم پر طاری کپکپی ایک لمحے میں ہی اتر گئی اور سانسوں کی روانی قدرے بحال ہوئی۔

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی تو رات کے گیارہ بجے تھے۔

''اب چاہے جو مرضی ہوجائے میں نے اپنے روم سے باہر نہیں آنا۔'' میں عزم کرچکا تھا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اب دروازہ بھی صحیح سے کھولا نہیں تھا کہ عقب سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں دفعتہ پلٹا۔

''کون ہے وہاں؟'' میں نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کرچکا تھا اور لاؤنج میں آکر ایک ایک شے کو گھورا مگر کوئی خاطر خواہ شے نظر نہ آئی۔ میں نے زینے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک پرچھائی نظر آئی۔ روشنی صرف لاؤنج میں ہی تھی اور زینے کی طرف والا بلب آف تھا۔ اس لیے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

''کون ہے؟'' میں نے ہاتھ بڑھا کر پوچھا مگر وہ عکس آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور فی الفور زینے کی طرف بڑھا۔

اوپر جاکر میں نے ہر کمرے کو دیکھا، ہر شے کو چھان مارا مگر کوئی شے نظر نہ آئی۔ میں افسردہ چہرے کے ساتھ واپس نیچے آیا تھا۔ میرے اندر اب ڈر اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔

''کہیں دروازہ کھلا ہونے کے باعث کوئی چور تو نہیں آگیا؟'' میں نے سوچا مگر اپنے خیال کو جھٹک دیا کیونکہ اگر وہاں واقعی چور ہوتا تو اتنی جلدی کہاں جاسکتا تھا؟

بہر حال میں اپنے روم میں لوٹ آیا تھا۔ اس بار وہاں لوٹنے پر میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ ایک بار پھر میری تحریر غائب تھی۔ میرا ذہن واقعی ماؤف ہو چکا تھا۔

''کون ہے؟'' میں چیخا اور کافی دیر تک انجان وجود کو پکارتا رہا۔ جو میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

''دیکھو میں جانتا ہوں کہ یہاں کوئی ہے۔ جو بھی ہے میرے سامنے آئے۔'' مجھے کمرے میں موجود ہر شے مشکوک نظر آرہی تھی۔ آنکھیں ایک ایک شے کو گھور رہی تھیں مگر وہ وجود میرے سامنے آنے سے قاصر رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنے عقب میں ایک بار پھر قدموں کی چاپ سنی۔ میں برق رفتاری سے باہر آیا۔ وہ آواز اب ٹیرس سے آرہی تھی۔ میں بھاگتا ہوا ٹیرس کی طرف آیا تھا۔ وہاں بھی ہر طرف اندھیرا تھا مگر اس اندھیرے میں ایک جھلک نظر آرہی تھی۔ وہ وجود تھا یا پھر چھل؟ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

''کون ہے وہاں؟'' میں چلایا۔ وہ آگے بڑھتا وجود اب رک چکا تھا۔ میرے قدم بھی وہیں جم گئے۔

''کون ہے؟ ادھر دیکھو۔'' میں نے کرخت آواز میں کہا تھا۔ کافی دیر تک وقت یونہی رکا رہا اور پھر وہ وجود میرے سے پلٹا۔ میری نگاہیں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میں اب ذرا سا آگے بڑھا تھا۔ وہ وجود جیسے ہی پلٹا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

سفید وجود پر خون کے نشانات اندھیرے میں عیاں تھے۔ زخم بھی اندھیرے میں کسی گہری کھائی کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ میں بری طرح چلایا اور پیچھے کی جانب اچھل دیا۔

''کک کون ہو تم؟'' میری زبان ہکلائی تھی اور میں یک ٹک اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑتی ہوئی ایک لڑکی نما دکھائی دے رہی تھی۔ لمبے لمبے الجھے ہوئے بال جو کمر تک بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انتہا کی حد تک خوفناک تھے۔ وہ اب میری طرف بڑھنے لگی تھی۔ میری تو سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ میں کسی بچے کی طرح زمین پر رینگتے ہوئے پیچھے کی جانب کھسکتا جا رہا تھا اور وہ مسلسل میری طرف بڑھ رہی تھی۔

''دور رہو...... مجھ سے دور رہو...... خدا کے لئے چلی جاؤ۔'' میں سمجھا جیسے وہ مجھے مار ڈالے گی کیونکہ میں نے آج تک یہی سنا تھا کہ دوسری مخلوق کسی انسان کو زندہ نہیں چھوڑتی اور وہ دوسری مخلوق ہی تھی۔ آج سے پہلے ان کے وجود میں ایک ابہام تھا مگر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد مجھے اب پوری طرح ان پر یقین آچکا تھا۔ میری آنکھوں میں خوف کے آنسو تھے اور وہ میرے وجود کے عین پاس آچکی تھی۔ دو فٹ سے بھی کم کا فاصلہ تھا۔

اب میں اپنی زندگی کا آخری پل سمجھ رہا تھا اور مرنے کے لیے بھی بالکل تیار تھا مگر شاید قسمت کی مہربانی تھی کہ میں بچ گیا۔ وہ وجود میرے عین قریب آنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔

میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے ہوا میں تحلیل ہوتا دیکھا تھا۔ وہ کوئی غلط فہمی نہ تھی اور نہ ہی خواب۔ وہ سب کچھ سچ تھا۔

''بس اسی ایک پل کے بعد میں نے بھی اس طرف اپنا قلم موڑا۔ رومانوی ناول کا سفر وہیں ختم کیا اور نئے سفر پر نکل پڑا۔ ایک پراسرار دنیا...... جہاں ہر روز نت نئے کرداروں سے ملاقات ہونے لگی۔ بس وہی ایک پل تھا، جو میرے لئے ایک turning point ثابت ہوا تھا۔''

میرے دوستوں کو یہ کہانی کتنی سچی لگی یہ تو میں نہیں جانتا مگر یہ سب سچ تھا۔ وہ ایک پل میری زندگی کا خاصا تھا۔ آج بھی جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ پل میرے سامنے ہوتا ہے۔

وہ زخموں سے بھرا ہوا چہرہ...... خون سے لت پت لباس اور کمر تک بڑھے ہوئے کھلے بال۔

جیسے وہ آج بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور میں اس کے حصار میں ہوں مگر وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی مگر کیوں؟ اس سوال کا جواب مجھے آج تک نہیں ملا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

یہ دنیا ہے یہاں پہ تماشہ ہو بھی سکتا ہے
ابھی جو غم ہمارا ہے تمہارا ہو بھی سکتا ہے
یہ نہ سمجھو کہ تم ہی میری آخری محبت ہو
محبت جرم ہے تو کیا دوبارہ ہو بھی سکتا ہے
(شان ملک...... ٹنڈو آدم)

کبھی یاد آئیں تو پوچھنا ذرا اپنی خلوت شام سے
کہ عشق تھا تیری ذات سے کہ پیار تھا تیرے نام سے
ذرا یاد کر کہ وہ کون تھا جو کبھی تجھے بھی عزیز تھا
وہ جو جی اٹھا تیرے نام سے وہ جو مر مٹا تیرے نام سے
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈو الہ یار)

رات بھر غم کے مصلے پہ پڑا رہتا ہوں
ہجر دیتا ہے جب بھی تیرا، اذان شام کے بعد
تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد
(جاوید مائیکل...... کراچی)

وہ جو میرے نام کی قسمیں کھایا کرتے تھے
وہ جو چل کر میرے پاس آیا کرتے تھے
اب وہ کہتے ہیں کہ بھول جاؤ ہمیں
ہم تو فقط تمہارا دل بہلایا کرتے تھے
(صبا محمد اسلم...... گوجرانوالہ)

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں بھی ابر
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

ہر محفل روئے گی ہر دل روئے گا
ڈوبی جو میری کشتی تو ساحل بھی روئے گا
اتنا پیار بکھیر دیں گے زمانے میں کہ
میری موت میرا تو کیا قاتل بھی روئے گا
(محمد تسمیر بوسن...... راجن پور)

کاش مل جائیں مجھے بھی کبھی لوگ ایسے
جو نہ اپنوں کا نہ غیروں کا برا سوچتے ہیں
میری اس شہر میں تہذیب رہائش ہے جہاں
لوگ سجدوں میں بھی اوروں کا برا سوچتے ہیں
(سنبل طہٰ...... پنڈ دادنخان)

وہ شخص کبھی اس کا کبھی اس کا کبھی میرا ہوا
حسن برباد کرلیا اس نے محبت کی تجارت کرتے کرتے
(محمد دانیال...... روڈہ تھل)

اتنا آسان نہیں شہر محبت کا پتا محسن
خود بھٹکتے ہیں یہاں راہ بتانے والے
(محسن عزیز حلیم...... کوٹھا کلاں)

اسے پانا اسے کھونا اسی کے ہجر میں رونا
یہی گر عشق ہے محسن تو ہم تنہا اچھے
(عبدالحلیم اینڈ محسن...... کوٹھا کلاں)

نجانے کن دردوں کو دوا ڈھونڈ رہا ہوں
آج بھی اس زمانے میں وفا ڈھونڈ رہا ہوں
یہاں تو انسانوں میں ہی انسان نہیں ملتے
پاگل ہوں، پتھروں میں خدا ڈھونڈ رہا ہوں
(محمد خالد عباس...... ننکانہ صاحب)

میری نگاہوں میں دیکھ کر کہہ دے کہ ہم تیرے قابل نہیں
قسم ہے تیری چلتی سانسوں کی ہم تیری دنیا ہی چھوڑ دیں گے
(خضر حیات...... روڈہ تھل)

زندگی گلزار ہے
یہ مہکتی بہار ہے
آؤ اس میں بیٹھ چلیں!
یہ ٹھنڈی سایہ دار ہے
(عبدالجبار رومی انصاری...... قصور)

عمر بھر اسے چاہا پھر بھی وہ اپنا نہ بنا
نہ جانے وہ کون سی محبت تھی جو ہم اسے دے نہ سکے
(رانا زوہیب...... روڈہ تھل)

☆☆



آج بھی چاہیں تو انسان سنبھل سکتے ہیں
ہاں ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
حشر کچھ بھی ہو بلا سے کسی بدقسمت کا
ماہ و انجم کہیں رفتار بدل سکتے ہیں
جس نے محروم مسرت کیے لاکھوں چہرے
اس کے لمحات طرب آہ میں ڈھل سکتے ہیں
انقلابات کی سوگند جو بشاش ہیں آج
ایک دن دست تاسف بھی وہ مل سکتے ہیں
موت کے نام سے گھبرا کے لرزنے والوں
موت سے زیست کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں
گردش شام و سحر نے جنہیں پامال کیا
دامن رنج و الم میں بھی وہ پل سکتے ہیں
جن کو طوفان حوادث نے کیا گل واجد
وہ دیے جذبہ اخلاص سے جل سکتے ہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے نہیں آج کل کے پار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
یادوں کے سفر میں ہمیشہ سے تھا تنہا
بیگانوں سے پوچھ لیتا ہوں رستہ رہگزاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خار زاروں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو
وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
قسمت میں اپنی کچھ آنسو آئیں ہیں جاوید
موسم بدل گیا ہے آج پھر سے شراروں کا
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

جو تم نہ ہوتیں تو دنیا میں
تو.....
یہ دنیا بہت بے رنگ سی ہوتی
گہری کالی رات تو ہوتی
مگر.....
بغیر چاند کے کہاں چاندنی سی ہوتی
جو تم نہ ہوتیں دنیا میں
تو.....
تاروں سے سجا آسماں نہ ہوتا
پھولوں سے بھرا گلشن نہ ہوتا
لفظ ''تعریف'' کا وجود نہ ہوتا
دیوانہ جہاں میں کوئی موجود نہ ہوتا
کائنات میں ایک ویرانی سی ہوتی
جو تم نہ ہوتیں دنیا میں
تو.....
خوشیوں کا سمندر ہے
پنہاں تیرے اندر
بہت پوشیدہ سے ہیں
دلکش حسیں تجھ میں منظر
دیتا ہے جو جینے کی وجہ
آتا ہے وہ سکون تجھ میں نظر
ہے تجھ کو پانے کی بے چینی سی ہوتی
جو تم نہ ہوتیں دنیا میں
تو.....
یہ دنیا بے رنگ سی ہوتی
گہری کالی رات تو ہوتی
مگر.....
بغیر چاند کے کہاں چاندنی سی ہوتی.....!!!
(شاعرہ: ایڈووکیٹ ثنا خان.....کراچی)

تم سے محبت تھی تو الفاظ بھی ہمارے ساتھی تھے
تم نے کیا رخ موڑا، الفاظ ہی ہم سے روٹھ گئے
اے بے وفا! اتنا تو بتا کہ محبت جرم ہے کیا؟
اگر محبت جرم ہے تو پھر اس کی سزا ہے کیا؟

تنہائی کیوں لکھی گئی فروا کے نصیب میں
تیری محبت تیرا ساتھ نہ لکھا گیا؟
تیرے ساتھ نے مجھ کو دلوں پہ راج کرنا سکھادیا
تیری جدائی نے ہی فروا کو سب کچھ بھلادیا
(شاعرہ: فروا تنویر.....لاہور)

کیا مانگوں نہیں مجھ کو ہے انداز طلب یاد
جز اس کی محبت کے سبق مجھ کو نہیں سب یاد
جب نیم کھلی دیکھتا ہوں گلشن میں کلی میں
اس مہوش کے مجھے آجاتے ہیں لب یاد
وہ ناز اور عشوہ کی تہہ چہرے پہ اس کے
بھولا نہ اسے پیار میں سامان حرب یاد
مدت سے تبسم سے نہیں اپنا تعارف
اس دل کو تو اب تک ہے رونے کا ڈھب یاد
جس آنکھ میں غیروں کا کوئی تاج محل ہو
ہم خاک نشیں اس کو بھلا کرتے ہیں کب یاد
اے کاش کہ شاکر نے تجھے دیکھا ہی نہ ہوتا
کچھ دیر تو کرلیتا الگ بیٹھ کے رب یاد
(محمد حنیف شاکر.....ننکانہ صاحب)

میں آپ سے دور ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے!
آپ کی نظر میں مغرور ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے!
ڈر تو صرف خود سے لگتا ہے
کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں
اس کی بھی ایک وجہ ہے.....!
میں اپنے والدین کی عزت ہوں
اور بہت لاڈوں سے پلی ہوں
اس کی بھی ایک وجہ ہے!
احترام میں ان کا بہت کرتی ہوں
کیونکہ پیدا کیا ہے ماں نے مجھ کو بہت درد سہہ کر
اور پالا ہے باپ نے بہت گرم سرد سہہ کر
میرے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی
انہوں نے جنہیں میں ماں باپ کہتی ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
حیا کا دامن تھامے رکھنا چاہتی ہوں
میں ماں باپ کا سر فخر سے بلند کرنا چاہتی ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
ایک انسان سادہ سی ہوں
اور آسان زندگی جینا چاہتی ہوں.....
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
میں زندگی میں آزادی چاہتی ہوں
پر حدوں میں رہ کر اڑنا بھی جانتی ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
میں روتی ہوں، سسکتی ہوں
مگر دنیا کی ہر بات سمجھتی ہوں
میں سب کچھ چپ چاپ سہتی ہوں
اور کسی سے کچھ نہ کہتی ہوں
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
اس کی بھی کوئی وجہ ہے.....!
(کائنات رشک تنویر.....لاہور)

نظر نظر میں اسی انتظار کی رت ہے
خزاں میں آرزوئے وصل پالتی ہے تو
بہا کے رات بھر آنسو سحر کو ننگے سر
میں جانتا ہوں کسے روز تاکتی ہے تو
میں سوچتا ہوں تیرے من کے پھول کھل جائیں
مگر یہ خواب حقیقت میں ڈھل نہیں سکتے
اگرچہ تیز ہے تیرے غموں کی لو لیکن
یہ ہجر و یاس کے پتھر پگھل نہیں سکتے
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں تیرے دکھوں کا علاج
تیرے غموں کی دوا میری دسترس میں نہیں
یہ بات بس میں ہے میرے صدائیں دیتا ہوں
مگر بہار کا موسم کسی کے بس میں نہیں
چٹک نہ جائے تیرا دل تو بے قرار نہ ہو

تو سوکھی شاخ ہے اتنا بھی سوگوار نہ ہو
کسی ستون کے سینے سے لگ کے جا سو جا
بہار آئے گی جب میں تجھے جاودوں گا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

میں جہاں گرم سفر تھا وہ کوئی صحرا نہ تھا
راہ میں میری ہزاروں پیڑ تھے سایہ نہ تھا
کیا بتائے گا کوئی تعبیر ایسے خواب کی
خواب دیکھا جو دیکھا تھا میں نے خواب وہ پورا نہ تھا
سوچ کا محور وہی ہے جب سے دیکھا تھا اسے
حرکتیں بچوں سی تھیں حالانکہ وہ بوڑھا نہ تھا
میں کہ صدیوں کا تھا پیاسا اور پیاسا ہی رہا
یوں تو وہ برسا تھا لیکن ٹوٹ کر برسا نہ تھا
ہو رہا تھا منعکس جو میرے در و دیوار سے
ایک دن بھی آ کے جو میرے گھر میں ٹھہرا نہ تھا
کون ہوگا سنگ دل ایسا رفیق اس شہر میں
سامنے میرے تھی میری لاش گھر میں رویا نہ تھا
(انتخاب: عبدالجبار رومی انصاری.....قصور)

راہ وفا کی صلیب پہ دو قدم اٹھانے کا شکریہ
بڑا پر خطر تھا یہ راستہ تیرے لوٹ آنے کا شکریہ
جو اداس ہیں تیرے ہجر میں جنہیں بوجھ لگتی ہے زندگی
محفل میں ان کو دیکھ کر تیرا مسکرانے کا شکریہ
تیری یاد کس کس کی بھیس میں میرے شہر سنگم میں ڈھل گئی
یہ کمال تھا تیری یاد کا مجھے یاد آنے کا شکریہ
جو زمانے بھر کا تھا اصول وہ اصول تو نے نبھا دیا
یہ رسم ٹھہرے کی معتبر مجھے بھول جانے کا شکریہ
(رانا زوہیب.....روڈہ تھل، خوشاب)

مجھے دل میں چھوٹا سا ٹھکانہ دے دو
اس دنیا میں جینے کا بہانہ دے دو
دنیا میں محبت کو کردیں گے امر ہم
اک بار ہمیں دل میں جو ٹھکانہ دے دو
نہیں مانگتے تم سے کچھ پیار کے بدلے
بس ایک لمحہ محبت کا سہارا دے دو
ہم تیرے نام کی کیا کریں گے تسبیح
اس زبان کو نام کا جو ترانہ دے دو
سنبھال کے رکھیں گے تجھے اپنے دل میں
ہاتھ اگر اپنا ہمیں جاناں دے دو
بن کے دکھائیں گے ہم عشق میں مجنوں
ایک بار ہمیں جو نام دیوانہ دے دو
(محمد خالد عباس.....ننکانہ صاحب)

ہم پریمیوں کے پریم کی عجب داستان ہوتی ہے
سنتے ہیں محبوب کا ہر شکوہ مگر اپنی خاموش زبان ہوتی ہے
میں کانچ کی وہ گڑیا ہوں جسے تم نے اگر
تھام کے چھوڑا تو ٹوٹ کے بکھر جاؤں گی
ہر گلہ قبول ہے مجھے، ہر شکوہ قبول ہے تیرا
مجھے کوسنے کا میرے محبوب مکمل حق ہے تیرا
مانا کہ پیار میں انسان بھول جاتا ہے ہر ایک بات کو
میں تو تجھ کو بھولا ہوں نہ تیری ذات کو
ایک تو ہے جو کہتی ہے میرا تجھ سے کوئی نہیں ہے رشتہ
ایک میں ہوں جسے تیرے سوا کوئی نہیں ہے دکھتا
کبھی ہزاروں میں بھی تنہا ہوتے ہیں
کبھی اکیلے بھی بے شمار ہوتے ہیں
پاگل، دیوانے، آوارہ، یہ دنیا جن کو کہتی ہے
دراصل آفرین وہ پیار کا شکار ہوتے ہیں
(شاعرہ: رابعہ آفرین.....لاہور)

سنو جان
جدائی موت ہوتی ہے
کبھی فرصت ملے تو دیکھنا پتوں کا گرنا تم
کہ جب وہ شاخ سے گر کر زمین پر آن پڑتے ہیں
تو کیسے روندے جاتے ہیں
کبھی فرقت کے لمحوں میں اکیلی لڑکی کی ہچکیاں سننا
کبھی تم جھنڈ سے بچھڑے پرندوں پر نگاہ ڈالنا
تو پھر تم جان جاؤ گے

جدائی موت ہوتی ہے
سنو جان
ابھی تم نے محبت کے برستے بھیگتے موسم نہیں دیکھے
ابھی تم تتلیاں کے رنگ مٹی میں چھپاتے ہو
ابھی تم مسکراتے ہو
سنو جان
کبھی جب زندگی نے اجنبی ویران راہوں پر
تمہارے نرم ہونٹوں سے تمہاری یہ ہنسی چھینی
تو پھر تم آنسو بہاؤ گے
تم اتنا جان جاؤ گے
جدائی موت ہوتی ہے
(محمد دانیال.....روڈہ تھل خوشاب)

روگ ایسے بھی غم یار سے لگ جاتے ہیں
در سے اٹھتے ہیں دیوار سے لگ جاتے ہیں
عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں
پہلے پہلے ہوس اک آدھ دکان کھولتی ہے
پھر تو بازار کے بازار سے لگ جاتے ہیں
بے بسی بھی کبھی قربت کا سبب بنتی ہے
رو نہ پائیں تو گلے یار سے لگ جاتے ہیں
کترنیں غم کی جو گلیوں میں اڑی پھرتی ہیں
گھر میں لے آؤ تو انبار سے لگ جاتے ہیں
داغ دامن کے ہوں، دل کے ہوں کہ چہرے کے شہزاد
کچھ نشان عمر کی رفتار سے لگ جاتے ہیں
(انتخاب: ڈاکٹر رانا عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

مجھے معاف کر میرے ہم سفر
تجھے چاہنا میری بھول تھی
کیسی راہ اٹھی تھی جو نظر کبھی
تجھے دیکھنا میری بھول تھی
کوئی نظم ہو یا غزل
کہیں رات ہو یا کہیں سحر
وہ گلی گلی وہ شہر شہر
تجھے ڈھونڈنا میری بھول تھی
میرے غم کی کوئی دوا نہیں
مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
میرا کوئی تیرے سوا نہیں
یہ سوچنا میری بھول تھی
(خضر حیات.....خوشاب)

عنا دل کے مضامین، حیلۂ صیاد رہنے دو
نہیں ہے داد کی خواہش مجھے بے داد رہنے دو
نہ پہنچا آسماں تک جو کبھی وہ نالہ دل ہوں
مرا نغموں سے کیا رشتہ مجھے فریاد رہنے دو
مجھے انسانیت کی قبر پر آنسو بہانے میں
اصول و مذہب و قانون سے آزاد رہنے دو
یہی ہے میرا کعبہ اس کو بے دردی سے مت ڈھاؤ
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں کسی کی یاد رہنے دو
نئی تہذیب کے چارہ گرو، میرے مسیحاؤ
مبارک تم کو آبادی، مجھے برباد رہنے دو
امتیاز اردو زباں کے شاعروں میں ہے دھڑے بندی
نہیں موقوف کراچی پر، حیدر آباد رہنے دو
(ایس امتیاز احمد-کراچی)

بستر کرب پہ جب نیند جلائی میں نے
تب کسی خواب کی بنیاد اٹھائی میں نے
زخم ایسے تھے کہ ہر شخص کے آگے رکھے
بات ایسی تھی کہ خود سے بھی چھپائی میں نے
حرمت غم کے لئے خود کو اذیت بخشی
پھر اسی درد سے تسکین بھی پائی میں نے
میں نے زخموں کو کریدا انھیں تازہ رکھا
تب کہیں دشت میں کی نغمہ سرائی میں نے
اپنی کھڑکی سے یونہی خود کو پکارا کل شب
اور پھر خود کو وہ آواز سنائی میں نے
جانے والے سے رگ جان کا بھی رشتہ تھا میر
یہ سمجھنے میں بہت دیر لگائی میں نے
(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

☆☆



دیوتا نگری

شکیل نیازی۔میانوالی

اچانک خوبرو حسینہ کی آواز سنائی دی، صدیوں پہلے جب انسان نے جنگل سے نکل کر بستیاں بنانی شروع کیں اور مصر کے حکمرانوں نے اہرام بنائے تو دیوتا زمین پر آنا کم کردیئے اور پھر......

دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک ماورائی مخلوق کی لرزہ براندام کرتی شاہکار کہانی

وہ کال کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا پتہ نہیں کیوں آج اسے اپنی مرحوم ماں بار بار یاد آرہی تھی حالانکہ اسے اپنی ماں سے زرا بھی محبت نہ تھی وہ چھوٹا تھا تب سے اس کے ڈیڈی ایک کار حادثے میں ہلاک ہوگئے پھر ماں نے ہی اس کی پرورش کی اس کی ماں پڑھی لکھی نہ تھی لیکن بے حد خوب صورت تھی وہ چاہتی تو دوسری شادی کرسکتی تھی لیکن اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت میں دوسری شادی نہ کی اور ایک بار ڈانسر بننا قبول کرلیا اس کا اپنی ماں سے اکثر اس بات پر جھگڑا ہوجاتا تھا کہ وہ اس بار میں کیوں ملازمت کرتی ہے جہاں غلیظ سوچ کے جاہل انسان آتے ہیں اس کے اس سوال پر ماں چپ ہوجاتی وہ چھوٹا تھا اس لئے اس وقت یہ بات نہ سمجھ پایا تھا لیکن بڑا ہونے پر اسے ماں کی مجبوری کی سمجھ آگئی اس کے مہنگے اسکول کی فیس اس کا شاہانہ جیب خرچ فلیٹ کا کرایہ اور زندگی گزارنے کا سامان ایک کم پڑھی لکھی عورت کے لئے صرف بار کی ملازمت سے ہی آسکتا تھا۔

جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اسے حالات کی نزاکت کا اندازہ ہونے لگا تھا لہٰذا اس نے ماں سے وعدہ کیا کہ جب وہ گریجویشن مکمل کرلے گا تو وہ نوکری چھوڑ دے گی اس کی اس بات پر ماں نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا اور سرہلادیا۔

بھولی بھالی ماں شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ بیٹا اس سے بہت محبت کرتا ہے اس لئے اس کی بار کی ملازمت ناپسند کرتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا وہ صرف اس سے ماں کو بار کی ملازمت سے منع کرتا تھا کیونکہ اس کے دوست اسے طعنہ دے کر تنگ کرتے تھے۔

آخر وہ وقت آہی گیا جب وہ گریجویشن کرگیا وہ خوشی خوشی ماں کو یہ بات بتانے کے لئے بار چلا گیا وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا دو آدمی اس کی ماں سے بدتمیزی کررہے تھے اس کی ماں نے ان میں سے ایک کو تھپڑ مارا تو اس نے غصے سے اس کی ماں کے سر پر شراب کی بوتل دے ماری جس کے لگتے ہی وہ زمین پر ڈھیر ہوگئی۔

وہ جلدی سے گھبرا کے ماں کو سنبھالنے لگا ماں کا سر بری طرح سے پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون ابل ابل کر باہر آرہا تھا ماں اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی تھی اس نے ماں کا سر اٹھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا ماں نے اپنے کانپتے ہاتھ سے اپنے گلے سے سرخ رنگ کا لاک اتار کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی۔

”بیٹا اسے رکھ لو جب بھی تم اسے کسی مصیبت میں تھاموگے تو سارس تمہاری مدد کو ضرور آئے......“ ماں نے

اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں وہ کبھی بھی اپنی ماں سے محبت نہیں کر پایا تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کہاں سے اس کے آنسو اس کے گال پر لڑھک آگئے ماں مر گئی اور اس کی تدفین بھی ہو گئی مگر پولیس نے مجرموں کو عارضی طور پر گرفتار کیا اور پھر اس کی ماں کے قتل کو اتفاقی حادثہ قرار دے کر مجرموں کو چھوڑ دیا قانون نے انہیں معاف کر دیا مگر اس نے نہ کیا اس نے چاقو کی مدد سے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور گرفتار ہو گیا چھ ماہ کیس چلا اس کے بعد اسے سزائے موت سنا دی گئی اور آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔

وقت آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور ہر گزرتی گھڑی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں موجود زندگی کی چمک بھی ماند پڑتی جا رہی تھی صبح 4 بجے کے قریب ایک پادری دو پولیس والوں کے ساتھ کوٹھری میں داخل ہوا اس نے سینے سے بائبل لگا رکھی تھی اور گلے میں ایک بڑی سی صلیب لٹکا رکھی تھی۔

''کیسے ہو مارگس بیٹے۔'' پادری نے آتے ہی خوش اخلاقی سے کہا۔

''ٹھیک ہوں فادر اور اب تائم ہی کتنا ہے کہ اپنی حالت پر توجہ دوں۔'' اس کے لہجے میں ہزار جہانوں کی حسرتیں تھیں۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹا تم اس جہان میں اپنی گناہوں کی سزا پا کے پروردگار کے پاس اگلے جہان میں پاک ہو کے جاؤ گے۔'' پادری نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

''گناہ...... اور پاک......'' اس نے دل میں سوچا اور ہنسنے لگا۔

''آپ کو بھی لگتا ہے کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔'' مارگس نے پادری کو مایوسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو بھی کیا وہ اوپر والے اور دنیا کی نظر میں سنگین جرم ہے۔'' پادری نے دھیرے سے کہا۔

''اوپر والے کی نظر میں کون کیسا ہے اس کی بات چھوڑیں فادر آپ یہ کہیں کہ میں نے جو کیا وہ دنیا والوں کی نظر میں جرم ہے۔'' مارگس نے تلخ لہجے میں کہا تو پادری خاموش ہو گیا اور سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا اور اسے لئے شیل سے باہر آگئے وہ اسے لئے مختلف راہداریوں سے گزرنے لگے 5 منٹ بعد وہ اسے لئے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے جہاں بہت سے پولیس افسران کے علاوہ ایک جیوری کے ممبر اور ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک اسٹیچر رکھا ہوا تھا سپاہیوں نے اسے زبردستی اسٹیچر پر لٹا دیا اور اسٹیچر کے ساتھ منسلک چمڑے کے بیلٹوں سے اسے یوں کس کے باندھ دیا کہ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا جیلر یوں بے خبری سے گھڑی دیکھ رہا تھا جیسے اس کا بس چلے تو اسے وقت سے پہلے ہی مار دے۔

''کوئی آخری خواہش......؟'' جیوری کے ممبر نے یوں کہا جیسے خواہش پوچھ کے اس کی سات نسلوں پر احسان کر رہا ہو یہ سن کر مارگس کے ہونٹوں پر حسرت بھری مسکراہٹ ابھر گئی۔

''خواہشیں تو مرتے وقت تک نہیں ختم ہوتیں اور جینے کی خواہش سے بڑی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔'' اس کا دل بولنے کے لئے نہیں چاہ رہا تھا پھر اچانک اسے خیال آیا تو اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔

''میرے گلے میں پڑا لاکٹ اتار کے میرے ہاتھ میں دے دیں۔''

مارگس نے کہا تو جیوری کے ممبر نے سر ہلا کے جیلر کو اشارہ کیا تو جیلر نے سپاہی کو اشارہ کیا سپاہی نے آگے بڑھ کے لاکٹ اس کے گلے سے نکال کر اس کے دائیں ہاتھ میں تھما دیا پھر جیوری ممبر کے اشارے پر سفید کوٹ میں ملبوس نوجوان ڈاکٹر اس کی جانب بڑھی وہ انتہائی حسین لڑکی تھی شاید وہ ابھی ابھی اس شعبے میں آئی تھی مگر اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے مجرم کو ابدی نیند سلانا اس کا روز کا معمول تھا اس جیسی حسین لڑکی کے ہاتھوں مرنا ہر نوجوان لڑکے کی خواہش ہوتی ہے لیکن وہ سب فلمی باتیں ہوتی ہیں کیونکہ جب موت حقیقت میں آتی ہے تو وہ چاہے جتنی بھی

حسین ہو بہت گھناؤنی صورت میں نظر آتی ہے۔

اس نے مارگس کے قریب آتے ہی اس کے بازو کو بے دردی سے پکڑا مارگس کو اپنی موت اس کے ہاتھ میں سرنج کی صورت میں نظر آنے لگی عام لوگوں کی طرح اس کا بھی جینے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ بے بسی کی علامت بنا ہوا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں اپنی ماں کے آخری الفاظ گونجے۔ اس کی ماں نے کسی سے مدد مانگنے کو کہا تھا؟ مگر کس سے وہ نام اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا پھر اچانک اس کے ذہن میں وہ نام آ گیا۔ ''سارس...... میری مدد کرو سارس......'' اس کے ہونٹ ہلے ڈاکٹر اسے حیرت سے دیکھنے ہی لگی تھی کہ کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا آخری احساس اسے یہی ہوا کہ کوئی اسے اٹھائے اونچا اڑ رہا ہے شاید ''موت کا فرشتہ مجھے جہنم میں لے جا رہا ہے۔'' اس نے آخری بار سوچا اس کے بعد اس کے اوسان فنا ہوتے گئے۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ زمین سے تقریباً دس فٹ اوپر اڑ رہا ہے پہلے اسے حیرت ہوئی کہ وہ اڑ کیسے رہا ہے پھر اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ کوئی بڑا پرندہ اسے اڑا رہا ہے اس نے اسے دیکھنے کی ابھی کوشش ہی کی تھی کہ اس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ دھماکے سے زمین پر آن گرا اسے اپنی ایک ایک ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

چند لمحے وہ بے حس و حرکت پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ اٹھنے لگا جیسے ہی وہ سیدھا کھڑا ہونے لگا دوبارہ گر پڑا اسے خود پر غصہ آنے لگا وہ ایک بار پھر زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کا سر چکرایا مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سر کو جھٹکا دیا تو اس کا شعور پوری طرح سے بیدار ہو گیا اس نے دیکھا وہ کسی نامعلوم پہاڑی مقام پر تھا اس کے گرد بڑے بڑے سیاہ پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے آج تک اس نے اتنے سیاہ پہاڑ نہیں دیکھے تھے۔

اس نے سوچا میں تو میکسیکو میں تھا اور مجھے تو سزائے موت دی جا رہی تھی پھر میں یہاں کیسے؟ کہیں میں واقعی جہنم میں تو نہیں آ گیا۔'' اور ایک بار پھر اس کا سر چکرانے لگا اس نے ایک اور جھٹکا سر کو دیا تو چکرا گیا اور ذرا اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا ایک انتہائی خوب صورت نوجوان جو خاصا قد آور تھا اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا اس کے لمبے سنہری بال شانوں سے نیچے تک آ رہے تھے اس کی کمر پر کسی عقاب کی مانند دو بڑے بڑے پر بھی تھے اس کا وجود دمک رہا تھا اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا لباس کیا تھا کسی بادشاہ کی پوشاک محسوس ہو رہا تھا۔

''کون ہو تم؟ اور میں کہاں ہوں؟'' مارگس نے اس سے پوچھا وہ اس سے دس فٹ فاصلے پر کھڑا تھا اسے اپنی آواز پہاڑوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اس مد مقابل نے اسے کوئی بھی جواب نہ دیا اور مسلسل اسے دیکھتا رہا۔

''کیا تم مجھے سن رہے ہو، میں نے پوچھا تم کون ہو؟'' مارگس نے اس بار اونچی آواز میں پوچھا۔ تو سامنے والے کے ہونٹ ہلے اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''سارس......'' اس کا نام سن کر وہ حیران رہ گیا اگر وہ واقعی میں سارس تھا تو یعنی میری ماں کو اس کے بارے میں علم تھا لیکن ابھی بھی میرے ذہن میں بہت سارے سوالات تھے۔

''لیکن میں یہاں کیسے پہنچا مجھے تو سزائے موت دی جا رہی تھی پھر اچانک دھماکہ ہوا اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔'' اس نے سر تھامتے ہوئے کہا۔

''وہ بلاسٹ کی آواز نہیں تھی وہ جیل کی عمارت گرنے کی آواز تھی۔'' سارس نے اسی مخصوص لہجے میں کہا۔

''لیکن یوں یک دم عمارت کیسے گری؟'' مارگس نے حیران ہو کے پوچھا۔

''میں نے اپنے پروں کی مدد سے عمارت کو کاٹ کے رکھ دیا اور تمہیں لے کر باہر نکل آیا۔'' سارس نے کہا۔

''لیکن تم نے عمارت کیسے گرائی اور مجھے یوں لے کر نکلتے وقت کیا تمہیں کسی نے نہیں دیکھا۔''

''تم باتیں بہت کرتے ہو لڑکے۔'' سارس نے اس بار سخت لہجے میں کہا تو مارگس دب گیا لیکن

پھر فوراً ہی بولا۔

"ایک آخری سوال آخر تم ہو کیا چیز کیوں کہ آج تک میں نے تمہاری نسل کا انسان نہیں دیکھا اس لئے معلومات کے اضافے کیلئے پوچھ رہا ہوں۔" مارگس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے کبھی دیوتاؤں کا نام سنا ہے......؟" سارس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں یونانی کہانیوں اور دیو مالائی قصوں میں اکثر ان کے بارے میں پڑھا ہے۔" مارگس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک دیوتا ہوں دیوتا سارس! زیوس کا بیٹا۔" سارس نے اسے گھور کے کہا۔

"ک......ک......کیا تم ایک دیوتا ہو یعنی وہ سب کہانیاں جو میں نے پڑھ رکھی ہیں وہ سب سچ ہیں۔" مارگس نے گھبرا کے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ ہمارے بارے میں مشہور تمام باتیں سچ ہیں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو سراسر جھوٹ کے طور پر پھیلائی گئی ہیں مثلاً لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بہت سے ایسے کام ہیں جو ہمارے بس سے باہر ہیں۔"

"کسی سزائے موت کے قیدی کو عین اس کی موت کے وقت یوں سب کے سامنے سے لے جانے سے زیادہ ناممکن کام اور کیا ہو سکتا ہے۔" مارگس نے ڈرتے ہوئے کہا کیونکہ اب آہستہ آہستہ اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔

"تم نے بہت غلط کیا مجھے وہاں سے نکال کے اب تمام شہروں میں مجھے وانٹڈ قرار دے کر میری گرفتاری کے لئے چھاپے مارے جا رہے ہوں گے اب تو وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔" مارگس نے پریشان ہو کر کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو اول تو تم اپنی دنیا سے بہت دور دیوتاؤں کی دنیا میں ہو دوسری بات میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے پوری جیل کو تباہ کر دیا تھا وہاں بہت سی ہلاکتیں ہوئیں اور لاشیں ناقابل شناخت ہیں اس لئے اب تم دنیا کی نظر میں مر چکے ہو۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور مارگس کے پاس سے جانے لگا۔

"ارے ارے......رکو تو سہی تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے مجھے کیوں بچایا۔" مارگس نے اسے جاتے دیکھا تو گھبرا کے کہا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ تم نے خود ہی مجھے پکارا تھا۔"

"تو کیا......؟ تم اپنے ہر پکارنے والے کی مدد کرتے ہو۔؟"

"ہر گز نہیں صرف تمہاری کی تھی کیونکہ تمہارے پاس میری ایک خاص چیز ہے۔" سارس نے مڑ کر اس کے گلے میں موجود لاکٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو یہ لاکٹ تمہارا ہے مگر میری ماں کا تم سے کیا رشتہ تھا وہ تمہیں کیسے جانتی تھیں؟" مارگس نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ کیونکہ سارس کے چلنے کی رفتار اب تیز تھی۔ "وہ میری بہن تھی۔"

"کیا......؟" مارگس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

"تم رک کیوں گئے چلو شام ہونے والی ہے اور اندھیرا پھیلتے ہی رات کے درندے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکل آتے ہیں۔" سارس کے منہ سے درندوں کا نام سن کر مارگس کو ہوش آیا اور وہ اس کے ساتھ دوڑنے لگا کیونکہ اب سارس بھی دوڑ رہا تھا پھر اچانک سارس نے اپنے پر سکیڑے اور اسے اپنے آہنی ہاتھوں سے پکڑا تو مارگس کے منہ سے بے اختیار چیخ سی نکل گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے سارس اسے لئے فضا میں بلند ہو گیا۔

مارگس کا وجود ہوا کے تیز تھپیڑوں سے چھلنی ہوتا ہوا محسوس ہوا اسے نیچے کا منظر نہیں دکھائی دے رہا تھا کیونکہ سارس کی پرواز بادلوں کے اوپر تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گا کیونکہ ہوا کا دباؤ اب ناقابل برداشت ہونے لگا تھا اس پہ اب غنودگی طاری ہونے لگی پھر کچھ دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا کہ ہوا کا دباؤ کچھ کم ہو رہا ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارس کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی اور

ساتھ ساتھ مارگس کو بلندی بھی کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر مارگس نے آنکھیں کھولیں تو اسے دس فٹ نیچے سرسبز زمین دکھائی دینے لگی اس کے ساتھ ہی سارس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ گھومتا ہوا پشت کے بل زمین پر آن گرا اور درد سے بل کھا کے رہ گیا لیکن چوٹیں اس بار اتنی زیادہ نہیں لگی تھیں کیونکہ وہ اس بار گھاس پر گرا تھا۔

"کیا کسی انسان کو زمین پر اتارنے کا اس سے بہتر طریقہ تمہارے پاس نہیں ہے۔" مارگس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"بے فکر رہو تم جس جگہ آئے ہو یہاں تمہیں انسان اور انسانیت کی قدر کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا۔" سارس نے کہا اور ایک جانب چل پڑا مارگس نے دیکھا وہ جس جانب چل کے جا رہا تھا وہ سفید پتھروں سے بنا ایک عظیم والشان محل تھا وہ محل بے تحاشہ بڑا تھا اور اتنا خوب صورت کے الفاظ میں بیان ناممکن تھا اس نے اپنی آنکھ سے تو کیا اپنے کانوں سے بھی اتنے بڑے محل کے بارے میں نہیں سنا تھا وہ سحر انگیز حالت میں اس محل کو دیکھتا ہوا سارس کے پیچھے چلنے لگا محل دور سے ہی بہت بڑا نظر آ رہا تھا نزدیک جانے پر نظروں سے اس کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہ تھا وہ جب اس محل کے دروازے پر پہنچے تو دروازے کو دیکھ کے مارگس کی حیرت دو چند ہو گئی دروازہ کیا تھا ایک عظیم فولادی گیٹ جس کے اوپر سیسہ پگھلا کے ڈالا گیا تھا اس لئے وہ گیٹ دیکھنے میں اسٹیل کی طرح چمکدار نظر آتا تھا مارگس نے دیکھا گیٹ پر دو سو کے قریب انسان چمکدار سیاہ فولادی لباس میں ملبوس کھڑے تھے ان کی کمر کے ساتھ تلواریں لٹک رہی تھیں اور ہاتھوں میں بھالے تھے۔ انہوں نے چہرے پر فولادی خود پرانے زمانے کا جنگی ہیلمٹ جو فوجی لڑائی کے دوران کیا کرتے تھے پہن رکھے تھے جس کی وجہ سے مارگس ان کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا انہوں نے سارس کو دیکھتے ہی سر جھکایا جیسے وہ ان کے لئے کوئی بڑا مقام رکھتا ہو سارس انہیں دیکھے بنا چلتا رہا مارگس بھی اس کے پیچھے تھا مارگس نے دیکھا وہ تمام لوگ اسے گھور رہے تھے سارس اس سے چھے ساتھ قدم کے فاصلے پر تھا وہ مختلف راہداریوں سے گزر رہے تھے راہداریوں کی دیواروں میں بڑی بڑی مشعلیں جل رہی تھیں جس کی وجہ سے وہاں دن کا سماں تھا اسی طرح وہ چلتے چلتے ایک عظیم ہال میں جا پہنچے جس کی اونچی چھت سے بھاری بھرکم فانوس لٹک رہے تھے اور پھر مارگس وہاں کا ماحول دیکھتے ہی دنگ رہ گیا اور اس کے سینے کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی بادشاہ کے دربار میں آ گیا ہو اس عظیم ہال کی دیواروں کے ساتھ سونے سے بنی بڑی بڑی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں فرش پر انتہائی قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر کی گئی مینا کاری دیکھ کر یوں لگتا تھا شاید وہ اس دنیا میں تیار ہوا ہی نہیں لیکن مارگس کی توجہ اس وقت قالین پر نہیں اپنے بالکل سامنے بیٹھے آدمی پر تھی وہ آدمی ایک جہازی سائز کے تخت پر بیٹھا تھا سونے کے تخت پر ہیرے جواہرات جڑے تھے اس آدمی کی سحر کا اندازہ لگانا مشکل تھا وہ دیکھنے میں بالکل سارس جیسا دکھتا تھا اس کے سر پر بڑا تاج تھا جس میں لگے ہیرے کسی بلب کی طرح چمک رہے تھے اس آدمی کے بال اور داڑھی بڑی تھی لیکن سفید رنگ کی تھی مگر وہ صحت میں کسی بھی طرح سارس سے کم نظر نہیں آ رہا تھا۔

"سارس......" اس آدمی نے ایسی آواز میں دھاڑ کر کے کہا کہ ہال میں موجود ہر چیز لرز گئی خود مارگس خوف سے کانپ کے رہ گیا اور پھر اس نے دیکھا سارس نے گھٹنوں کے بل کے بیٹھ کے اپنے ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں زمین پر لگا دیں۔

"سارس تم نے حکم عدولی کی ہے۔" تخت پر بیٹھے آدمی نے گرجدار آواز میں کہا۔

"مانتا ہوں دیوتاؤں کے دیوتا مگر میں مجبور تھا۔" سارس کی آواز سنائی دی مگر اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

"مجبور......تم جانتے ہو سارس ایک دیوتا کبھی کسی بات کے لئے مجبور نہیں ہوتا۔" اس بار آواز پہلے سے زیادہ تیز تھی۔

"آپ جانتے ہیں میں اپنی بہن سے کتنا پیار کرتا تھا اس کی اکلوتی اولاد کے پکارنے پر مجھے مجبوراً جانا

پڑا۔" سارس نے آہستہ سے کہا۔

"تم جانتے ہو ہم دیوتاؤں نے صدیوں سے زمین پر جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ زمین اب پاک نہیں رہی ہر طرف نفرت اور حسد میں سلگتے انسان ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں اس لئے ہمارا زمین سے کوئی لینا دینا نہیں اور تم نے وہاں جاکے نہ صرف میری نافرمانی کی ہے بلکہ قدرت کے قانون کو بھی پلٹنے کی کوشش کی ہے جو بہت بڑا جرم ہے۔"

"میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں۔" سارس نے جھکے سر کو مزید جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں کچھ عرض کرسکتی ہوں۔" ہال میں ایک نسوانی آواز گونجی مارگس نے چونک کے آواز کی سمت دیکھا دیوار کے ساتھ موجود کرسی پر ایک انتہائی خوب صورت عورت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کا جسم چاندی سے بنا محسوس ہو رہا تھا سیاہ بال کمر سے نیچے تک آرہے تھے اس کے دو عدد پر تھے مگر وہ سفید رنگ کے تھے اس نے لباس بھی سفید رنگ کا پہن رکھا تھا جس میں سے اتنی تیز روشنی خارج ہو رہی تھی کہ اس پر نظر ٹکانا مشکل کام تھا مارگس اس سے مرعوب ہوئے بنا نہ رہ سکا بے شک وہ دنیا کی سب سے حسین عورت تھی۔

"تم بول سکتی ہو...... بولو اپنے شوہر کے بارے میں کوئی ایک صفائی دو کہ میں اس کو بخش دوں۔" تخت پر بیٹھے زیوس نے کہا۔

"آپ نے غور نہیں کیا دیوتا زیوس سارس کے ساتھ کھڑے اس لڑکے کے گلے میں سارس کا ہی دیا لاکٹ ہے جو ضرور اس کی چالاک ماں نے اسے دیا ہوگا تاکہ یہ جب کسی بھی مصیبت میں پڑے تو اسے پکار لے آپ اچھی طرح جانتے ہیں آپ کا بیٹا سارس کتنا نرم دل ہے اور پھر جب اس کا لاکٹ اس لڑکے کے پاس تھا اور اس کے پکارنے پر پہنچنا ایک طرح سے سارس کی مجبوری بن گئی تھی۔"

"مگر......" زیوس نے کچھ کہنا چاہا۔

"مگر نہیں...... اگر آپ سزا دینا ہی چاہتے ہیں تو اس لڑکے کو دیں کیونکہ اس نے ہی سارس کو بلا کے بہکایا ہے اگر یہ سارس کو آواز نہ دیتا تو سارس کبھی بھی زمین پر نہ جاتا۔" اس عورت نے کمال کی ہوشیاری دکھاتے ہوئے سارے الزام کا ملبہ مارگس پر ڈالتے ہوئے کہا تو پہلی بار زیوس نے اسے قہر برساتی نظروں سے گھورا اور مارگس کو زمین اپنے پیروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیا تم نے ہی سارس کو آواز دی تھی لڑکے......؟" زیوس نے گرج کے کہا۔

"جی میں نے ہی دی تھی مگر......"

"مگر مگر کو چھوڑو آواز دی تھی کہ نہیں۔" عورت کی چلاتی آواز اسے اپنا دل چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"جی......" مارگس نے نظریں جھکا کر کانپ کے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے اس گنہگار کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک ہم اس کے بارے میں مناسب سزا نہیں تجویز کرتے۔" زیوس نے کہا تو دو سپاہی آگے بڑھے انہوں نے مارگس کو سختی سے دبوچا اور اسے اس ہال سے لے کر ایک انجان راستے کی جانب اس گیلری کے اختتام پر سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں وہ اسے لے کر نیچے اترنے لگے اور وہ بھی ان کے ساتھ چپ چاپ چلتا رہا بنا کوئی مزاحمت کئے کیونکہ آج صبح سے جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اس کے بعد اس میں ہمت ہی نہیں بچی تھی وہ جس تہہ خانہ میں اترے اس نے دیکھا وہ بہت ساری جیل کی مانند بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ سپاہیوں نے ایک خالی بیرک میں اسے بے رحمی سے دھکیلا اور سلاخوں سے بنا چھوٹا سا دروازہ بند کر دیا اور پھر دونوں سپاہی وہاں سے چلے گئے تو مارگس نے اس کوٹھری کا جائزہ لیا اس کی دیواریں تراشے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی تھیں سامنے وہی چھوٹا سا دروازہ تھا جبکہ کوٹھری کی پچھلی دیوار پر ایک فٹ کا سوراخ تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اگر سلاخیں نا بھی لگی ہوتیں پھر بھی اس سے نکلنا ناممکن تھا ایک تو وہ سوراخ ایک آدمی کے گزرنے کے لئے ناکافی تھا وہ سطح زمین سے دس فٹ اونچا تھا لہٰذا وہاں سے باہر جھانکنا بھی ناممکن تھا دیواروں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے فرش کی جانب دیکھا فرش پر گھاس سوکھی ہوئی پڑی تھی وہاں پر روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا روشن دان کے نام پر جو سوراخ تھا وہاں سے آنے والی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا مارگس تھک کے بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگالی اور صبح سے

پیش آنے والے حالات پر ایک دفعہ اس نے غور کیا تو اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔

صبح اس نے موت کو جتنا قریب سے دیکھا تھا اسے اپنے بچنے کی کوئی بھی امید نظر نہیں آرہی تھی اور پھر اس نے سارس کو پکارا پھر وہ آیا اور اسے دیوتاؤں کی اس دنیا میں لے گیا اس بات کا مارگس کو اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ وہ اپنی دنیا سے بہت دور ہے کیوں کہ یہاں کے پہاڑ درخت پھر دیوتاؤں کا یہ عظیم محل اس کے بعد یہاں کے رہنے والے انسانوں کے اطوار دیکھ کر تو کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنی دنیا میں نہیں ہے اسے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ تخت پر بیٹھے آدمی کا نام زیوس تھا سارس اس کا بیٹا تھا اور وہ عورت سارس کی بیوی تھی اس نے ہی سارس کو بچانے کے لئے اسے ذمہ دار قرار دے دیا یعنی یوں دیوتاؤں کو پکارنا بھی گناہ بن گیا تھا حالانکہ جب اس نے سارس کو پکارا تھا اس وقت اسے قطعی اس بات کا یقین نہ تھا کہ اسے بچانے کے لئے واقعی سارس آجائے گا اس نے تو اس وقت اسے سارس کو پکارا تھا جیسے ڈوبنے والا تنکے کا سہارا لیتا ہے لیکن یہاں تو اسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا اس کے بارے میں وہ جتنا سوچتا اتنا الجھ جاتا تھا کیا واقعی اس کی ماں سارس کی بہن تھی اگر وہ سارس کی بہن تھی تو لازمی بات ہے دیوتا زیوس اس کا باپ تھا مگر اس نے بچپن سے اپنی ماں کو ایک عام عورت کی طرح پایا تھا، نہ تو وہ کہیں سے اسے دیویوں جیسی لگی تا کوئی اور غیر معمولی صلاحیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پر نہیں تھے جو تمام دیوتاؤں کا خاصا ہوتے ہیں تو کیا کہیں یہ سب لوگ غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہیں مگر اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو پھر ماں نے اسے مرتے وقت یہ لاکٹ کیوں دیا یعنی اگر وہ واقعی میں سارس کی بہن نہیں بھی تھی تو اسے جانتی ضرور تھی اور اتنا اچھی طرح جانتی تھی کہ سارس کا لاکٹ بھی اس کے پاس تھا مارگس نے لاکٹ ہاتھ میں پکڑ کر اسے دیکھتے ہوئے سوچا وہ لاکٹ دیکھنے میں ایک عام پتھر سے بنا سستا سا نظر آتا تھا لیکن اس نے بھی اس نے ہی اس کی جان بچائی تھی اس لئے اس نے دوبارہ اسے گلے میں ڈال لیا تھا کہ انہوں نے اس سے لاکٹ واپس نہیں لیا تھا لیکن وہ سب باتیں ایک جانب مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا کیونکہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکا تھا۔

زیوس نے کہا تھا وہ اس کے لئے مناسب سزا تجویز کریں گے اگر واقعی میں وہ اسے سزا دیں گے تو کون سی دیں گے؟ یہ باتیں سوچتے سوچتے نا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ہوتے ہی پہریدار آئے اور بڑے تھالوں میں رکھا کھانا بانٹنے لگے سب قیدی اپنی اپنی بیرکوں میں کھانا کھا رہے تھے مگر مارگس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا یہ بات نہیں تھی کہ اسے بھوک نہیں لگی تھی بس اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ بھی کھانے کو وہ دیوار سے ٹیک لگائے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

"کھانا کھالو لڑکے کیوں کہ کھانا نہیں کھاؤ گے تو کمزور ہو جاؤ گے اور ان سلاخوں اور دیوار کو توڑ کے وہی باہر آتا ہے جس میں طاقت ہو۔" مارگس نے چونک کے آواز کی سمت دیکھا تو اسے سامنے والی کوٹھری میں ایک آدمی لیٹا ہوا نظر آیا اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھا ہوا تھا وہ کوٹھری اس کی کوٹھری سے بامشکل سات فٹ دور تھی۔

"تم کون ہو؟" مارگس نے اٹھ کے سلاخوں کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"نام میں کیا رکھا ہے انسان کو مضبوط ہونا چاہئے۔ تاکہ کوئی تمہیں چوہا نہ کہے۔" اس آدمی نے اپنی پوزیشن تبدیل کئے بنا ہی کہا۔

"جو کسی پنجرے میں قید ہو پھر وہ شیر ہو یا چوہا کوئی فرق نہیں پڑتا۔" مارگس نے ہاتھ سلاخوں پر رکھتے ہوئے کہا تو اس آدمی نے اپنا بازو آنکھوں سے ہٹایا اور اٹھ کے بیٹھ گیا مارگس نے دیکھا وہ آدمی خوش شکل نوجوان تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔" اس نے مارگس سے پوچھا۔

"مارگس۔" اس نے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر گئی۔

"کس جرم میں یہاں آئے ہو؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"سارس کو پکارنے کے جرم میں۔" مارگس نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"تم نے کون سا گناہ کیا ہے جو یہاں پڑے ہو؟" مارگس نے پوچھا۔

"میرے گناہوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اچھا تم یہاں کب سے ہو؟"

"اب تو گنتی بھی بھول گیا ہوں۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"تب تم زیوس اور اس کے خاندان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوگے۔" مارگس نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں اتنا ہی ان کے بارے میں جانتا ہوں جتنا وہ خود اپنے بارے میں جانتے ہیں۔"

"تو پھر کچھ بتاؤ نا ان کے بارے میں۔" مارگس نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں ان کے بارے میں؟" اس نوجوان نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ۔"

"اچھا تو پھر سنو زیوس دیوتاؤں کا دیوتا ہے اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ تین بیٹوں میں سے بڑے بیٹے سپارس سے تم مل ہی چکے ہوگے اس کے بعد والے بیٹے کا نام تھیسیس ہے لوگ اسے موت کا دیوتا بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بڑا ہی بے رحم اور خونخوار ہے، اس کے بعد والے تیسرے بیٹے کا نام تائیرس ہے جسے لوگ رحم کا دیوتا قرار دیتے ہیں اور سب سے آخر میں اس کی بیٹی علنا تھی جسے لوگ محبت کی دیوی کہتے تھے۔"

"بیٹی تھی کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب نہیں رہی؟" مارگس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں تمہیں یہاں دیکھ کر تو کم از کم مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔" اس نے حسرت سے مارگس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا اس کے جینے مرنے سے کیا تعلق؟" مارگس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تم علنا کے بیٹے ہو دیکھنے میں بھی بالکل اس جیسے ہو پھر اسے مارگس نام بہت پسند تھا وہ چاہتی تھی کہ اس کا ایک بیٹا ہو جس کا نام وہ مارگس رکھے۔"

"م...... مم...... مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟" مارگس نے حیران ہو کر کہا۔

"اسے چھوڑو میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔"

"دیوتاؤں اور دیویوں کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں یہ ہزاروں سال جیتے ہیں شروع شروع میں جب انسان زمین پر پہاڑوں سے نکل کے کھیتی باڑی کرنے لگے تو دیوتا اس سے پہلے زمین پر سیر اور شکار کی غرض سے جایا کرتے تھے مگر جب انسانوں نے انہیں دیکھا تو وہ دیوتاؤں سے خوف زدہ ہوگئے اور ڈر کے مارے ان کی عبادت کرنے لگے دیوتاؤں کو یہ بات ناگوار گزری کیوں کہ وہ خود کو خدا نہیں مانتے تھے وہ تو خود خدا کی بنائی ایک مخلوق تھے دیوتاؤں کو اس بات پر غصہ آیا اور انہوں نے انسانوں کی بہت ساری بستیاں اجاڑ دیں دیوتاؤں نے سمجھا ایسا کرنے سے وہ ان کی پوجا کرنے سے باز آجائیں گے مگر لوگوں نے مارے ڈر کے ان کی عبادت اور زیادہ کردی جسے دیکھ کر دیوتا دلبرداشتہ ہوگئے اور انہوں نے زمین پر آنا چھوڑ دیا پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا انسان مہذب ہوگیا اور اسے صحیح اور حقیقی خدا کا علم ہوگیا تو پھر دیوتاؤں نے آہستہ آہستہ زمین پر آنا شروع کردیا مگر زیوس اب بھی زمین پر نہیں آئے تھے پھر ایک تمہاری ماں زمین پر گئی تو اس نے دیکھا ایک نوجوان پورا دن کام کرتا ہے اور جو پیسے اسے ملتے ہیں وہ ان سب کا غریبوں کو کھانا کھلا دیتا ہے یہ دیکھ کر تمہاری ماں کو وہ نوجوان سب سے اچھا لگا اور وہ اس سے محبت کرنے لگی علنا اس سے ایک عام لڑکی کی صورت میں ملنے لگی اور پھر وہ نوجوان بھی تمہاری ماں علنا سے محبت کرنے لگا اس بات کا جب زیوس کو علم ہوا تو وہ بہت غضب ناک ہوگیا اس نے علنا کو سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا زیوس علنا کو اپنی اولاد سے سب سے زیادہ چاہتا تھا لیکن جب علنا نے اس کی ایک نہ سنی تو زیوس نے اپنے پدری جذبات کو کچل کے انتہائی فیصلہ کیا۔"

"کیسا فیصلہ؟" مارگس نے بے تابی سے پوچھا۔

"اسے سزا دینے کا فیصلہ اس نے علنا کے پر کاٹ دیئے اور اسے یہاں قید کرلیا وہ روتی رہی مگر زیوس نے اپنا دل سخت کرلیا اور اس کے رونے پر کوئی اثر نہ لیا زیوس نے اپنا دل سخت کرلیا مگر اس کے بیٹے تائیرس یہ سب برداشت نہ کرسکا کیونکہ وہ رحم دل دیوتا تھا اس نے اپنی بہن کو چپکے سے آزاد کرلیا اور زمین پر چھوڑ آیا جب یہ بات زیوس کو پتہ چلی تو اسے بے انتہا غصہ آیا اس نے علنا کو تو چھوڑ دیا مگر اپنے چھوٹے بیٹے کو معاف نہ کیا اس نے تائیرس کے بھی دونوں پر کاٹ دیئے اور اسے ہمیشہ کے لئے قید کردیا۔"

"مگر یہ تمام باتیں تم اتنی تفصیل سے کیسے جانتے ہو؟" مارگس نے حیران ہو کے کہا۔

"کیونکہ میں ہی زیوس کا چھوٹا بیٹا تائیرس ہوں۔" نوجوان نے کہا تو چند لمحے مارگس نے اسے حیرت سے دیکھتا رہا پھر یک دم قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔

"مذاق اچھا کرلیتے ہو۔" مارگس نے ہنستے ہوئے کہا تو نوجوان کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی وہ یک دم اٹھا اور سلاخوں کو پکڑ کر زور لگانے لگا اور سلاخیں کسی موم کی مانند ٹیڑھی ہوتی گئیں پھر وہ اتنی ٹیڑھی ہوگئیں کہ وہ آسانی سے اس خلاء میں سے گزر آیا اور مارگس کی جانب بڑھا تو مارگس خوف کے مارے پیچھے دیوار سے جا لگا اس نے مارگس کی کوٹھری کی سلاخوں کو بھی اپنے ہاتھوں کی طاقت سے ٹیڑھا کیا اور اندر گھس آیا اس نے مارگس کا دونوں ہاتھوں سے گریبان پکڑا اور اوپر اٹھا لیا۔

"میرے پر ضرور کٹ گئے ہیں مگر مجھ میں اب بھی دیوتاؤں والی طاقت موجود ہے اور ایک دیوتا میں ہزار انسانوں جیسی طاقت ہوتی ہے بے وقوف لڑکے۔" تائیرس نے غرا کر کہا۔

"اگر تم علنا کے بیٹے نہیں ہوتے تو میں نے ابھی اور اسی وقت تمہارا سر چھوڑ دینا تھا اپنے ہاتھوں سے۔" تائیرس نے کہا اور پھر یک دم اسے چھوڑ دیا مارگس زمین پر گر گیا اور بری طرح سے کھانسنے لگا اس کا چہرہ سانس رکنے کی وجہ سے سرخ ہوچکا تھا تائیرس اسے چھوڑ کے باہر نکلا اور اس کی کوٹھری کی سلاخیں برابر کرکے اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور اپنی کوٹھری کی سلاخیں بھی دوبارہ سیدھی کردیں۔

"بڑی عجیب بات ہے جب تم اس طرح سلاخیں ٹیڑھی کرکے باہر آسکتے ہو تو پھر اس جہنم میں رہ کیوں رہے ہو بھاگ کیوں نہیں جاتے۔" مارگس نے گلا مسلتے ہوئے کہا۔

"تم ایک واقعی بے وقوف لڑکے ہو بھلا میں یہاں سے باہر نکل کے کہاں جاسکتا ہوں۔" تائیرس منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم امریکا جاسکتے ہو مانا یہاں سے تھوڑا دور ہوگا مگر تم ہمت کرو تو جاسکتے ہو۔" مارگس نے ہانپتے ہوئے کہا کیوں کہ ابھی تک اس کی سانس ٹھیک طور پر بحال نہیں ہوئی تھی اس کی بات سن کر تائیرس طنزیہ انداز میں ہنس پڑا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے یہ تمہاری دنیا ہے دیوتاؤں کی دنیا ہے اس دنیا کا تمہاری دنیا سے کوئی تعلق نہیں اس وقت تم جس دنیا میں موجود ہو یہ دنیا تمہاری زمین سے بہت دور ایک سیارے پر واقع ہے یہاں صرف اور صرف دیوتاؤں کا راج چلتا ہے پھر بھی میں یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچتا اگر میرے پر ہوتے۔" تائیرس نے بات کے آخر میں حسرت سے کہا۔ اور خاموش ہوگیا جبکہ مارگس اس کی تمام باتوں پر غور کرنے لگا۔

☆......☆......☆

دن گزرتے گئے اور پتہ ہی نہ چلا کب ایک سال گزر گیا اس ایک سال میں مارگس کے سر کے بال اور داڑھی بے تحاشہ بڑھ گئے تھے یہاں نہانے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اسنے ابھی تک وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو اس نے جیل میں آخری دن پہنے ہوئے تھے وہ سفید کپڑے پھٹ کے چیتھڑوں کی شکل میں اس کے وجود پر جھول رہے تھے اس دوران اس کی تائیرس سے دوستی تو نہ ہوئی مگر اچھی گپ شپ ضرور ہوگئی اور اسے دیوتاؤں کے بارے میں اور بہت سی باتیں معلوم ہوتیں مثلاً دیوتاؤں کی عمریں ہزاروں سال پر محیط ہوتی ہیں وہ اڑ سکتے ہیں پانی اور خلاء میں بھی سانس لے سکتے ہیں ان میں سینکڑوں گھوڑوں کی طاقت ہوتی ہے ان کی نظر کسی عقاب کی طرح تیز چیتے جیسی پھرتی اور شیر کی مانند حملہ کرنے کی اہلیت موجود ہوتی ہے اب اسے مکمل

طور پر اپنی ماں کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ کیوں جب وہ چھوٹا تھا اس وقت اور اس کے جوان ہونے تک اس کی ماں ویسی کی ویسی رہی جیسے تیس سال کی ہو یہ بات اکثر لوگ ان سے کہتے تھے خود مارگس کے دوست بھی اس سے کہتے تھے کہ یہ تمہاری ماں تو کم از کم نہیں لگتیں مگر اس کی ماں مسکرا کے صرف اتنا ہی کہتی دیکھنے میں ٹھیک ہوں مگر اب وجود میں پہلی جیسی طاقت نہیں رہی یہ جھوٹ شاید وہ اپنا راز چھپانے کیلئے کہتی تھی بحرحال جو بھی تھا مارگس اس بے جرم کی قید سے بے حد تنگ تھا وہ کسی نہ کسی طریقے سے یہاں سے نکلنے کے طریقے ڈھونڈتا رہتا تھا آخر اس سلسلے میں نے ٹائیرس سے بات کی۔

"میں اس جہنم میں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"اس جنت کو جہنم کہہ کر اس کی توہین مت کر لڑکے۔" ٹائیرس نے مسکرا کے کہا۔

"جنت یہ تمہارے لئے ہوگی میرے لئے ہرگز نہیں میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔" مارگس نے پریشانی کے عالم میں کہا تو ٹائیرس سوچ میں پڑ گیا۔

"نہیں یہاں سے باہر جانے کا سوچنا بھی مت اور نا ہی میں تمہیں کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے دوں گا سمجھے۔" ٹائیرس نے سختی سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا رحم کے دیوتا کیا اس قید میں رہ کہ تمہاری ترجیحات بدل گئی ہیں یا مجھے یہاں سے نہ جانے دینے میں تمہارا کوئی اور فائدہ ہے۔" مارگس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"دیکھو لڑکے تم یہاں سے نکلنے پر بھی اپنی دنیا میں نہیں لوٹ پاؤ گے تو پھر یہاں سے باہر نکلنے کا کیا فائدہ جس میں جان جانے کا اندیشہ ہو۔"

"کیونکہ میں نہانا چاہتا ہوں میرا وجود تو دیکھو کسی گندگی کے ڈھیر سے کم نہیں لگ رہا۔" مارگس نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو ہو تو یہ بات ہے؟" ٹائیرس نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں یہاں سے نکالتا ہوں اس محل کے پیچھے سینکڑوں تالاب ہیں تم آرام سے وہاں نہا سکتے ہو مگر ایک بات کان کھول کے سن لو کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے سمجھے۔"

ٹائیرس نے کہا تو مارگس نے سر ہلا دیا۔ شام کا کھانا پہریدار دے کہ جیسے ہی لوٹا تو ٹائیرس نے بنا آواز پیدا کیے کوٹھری کی سلاخیں ٹیڑھی کرنے کے بعد اس کی کوٹھری کی سلاخیں بھی ٹیڑھی کیں پھر اس میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ مارگس باہر نکل آیا۔

"تمہیں یاد ہے نا میں نے کیا کہا ہے؟" ٹائیرس نے پوچھا۔

"ہاں......" مارگس نے اتنا ہی کہا کہ ٹائیرس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"شی شی یاد ہے...... آواز دھیرے رکھو بے وقوف۔"

ٹائیر نے اسے ڈپٹ کے کہا تو مارگس نے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ تہہ خانے سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا کہ اچانک اسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ وہیں سیڑھیوں پر دبک کے بیٹھ گیا اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیونکہ اب چاپ کے ساتھ ساتھ ایک سایہ بھی دکھائی دینے لگا وہ سایہ جوں جوں قریب آتا گیا مارگس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی لیکن اس سے پہلے کہ آنے والے کی نظر اس پر پڑتی وہ یک دم پلٹ گیا جیسا سے کوئی بات یاد آ گئی ہو اس کے جاتے ہی مارگس نے سکون کا سانس لیا اور چند لمحے وہیں دبکا رہا اور پھر احتیاط سے آگے بڑھنے لگا محل کے تمام راستے بھول بھلیاں تھے مگر ٹائیرس نے اسے ایک ایک راستہ اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا تھا اس لئے اسے راستہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی مسئلہ تھا تو پہریداروں کی نظر سے بچنے کا وہ اس طرح سے بچتے بچاتے محل سے باہر نکل آیا۔

رات کا اندھیرا پوری طرح سے چھا چکا تھا آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا چاند نہیں نکلا تھا اس لئے وہاں کافی اندھیرا تھا اس لئے وہ آرام آرام سے آگے بڑھ رہا تھا اب اسے تھوڑے فاصلے پر پانی کے چشمے دکھائی دینے لگے پانی بے حد شفاف تھا اس لئے وہ بہت خوب صورتی سے آسمان کا

عکس چرا رہا تھا مارگس اس حسین نظارے میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک اسے اپنی پشت پہ تیز روشنی محسوس ہوئی تو وہ فوراً ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ گیا اس نے دیکھا محل کی چھت پر کوئی دیوتا کھڑا تھا جس کے سفید پروں سے تیز روشنی نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مارگس اسے غور سے دیکھ رہا تھا مگر وہ کون تھا؟ دوری کی بنا پر وہ کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا کہ اچانک اس نے پر سکیڑے اور کسی راکٹ کی طرح اوپر اڑا پھر فضا میں غوطہ لگا کر تیزی سے نیچے آیا اور سیدھا چشمے میں جا گرا اور پانی میں اترتا چلا گیا چند لمحے پانی میں ہلچل رہی پھر پانی کی سطح معمول پر آ گئی مارگس حیرانگی سے یہ سب دیکھ رہا تھا پانی کی سطح سے جو روشنی آ رہی تھی وہ بھی غائب ہوگئی شاید وہ بہت ہی گہرے پانی میں اتر گیا تھا۔

مارگس آرام سے اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس چشمے کے قریب آیا اس نے دیکھا اب وہاں کسی بھی دیوتا کا نام ونشان نہیں تھا وہ حیرت سے پانی کی سطح کو جھک کے دیکھ رہا تھا کہ پھر وہی تیز روشنی پیدا ہوئی اور پھر بڑھتی ہی چلی گئی اس سے پہلے کہ مارگس پیچھے ہٹتا دو مضبوط بازوؤں نے اسے سختی کے ساتھ کندھوں سے پکڑا اور اسے لئے پانی میں اترتے گئے اس نے مارگس کو سنبھلنے کا موقع تک نہ دیا تھا وہ وجود سے نیچے گہرائیوں میں لیتا جا رہا تھا مارگس نے ہاتھ پاؤں مارنے لگا مگر وہ جو بھی تھا اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اس نے مارگس کی ایک نہ چلنے دی اور اسے نیچے ہی نیچے لیتا جا رہا تھا حتیٰ کہ وہ مارگس کو تہہ تک لے گیا جیسے ہی وہ دونوں تہہ تک پہنچے اس نے مارگس کو یک دم چھوڑ دیا اس کے چھوڑتے ہی مارگس کا وجود تیزی سے اوپر آیا اور پانی کی سطح پر آ کے گہرے گہرے سانس لینے لگا ابھی وہ کنارے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ پھر اس انجان دیوتا نے اس کو پاؤں سے پکڑا اور اسے پھر سے نیچے لے جانے لگا۔

مارگس نے بہت کوشش کی مگر اس نے مارگس کا پیر نہ چھوڑا پھر اچانک مارگس نے اپنا دوسرا پیر اس کے منہ پر مارا تو اس کی ٹانگ اس کی گرفت سے نکل گئی اور مارگس ایک بار پھر سطح پر آیا اور پھر تیزی سے ہاتھ پیر چلاتا ہوا چشمہ سے باہر نکل آیا تو اس نے مڑ کے دیکھا کہ وہ انجان دیوتا بھی پانی سے باہر آیا تھا مارگس اسے دیکھ کے حیران رہ گیا وہ کوئی دیوتا نہیں ایک اٹھارہ انیس برس کی نوجوان بے حد خوبصورت لڑکی تھی جس کے سفید پر سفید روشنی خارج کر رہے تھے اس کے سیاہ بال اس کی کہنیوں تک آ رہے تھے۔ اس نے انتہائی بیش قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور اس کا خوب صورت چہرہ کسی لال انگارے کی مانند دہک رہا تھا وہ بے حد غصے میں مارگس کی جانب بڑھی تو مارگس گھبرا کے پیچھے کی جانب ہٹا تو جھاڑیوں میں الجھ کے گر پڑا وہ جیسے گرا وہ تیزی سے اڑی اور مارگس کو پکڑ کے فضا میں بلند ہوئی اور آٹھ نو فٹ اوپر جا کے اسے چھوڑ دیا تو مارگس نیچے آن گرا زمین قدرے پتھریلی تھی اس لئے وہ کافی زخمی ہوگیا وہ اب اس سے کچھ فاصلے پر اتری اور تیزی سے مارگس کی جانب لپکی۔ مارگس کی کیفیت نیم بے ہوشی کی سیت تھی اسے اب اپنے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس نے اس دیوی کے ہاتھ میں چمکتی تلوار دیکھ لی تھی اس نے مارگس کے قریب آتے ہی تلوار بلند کی مارگس نے اپنے دونوں بازوؤں سے اپنا چہرہ چھپالیا اس نے جیسے ہی مارگس پر تلوار گرائی تلوار مارگس سے ایک انچ دور رک گئی اس نے حیرت سے دیکھا اس کا ہاتھ کسی نے پکڑ لیا تھا اور وہ کوئی اور نہیں ٹائیرس تھا۔

"مارگس اٹھو۔" ٹائیرس نے اس دیوی کا ہاتھ چھوڑے بنا کہا تو مارگس حیرت سے ٹائیرس کو دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا اٹھو۔" اس بار اس نے قدر سختی سے کہا تو مارگس صدمے سے باہر آیا اور اٹھ کھڑا ہوا مگر توازن قائم نہ رکھنے کی بنا پر گرنے لگا تو ٹائیرس نے فوراً اسے سہارا دیا۔

"آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرا ہاتھ پکڑنے کی۔"

وہ غرائی۔

"دیکھو گلوریا تمہیں مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔" ٹائیرس نے تحمل سے جواب دیا تو اچانک کسی کے تالی بجانے کی آواز سنائی دی تو وہ تینوں مڑ کے دیکھنے لگے مارگس نے دیکھا وہ کوئی اور نہیں سائرس کی بیوی تھی۔

"واہ واہ...... تو جیل سے بھاگے ہوئے مجرموں سے اور کس لہجے میں بات کی جاتی ہے۔"

"سلینا یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ میں مجرم نہیں ہوں

رہا سوال ہمارے بھاگنے کا تو ہم کہیں نہیں بھاگے جارہے ہیں یہ بچہ نہانا چاہتا تھا اس لئے میں رات یہاں لایا ہوں۔" ٹائیرس نے مارگس کو سہارا دیتے ہوئے کہا کیونکہ اس کی حالت بہت خراب تھی۔

"اچھا تو تم اس لئے آئے ہو میرے خیال میں، میں نے اسے کہیں دیکھا ہے کہاں دیکھا ہے یاد نہیں آرہا۔" سائرس کی بیوی سلینا نے کہا۔

"ہاں یاد آیا کہیں یہ تمہاری نافرمان بہن کی اولاد تو نہیں۔"

"خاموش اس سے آگے ایک لفظ اور بولا تو۔" ٹائیرس کسی شیر کی طرح دھاڑا۔

"تو کیا کرلو گے؟" سلینا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ وہ کروں گا جو آج تک کسی کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔" ٹائیرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر مارگس کو مخاطب کیا۔

"چلو مارگس ہمت سے کام لو۔" ٹائیرس نے کہا اور اسے کسی بچے کی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھا کے واپس چل پڑا۔

"آپ نے انہیں جانے کیوں دیا؟" گلوریا جو کہ اب تک خاموش کھڑی تھی غصے سے بولی۔

"بس میری بچی صبح کا انتظار کرو۔" سلینا نے کہا اور مسکرانے لگی اس کی مسکراہٹ میں ہزاروں زہر چھپے تھے۔

☆......☆......☆

وہ رات مارگس نے بڑے کرب میں گزاری وہ زخمی تھا اور یہاں پر زخموں پر لگانے کو کچھ بھی نہیں تھا ٹائیرس نے پانی کوٹھری کے کچھ فرش پر بہادیا اور اس مٹی کی لیپ کو مارگس کے زخموں پر لگایا تو اسے کچھ آرام محسوس ہوا اور وہ سوگیا صبح وہ اٹھا تو اس نے دیکھا بہت سے پہریدار ٹائیرس کو گھیرے کھڑے تھے انہوں نے مارگس کو بھی کوٹھری سے نکالا اور ان دونوں کو اس دربار میں لے گئے جہاں وہ پہلے بھی آچکے تھے زیوس پوری شان وشوکت کے ساتھ اپنے تخت پر براجمان تھا اس کے دائیں جانب سائرس اور تھیسیس بیٹھے تھے جبکہ بائیں جانب سلینا اور گلوریا بیٹھی تھیں مارگس نے اب اطمینان سے گلوریا کو دیکھا وہ واقعی بہت حسین تھی اس حسن کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن تھا مارگس اسے بے خود ہو کے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اسے زیادہ مت دیکھو ورنہ آنکھیں نکال کر تمہارے ہاتھ میں رکھ دے گی۔" ٹائیرس نے مارگس کو کہنی مار کے کہا تو وہ چونک کر سیدھا ہوگیا۔

"ٹائیرس خوش آمدید......تم واقعی میں میری سب سے نافرمان اولاد ہو......اگرچہ اس بات کا مجھے پہلے بھی یقین تھا لیکن کل رات کے واقعہ کے بعد یہ بات تم نے ایک بار پھر ثابت کردی کہ میں غلط نہیں ہوں۔" دربار میں سائرس کی رعب دار آواز گونجی۔

"آپ نے جو بھی سنا ہے ہمیشہ کی طرح غلط سنا ہے۔" ٹائیرس نے سلینا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو زہر خند انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"تو کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ تم نے اس لڑکے کو زندان سے نکلنے میں مدد کی؟ اور پھر اس نے گلوریا پر حملہ کردیا۔" زیوس نے کہا۔

"میں نے اس کو باہر بے شک نکالا تھا مگر......"

"اگر مگر......کو چھوڑو اسے باہر تم نے نکالا تھا نا؟" زیوس نے اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا۔

"جی......" ٹائیرس نے سر جھکا کے دھیرے لہجے میں کہا۔

"بس تم نے جرم قبول کرلیا اور ایک بار پھر مجرم ثابت ہوگئے نا صرف تم بلکہ یہ لڑکا بھی جس نے فرار ہونے کی ناکام کوشش کی ہے تم دونوں کو ہی اس کی کڑی سزا دی جائے گی تم پہلی کی طرح زندان میں سڑو گے اور اس لڑکے کو مردان کی سزا سنائی جاتی ہے۔" زیوس نے کہا تو ٹائیرس کا رنگ فق ہوگیا جبکہ وہاں بیٹھے سائرس کے علاوہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"دیکھیں لباجی آپ ایسے نہیں کرسکتے۔" ٹائیرس نے جلدی سے کہا تو زیوس نے اسے غصے سے دیکھا۔

"مجھے اباجی مت بلاؤ میں تمہیں اپنا بیٹا نہیں مانتا۔"

"دیوتاؤں کے دیوتا ہم پر رحم کریں میں نے ہی اس بچے کو ورغلایا تھا باہر نکلنے کے لئے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے آپ نے جو سزا ابھی دی ہے آپ مجھے دیں میں آپ کی ہر سزا دل وجان سے قبول کرلوں گا۔" ٹائیرس نے گھٹنوں کے بل جھک کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اپنے فیصلے نہیں بدلتا۔" زیوس نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اسے دیکھ کر باقی سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے سپاہیوں نے ایک بار پھر ان دونوں کو گھیر لیا۔

"میری ایک بات یاد رکھو تمہیں بہادر بننا ہوگا کیونکہ اب تم جس جگہ جارہے ہو وہ بزدل لوگوں کے لئے جہنم اور بہادر لوگوں کے لئے جنت ہے۔" ٹائیرس نے مارگس کو جلدی سے کہا کیونکہ سپاہی اب انہیں مختلف سمتوں کی جانب لے جارہے تھے محل سے باہر آنے پر بھی وہ کافی دیر چلتے رہے پھر مارگس نے دیکھا کہ سپاہی اس کو ایک کھلے میدان میں لے گئے جہاں پہلے بھی کچھ لوگ موجود تھے سپاہیوں نے اسے بھی ان کی جانب دھکیلا اور خود واپس مڑ گئے۔

"لو بھائی ایک اور صاحب بھی تشریف لے آئے یہ تو غالباً کسی جیل سے فرار مجرم لگتے ہیں۔" ان میں سے اسمارٹ نوجوان نے مارگس کے جسم پر چیتھڑوں کی طرح جھولتے ہوئے بوسیدہ لباس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جی......" مارگس نے آہستہ سے کہا۔ "تو تم نے کون سا جرم کیا ہے؟" اس نے دوبارہ سوالیہ انداز میں کہا۔

"جی......میں نے 2 قتل کئے تھے۔" مارگس نے سر جھکا کے کہا۔

"واہ تم بھی قاتلوں کی جماعت میں خوش آمدید ہم سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں ہمارے انداز الگ الگ ہیں کام کرنے کے مگر ہیں تم ہم سب قاتل ہی ہیں۔ سوائے اس ایک کے۔" اس نے ایک نوجوان خوب صورت لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا جو بری طرح سے سہمی ہوئی تھی۔

"ایک منٹ میں پہلے اپنا اور ان کا تعارف کرادوں میرا نام کارلر ہے اور میں میرین ہوں (امریکی فوجی) یہ جو سیاہ فام نظر آرہا ہے یہ قزاقوں کے جہاز کا کپتان خوذی ہے یہ صومالیہ کا رہنے والا ہے اور یہ جو ہٹا کٹا سفید ریچھ کی طرح نظر آرہا ہے یہ رشین ہے یہ ایک انڈر گراؤنڈ اسٹریٹ فائٹر ہے اس نے دوران فائٹ بہت سے فائٹرز کی گردنیں توڑی ہیں بہت کم بولتا ہے یہ اس لئے اسے زیادہ بولنے والے پسند نہیں اس سے دور ہی رہنا یہی تمہارے لئے بہتر ہے اور یہ جو آنکھوں پر چشمہ لگائے بہت شریف نظر آنے کی کوشش کررہے ہیں انہیں زیادہ شریف مت سمجھنا یہ ایک پروفیسر ضرور ہیں مگر اس کے ساتھ ریپ اور اس کے بعد قتل کے امریکا میں سب سے بڑے مجرم ہیں قانون کے مطابق انہوں نے اب تب تک 49 لڑکیوں کو قتل کیا ہے اور جب پولیس نے انہیں پکڑا تو بجائے ان کو اپنے کئے پر افسوس ہوتا انہیں اس بات کا پچھتاوا تھا کہ انہوں نے ففٹی کیوں نہیں کی۔ بہرحال اور اب رہی اس لڑکی کی بات یہ ایک ڈاکٹر ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں یعنی صرف۔ یہی ہماری اس ٹیم میں، مِس فٹ ہے اس کا نام جینی ہے میں نے اپنے بارے میں تو تمہیں بتا ہی دیا میں میرین ہوں کوئی قاتل نہیں ایک پروفیشنل سولجر ہوں اپنے وطن کے لئے لڑتا ہوں اور اس کے لئے ہی خون بہاتا ہوں دنیا کی نظر میں ضرور میں ایک قاتل ہوں لیکن باقی قاتلوں کی طرح میرا ضمیر کبھی مجھے ملامت نہیں کرتا۔" کارلر نے آسمان کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر چونک کے بولا۔

"تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بھی نہیں بتایا؟"

"بتانے کے لئے کچھ خاص نہیں میرا جھگڑا کچھ لوگوں سے ہوگیا تھا، اور میں نے غصے میں ان لوگوں کو مار ڈالا۔" مارگس نے کہا۔

"شکل سے تم غصیلے تو نہیں دکھائی دیتے قتل کی یقیناً کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی، بہرحال جو بھی۔ یہاں اس بات سے اب کوئی بھی فرق نہیں پڑنے والا۔" کارلر نے کندھے اچکا کے کہا۔

"کیوں فرق نہیں پڑتا؟" مارگس نے حیرت سے کہا۔ "کیونکہ وہ پنکھوں والے شیطان ہمارا شکار کرنے کے لئے ہمیں یہاں لاتے ہیں۔" کارلر کے بولنے سے پہلے ہی

خوزی نے پراسرار لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں تم سب یہاں کیسے آئے ہو؟" مارگس نے خوزی کو مخاطب کیا۔

"میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپس جارہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی بڑا پرندہ مجھے اٹھا کے اڑ پڑا ہے جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اس دنیا میں پایا اور باقی تمام لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے ہمیں وقت تو ٹھیک یاد نہیں البتہ اتنا اندازہ ہے ہمیں اس دنیا میں ایک دو ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔" کارلر نے جواب دیا اس سے پہلے مارگس کچھ کہتا ان سے کچھ فاصلے پر دو بڑے لوہے کے باکس دھماکے سے آن گرے وہ سب بری طرح سے ہل کے رہ گئے پھر دوڑے ان باکس کے قریب پہنچے اور کارلر نے آگے بڑھ کے ایک باکس کو کھولا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ باکس میں فوجی یونیفارم اور چھوٹے بڑے ہتھیار بھرے ہوئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے.....؟" مارگس کے منہ سے حیرت کے مارے نکلا مگر اس کی اس بات کا جواب کسی نے نہیں دیا کیونکہ اس بات کا جواب ان میں کسی کے پاس نہیں تھا۔

"مجھے لگتا ہے شکار کھیلنے کا وقت آگیا ہے۔" خوزی نے دھیرے سے کہا۔

"مگر ہم یہاں کس کا شکار کریں گے؟" کارلر نے حیرت سے کہا۔

"شکار ہم نہیں کریں گے ہم شکاری ہرگز نہیں شکاری تو وہ ہیں۔" خوزی نے محل کی جانب اشارہ کیا تو ان سب نے بے ساختہ مڑ کے دیکھا تو سب کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"یہ سب انہوں نے ہمیں اس لئے دیا ہے کہ تاکہ ہمیں اسلحہ سے لیس کرکے جنگل کی طرف ہانکا جاسکے کوئی بھی دیوتا نہتے انسان پر وار کرنا توہین سمجھتا ہے۔ یہ اسلحہ ہمیں تحفظ سے زیادہ انہیں شہ دے گا کہ ان کا مقابلہ نہتے لوگوں سے نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ اس اسلحہ کی اہمیت ان پنکھ والے شیطانوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔" خوزی نے کہا وہ سب اس کی باتیں سننے کے ساتھ محل کی چھت پر کھڑے دیوتاؤں کو دیکھ رہے تھے زیوس سونے سے بنی ایک اونچی کرسی پر براجمان تھا اس کے دائیں جانب سارس اور تھیسیس جبکہ بائیں جانب سلینا اور گلوریا کھڑی تھیں سارس کے ہاتھ میں تیز نوکیلا بھالا تھا جبکہ تھیسیس کے ہاتھ میں دو منہ والا کلہاڑا تھا جس کی چمک اتنی دور سے بھی محسوس کی جاسکتی تھی دوسری جانب سلینا کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی خم دار تلواریں تھیں جبکہ گلوریا کے ہاتھ میں ایک دو فٹ کا لمبا دو دھاری خنجر تھا۔

"کام پر لگ جاؤ ساتھیوں ہمارے پاس وقت کم ہے۔" کارلر نے کہا تو سب چونک اٹھے اور آگے بڑھ کے فوجی یونیفارم پہننے لگے کیونکہ ان تمام لوگوں کے لباس تقریباً بوسیدہ ہوگئے تھے سب نے یونیفارم پہن لئے سوائے جینی اور خوزی کے۔

"تم بھی جلدی کرو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" کارلر نے انہیں مخاطب کیا۔

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" خوزی نے تین کونوں والی صومالین ٹوپی کو سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے کہا۔

"تم تو چینج کرلو۔" کارلر نے جینی کو کہا تو وہ چونک اٹھی اور ایک یونیفارم اٹھا کے سائیڈ پر ہوگئی مارگس نے نوٹ کیا پروفیسر کی نظریں ڈاکٹر جینی کا تعاقب کررہی ہیں۔

"چلو دوستو.....اب اپنے اپنے ہتھیار اٹھالو۔" کارلر نے بھاری مشین گن اٹھاتے ہوئے کہا تو پروفیسر نے بھی آگے بڑھ کے ایک گن اٹھالی، خوزی نے باکس کے کونے میں پڑی ایک لمبی اور سیدھی تلوار اٹھا کے اسے اپنے ہاتھ میں گھما کے اپنی نظروں سے اسے تولنے لگا۔

"کیا تمہیں یہ چاہئے؟" کارلر نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں کیوں کہ یہ ہماری دنیا سے بیسٹ ہتھیار ہے یہ سمورائی تلوار ہے اس کے ایک ہی وار سے کوئی بھی وجود ٹکڑے ہوجاتا ہے۔" خوزی نے کہا۔

"لیکن ہمارے مقابلے میں جو ہیں ان کے سامنے یہ تلوار کچھ بھی نہیں۔" کارلر نے منہ بنا کے کہا۔

"یہ تلوار اور پروالے نے انسانوں کو ایک تحفہ دیا ہے یہ کبھی ٹوٹتی نہیں نہ اس کا لگا گھاؤ کبھی بھرتا ہے۔" خوزی نے

اسے چوم کے آنکھوں سے لگایا اور پھر تلوار نیام میں رکھ دی اور کارلر نے کندھے اچکا کے رہ گیا۔

"تم ہتھیار نہیں لوگے۔" خوزی نے رشین پہلوان سے کہا۔

"ہتھیار کمزور لوگ اٹھاتے ہیں۔" رشین نے اپنے فولادی بازوؤں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتے ہیں جس کا جسم گینڈے جیسا ہو اس کی عقل چوہے جتنی بھی نہیں ہوتی۔" کارلر نے آہستہ سے کہا مارگس نے آگے بڑھ کے ایک جدید پسٹل اٹھایا اور ڈاکٹر جینی کو تھمادیا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ نے اسے کبھی نہیں چلایا ہوگا میں نے بھی مشین گن کبھی نہیں چلائی لیکن حالات سب کچھ کرادیتے ہیں یہ آپ کی جان کی حفاظت کرپاتے یا نہ کرپاتے لیکن آپ کی عزت کی حفاظت ضرور کرسکتا ہے۔" مارگس نے بات کے آخر میں پروفیسر کی طرف دیکھ کر کہا تو ڈاکٹر جینی نے کچھ سوچ کے سر ہلادیا۔

"تو دوستو! اب دیر مت کرو اور جنگل کی جانب بڑھو کیونکہ جنگل میں وہ ہمیں اتنی آسانی سے نشانہ نہیں بنا پائیں گے۔" کارلر نے کہا تو یک دم وہ سب جنگل کی جانب دوڑ پڑے مارگس نے مڑ کے دیکھا دیوتا اب بھی محل کی چھت پر اطمینان سے کھڑے تھے شاید وہ خود ہی انہیں جنگل میں بھاگنے کا موقع دے رہے تھے۔

☆......☆......☆

دو تین کلو میٹر دوڑنے کے بعد ہی راستہ دشوار گزار ہوگیا، جس کی وجہ سے انہیں اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔

"کسی نے انہیں ہمارے پیچھے آتے ہوئے دیکھا ہے۔" کارلر نے جھاڑیوں کو ہٹا کے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو سب نے نفی میں سر ہلادیا۔

"ہوشیار رہنا اور اپنے ارد گرد نظر رکھنا۔" خوزی نے کہا اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا ایک دھماکے سے ان کے سامنے ایک وجود زمین پر آن کھڑا ہوا وہ اتنی تیزی سے زمین پر اترا تھا کہ دھول کے بادل اڑنے لگے چند لمحوں بعد جب ان کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے سارس کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں بھالا تھا جس کی نوک بے حد تیز تھی وہ سب اس کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں ایک بات کہوں اگر مانو تو۔" کارلر نے تھوک نگلتے ہوئے گن پر گرفت جما کے کہا۔

"ہاں بولو۔" ڈاکٹر جینی نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بھاگو۔" کارلر نے کہا اور سرپٹ ایک جانب دوڑ پڑا اس کے بھاگتے ہی جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ کھڑے ہوئے سوائے رشین فائٹر کے۔

"تم جانتے ہو میں نے آج تک جتنی بھی لڑائیاں لڑی ہیں سب جیتا ہوں میں آج تک ہارا نہیں کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ کسی وجود میں مجھ سے زیادہ طاقت ہے ہمت ہے تو ہتھیار کے بغیر لڑو کیونکہ میں بھی نہتا ہوں۔" رشین نے کہا تو سارس نے بنا کچھ کہے بھالا ایک جانب پھینک دیا یہ دیکھ کر رشین کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ سارس کی جانب لپکا سارس ایک جانب ہوا تو وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھ گیا جیسے ہی اس کی پیٹھ سارس کی جانب ہوئی سارس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور رشین کی کمر میں کسی تلوار کی طرح اندر داخل ہوا سارس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پکڑی اور ایک جھٹکے سے اس کی کمر سے باہر نکال لی اور رشین کا بھاری بھرکم جسم خون میں لت پت تڑپنے لگا۔

ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں رشین کے انجام سے انجان دوڑے جارہا تھا مارگس نے دیکھا پروفیسر بھی اس کے ساتھ ہی دوڑ رہا تھا کافی دیر یوں اندھا دھند بھاگتے رہے اور پھر مارگس نے تھک کے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی اور پروفیسر بھی اپنے گھٹنے پکڑ کر ہانپنے لگا مارگس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو ڈاکٹر جین بھی گرتی پڑتی ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" مارگس نے ان کے قریب آتے ہی پوچھا۔

تو جینی نے کندھے اچکا دیئے۔

"میرے خیال میں ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہئے

ہمیں آگے بڑھتے رہنا ہوگا۔" پروفیسر نے کہا تو مارگس نے سر ہلا دیا۔

سارس کو دیکھ کے اندھا دھند بھاگنے کی وجہ سے کارلر اور خوزی اپنے باقی ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے۔

"کیا کہتے ہو کپتان کیا ہم صحیح سمت میں جارہے ہیں۔" کارلر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کس سمت میں جارہے ہیں لیکن ایک بات ضرور یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"کون سی بات......؟" کارلر نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ موت ہماری سمت میں ضرور آرہی ہے۔" خوزی نے رکتے ہوئے کہا تو کارلر بھی رک کے حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" کارلر نے پوچھا۔

"ہم جب سے دوڑنا شروع ہوئے ہیں وہ اس وقت سے سائے کی طرح ہمارا پیچھا کررہا ہے۔"

"کون......؟" کارلر نے اکھتے ہوئے سانس کے ساتھ کہا تو خوزی نے جواب دینے کے بجائے تلوار نیام سے نکالی اور پیچھے مڑا کارلر نے اس کی نظروں کی سمت میں دیکھا تو اسے کچھ نظر نہ آیا کہ اچانک ایک بڑے درخت کے تنے کے پیچھے سے ٹھیسیس نکلا تو کارلر نے پہلی بار ٹھیسیس کو اتنے قریب سے دیکھا تھا وہ سر سے پاؤں تک بالکل سیاہ رنگت کا تھا اسے دیکھ کر سیاہ رات کا گمان ہوتا تھا اس کے چہرے کی پہچان صرف اس کے نوکیلے سفید دانتوں کی وجہ سے ہوتی تھی یا پھر اس کی سرخ انگارہ نما آنکھوں سے ممکن تھی کارلر مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا ٹھیسیس دیکھنے میں بھی واقعی موت کا دیوتا لگتا تھا بے رحم، بدصورت اور سفاک۔

"کارلر مجھے لگتا ہے تمہارا اور میرا ساتھ یہاں تک تھا تم جاؤ یہاں سے۔" خوزی نے ٹھیسیس سے نظر ہٹائے بغیر کہا مگر اس کی نظریں اب بھی پتھرائے ہوئے انداز میں ٹھیسیس کو دیکھ رہی تھیں جو اپنی سرخ لمبی زبان سے اپنے بھاری بھرکم دو دھاری کلہاڑے کی دھار کو یوں چاٹ رہا تھا جیسے اس کی دھار کو تیز کررہا ہو۔

"میں نے کہا جاؤ......" خوزی نے چلا کر کہا تو کارلر ہوش کی دنیا میں واپس آیا اس نے خوزی کو دیکھا جو شاید انتہائی فیصلہ کرچکا تھا کارلر نے الوداعی نظر خوزی پر ڈالی اور بھاگ کھڑا ہوا اس کے جاتے ہی خوزی اپنے سینے پر تلوار کی نوک سے ایک لمبی لکیر ڈالی تو خون اس میں سے نکل کر اس کے پورے بدن کو تر کرنے لگا خوزی نے دونوں ہاتھوں سے تلوار کا دستہ مضبوطی سے تھاما۔

"اوپر والے مجھے اس شیطان سے لڑنے کی طاقت دے۔" خوزی نے ٹھیسیس کی جانب دیکھ کر کہا جو کلہاڑا اپنے ہاتھ میں تھامے اسے دیکھ رہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے خوزی نے ٹھیسیس پر اپنی سمورائی تلوار کی مدد سے حملہ کردیا

......

کارلر اندھا دھند دوڑتے ہوئے ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کے کانوں میں خوزی کی دل دوز چیخ پڑی اس کے قدم کچھ سست پڑنے لگے پھر دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر اس نے رفتار بڑھا دی۔

شام کے سائے پھیلنے لگے تھے جنگل اتنا گھنا تھا کہ دن میں بھی رات کا سماں لگتا تھا اور اب شام ہونے پر اور بھی زیادہ اندھیرا چھا چکا تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں یہاں کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر آرام کرنا چاہئے۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہاں...... مگر ہم دونوں کو باری باری پہرہ دینا پڑے گا۔" مارگس نے کہا پروفیسر نے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے پہلے میں پہرہ دیتا ہوں تم دونوں یہاں سو جاؤ رات کے دوسرے پہر تمہیں جگا دوں گا۔" پروفیسر نے کہا تو مارگس اور ڈاکٹر جینی نے گھنی جھاڑیوں کے درمیان جگہ صاف کی اور لیٹ گئے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" مارگس نے ڈاکٹر جینی کو دیکھتے ہوئے کہا جو گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" ڈاکٹر جینی نے کہا تو مارگس اسے دیکھنے لگا وہ بہت ہی معصوم اور کم عمر تھی غالبا

اس نے ابھی ابھی ڈاکٹری جوائن کی تھی وہ بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی لیکن حالات کے پیش نظر اب اس کا حسن بھی سوگوار نظر آرہا تھا۔

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ حالات بہتر ہوجائیں گے مگر ہمیں بہتری کی امید بھی نہیں چھوڑنی چاہئے۔" مارگس نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"پتہ ہے میں چھوٹی سی تھی جب میرے ڈیڈ اس دنیا سے چلے گئے اس کے بعد اگر میرا اس دنیا میں کوئی تھا وہ میری بوڑھی ماں تھی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کے جیتے تھے پھر ایک دن میں اپنے فلیٹ سے جیسے ہی ایک دوست سے ملنے کے لئے رات کو نکلی تو کسی نے یک دم مجھے دبوچ کے اٹھالیا جب میں ہوش میں آئی تو میں نے خود کو اس دنیا میں پایا پتہ نہیں میری ماں کی کیا حالت ہوگی وہ بے چاری تو صدمے سے پاگل ہوگئی ہوگی۔" یہ کہہ کر جینی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تو مارگس کو اس پر بے پناہ ترس آنے لگا اور اس نے ہاتھ آگے بڑھا کے اس کے گال پر بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا تو وہ یک دم چپ ہوگئی اور اسے دیکھنے لگی تو مارگس کو فوراً ہی اپنی کنزور پوزیشن کا اندازہ ہوگیا اس نے فوراً سے ہاتھ اٹھا ہٹالیا۔

"سوری۔" مارگس نے کہا اور کروٹ بدل کے منہ دوسری جانب کرلیا اور آنکھیں بند کرلیں اور جینی اس کی پیٹھ کو دیکھنے لگی۔

مارگس کی آنکھ رات گئے کھلی تو اس نے کروٹ بدلی اور جینی کو ساتھ نہ پاکے فوراً اٹھ بیٹھا اس نے پاس رکھی مشین گن اٹھائی اور جھاڑیوں سے باہر نکل کے احتیاط سے اندگرد دیکھنے لگا مگر نا اسے پروفیسر دکھائی دیا نا ہی جینی یہ دونوں کہاں گئے؟ اس بارے میں وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کچھ فاصلے پر موجود جھاڑیوں میں ہلچل محسوس ہوئی تو اس نے فوراً مشین گن آگے کی اور بے آواز قدموں سے آگے بڑھا اس نے آرام سے جھاڑیوں کو ایک جانب ہٹایا تو اگلہ منظر دیکھ کر خون کھول اٹھا اور گن کے دستے پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی اس نے دیکھا جینی کا منہ بندھا ہوا تھا اور پروفیسر اس کی عزت برباد کرنے کے در پر تھا۔

"جینی سے دور ہٹ جاؤ پروفیسر......" مارگس دھاڑا۔

"اوہو...... تو تم بھی یہاں آگئے؟" پروفیسر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا اس کے اٹھتے ہی جینی بھی فوراً کھڑی ہوئی اور دوڑ کے مارگس کے پیچھے چھپ گئی مارگس کی گن کی بیرل ابھی تک پروفیسر کی جانب تھی۔

"کیا تم اس گھٹیا لڑکی کے لئے مجھ پر گولی چلاؤ گے۔" پروفیسر چلایا۔

"دیکھو تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ۔" مارگس نے سخت لہجے میں کہا۔

"ورنہ کیا......؟" مارو گے مجھے چلو چوہے یہ بھی کرکے دیکھ لو۔" یہ کہہ کر پروفیسر اس کی جانب بڑھا۔

"میں کہہ رہا ہوں اپنی جگہ پر رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

"چلاؤ مت ہمت کرو اور گولی چلاؤ۔" پروفیسر نے چلا کر کہا اور اس کی جانب بڑھا اس سے پہلے کہ وہ مارگس سے گن چھیننے کی کوشش کرتا۔

فائر کی آواز گونجی اور پروفیسر کی کھوپڑی سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گئی خون کے کچھ چھینٹے مارگس کے چہرے پر بھی آن لگے پروفیسر کا وجود ایک دھماکے سے زمین پر گرا اس نے دیکھا کارلر ہاتھ میں گن لئے کھڑا اور اس کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔

"مرے یار بے چارہ اتنی دیر سے جو تمہاری منت کئے جارہا تھا ماردی ہوتی خوامخواہ مجھے تکلیف کرنی پڑی۔" کارلر نے کہا اور ان کی جانب بڑھا مارگس اور جینی ابھی تک شاک سے باہر نہیں نکلے تھے اس سے پہلے کہ کارلر ان تک پہنچتا کہیں سے فضا میں ایک گھومتی ہوئی چھوٹی تلوار آئی اور کارلر کا سر تن سے جدا کرتے ہوئے ایک درخت کے تنے میں گھپ گئی کارلر کا بنا سر کے وجود زمین پر گر کے تڑپنے لگا مارگس اور جینی نے اس سمت دیکھا جہاں سے تلوار آئی تھی تو ان کی آنکھوں میں دہشت پھیل گئی کیونکہ تلوار پھینکنے والی سلینا تھی ایک تلوار اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ زمین سے تین فٹ اوپر فضا میں پر پھیلائے کھڑی تھی اس کے

پر چلنے کی وجہ سے دھول اور خشک پتے اڑ رہے تھے مارگس کچھ لمحوں کے لئے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے ذہن میں آواز گونجی کہ اسے فوراً مار دو ورنہ مارے جاؤ گے اس خیال کے آتے ہی اس نے گن کی نال کا رخ سیلنا کی طرف کیا اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا سلینا نے تلوار پھینکی اور گن کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا گن دور جا گری جو تلوار فولاد کو یوں کاٹ سکتی تھی اس کے لئے ایک گوشت سے بنے وجود کی کیا اہمیت ہے یہ سوچتے ہی مارگس کے پسینے چھوٹ گئے جینی دوڑ کے ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی تھی جب کہ مارگس خود میں اتنی بھی ہمت پیدا نہ کرپایا۔

"تم سے تو اچھی یہ لڑکی ہے جس میں بھاگنے کی ہمت تو باقی ہے تم بھی بالکل اپنے باپ پر گئے ہو وہ بھی تمہاری طرح بزدل تھا۔" سلینا نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس پر جھپٹی اور زوردار انداز میں مارگس سے ٹکرائی تو وہ زمین پر گر گیا سلینا نے درخت میں پھنسی تلوار نکالی اور مارگس کی جانب بڑھی مارگس جب گرا تھا تو اس کا سر پتھر سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا سلینا نے اس کے نزدیک آ کے تلوار والا ہاتھ بلند کیا مارگس کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

پھر اچانک اس کی نظر ایک پتھر پر پڑی اس نے پتھر اٹھایا اور سلینا کی جانب پھینکا پتھر سلینا کے اس ہاتھ پر لگا جس میں تلوار تھی پتھر کے لگتے ہی تلوار اس کے ہاتھ سے نکل گئی مارگس تیزی سے اٹھا اور اسے زوردار انداز میں دھکا دینے کی کوشش کی مگر وہ سلینا کو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا پایا مارگس کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ سلینا اس سے طاقت میں کہیں زیادہ ہے سلینا نے اسے دھکا دیا تو وہ دور جا گرا سلینا نے ایک بار پھر تلوار اٹھائی اور اس کی جانب بڑھی اس سے پہلے کہ وہ اس پر وار کرتی ایک تیر نامعلوم سمت سے آیا اور اس کی کلائی کو چیرتا ہوا ایک درخت کے تنے میں پیوست ہوگیا۔

مارگس نے حیرت سے ارد گرد دیکھا تو اس کی نظر ٹائیرس پر پڑی جو ہاتھ میں کمان لئے کھڑا تھا اور اس کے کندھے پر تیروں سے بھرا ترکش تھا سلینا نے دوسرے ہاتھ سے تیر کو پکڑ کر اپنی کلائی کو آزاد کرانا چاہا مگر تیر درخت کے تنے سے نا نکل پایا سلینا کا بازو خون کی سرخی سے تر ہوگیا تھا اور اس کے چہرے پر شدت تکلیف کے آثار واضح تھے مگر پھر بھی وہ ضبط کیے ٹائیرس کو خونی نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔

"لیٹ ہونے کے لئے معذرت۔" ٹائیرس نے زمین پر گرے مارگس کی جانب ہاتھ بڑھا کے کہا جو اسے حیرانگی سے دیکھے جا رہا تھا۔

"اب اٹھ بھی جاؤ بعد میں حیران ہو لینا ویسے اس میں حیرانگی والی کوئی بات نہیں کیونکہ مجھے قید کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔" ٹائیرس نے کہا اور مارگس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہارا دے کر اٹھا لیا۔

"ٹائیرس تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔" سلینا نے مچلتے ہوئے کہا۔

"تم تو جانتی ہو مجھے غلطیاں کرنا پسند ہیں۔" ٹائیرس نے مسکرا کے کہا۔

"تو پھر یہ تمہاری زندگی کی آخری غلطی ہوگی۔" سلینا نے غرا کے کہا وہ بدستور تیر سے اپنی کلائی کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"یہ ٹائیرس کا تیر ہے اسے یوں نکالنا آسان نہیں۔" ٹائیرس نے کہا اتنے میں جینی بھی ٹائیرس کے سامنے آ گئی۔

"تمہارے باقی کے ساتھی کہاں ہیں؟" ٹائیرس نے جینی سے سوال کیا۔

"وہ سب مارے جا چکے ہیں۔" جینی کے بجائے مارگس نے کہا تو ٹائیرس بولا۔

"تو پھر یہاں سے چلو یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ مارگس کو سہارا دے کر چل پڑا اور جینی نے بھی ایک نظر بل کھاتی سلینا کو دیکھا اور ان کے ساتھ چل پڑی۔

کافی دور جانے کے بعد مارگس بولا۔

"یہ سب ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں پہلے ان سب نے میرے علاوہ باقی لوگوں کو اٹھایا انہیں یہاں لائے پھر انہیں فوجی یونیفارم کے ساتھ ساتھ اسلحہ سے بھی لیس کیا اور پھر اس جنگل میں ایک ایک کرکے انہیں مارنے لگے یہ سب کس لئے ہے۔"

"شکار ...؟" ٹائیرس نے کہا۔ "کیا مطلب کیا ہم جانور ہیں جو ہمارا شکار کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں دیوتاؤں کے آگے انسان کی اوقات ایک سدھائے ہوئے جانور سے زیادہ نہیں ہے صدیوں پہلے جب انسان جنگلوں میں رہا کرتے تھے تو دیوتا زمین پر آ کے ان کا شکار کیا کرتے تھے جب انسانوں نے بستیاں بنانی شروع کردیں تب بھی دیوتا ایسا کرتے رہے لیکن جب مصر کے حکمرانوں نے اہرام بنائے اور دیوتاؤں کی باقاعدہ عبادت شروع کردی تو یہ بات زیوس کو پسند نہ آئی اور اس نے زمین پر صرف خود آنا بند کردیا بلکہ دیوتاؤں کو بھی منع کردیا لیکن انسانوں کے شکار کی جبلت نے انہیں چین نا لینے دیا تو زیوس نے دیوتاؤں کو اجازت دی کہ وہ زمین سے انسانوں کو اٹھا کے یہاں لے آئیں تاکہ ان گھنے جنگلوں میں ان کا شکار سکون سے کیا جا سکے۔"

"زمین سے اٹھانے سے تمہاری کیا مراد ہے کیا ہم کسی اور دنیا میں ہیں؟" مارگس نے حیران ہو کر کہا تو ٹائیرس ہنس دیا۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے تم ابھی بھی اپنی دنیا میں ہو...... نہیں میرے دوست یہ کائنات بہت وسیع ہے تم اپنی دنیا سے بہت دور ایک نئی دنیا میں ہو۔" ٹائیرس نے کہا۔

"لیکن یہاں ان دیوتاؤں کے تمام خادم اور سپاہی تو عام انسان ہیں۔" مارگس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں انہیں بھی تمہاری طرح تمہاری دنیا سے اٹھایا گیا ہے لیکن شکار کے لئے نہیں کام کاج کرنے کے لئے شکار کے لئے صرف خاص لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔"

"خاص لوگوں سے مراد؟" مارگس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"وہ لوگ جو خود خطرناک ہوں۔" ٹائیرس نے جواب دیا۔

"مگر یہ خطرناک لوگوں میں سے نہیں ہے۔" مارگس نے جینی کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تو ایک عام سی ڈاکٹر ہے اور بس۔"

"کیا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ دیوتاؤں کے قانون کے خلاف ہے۔" مارگس نے یک دم رک کے کہا۔

"لیکن ایسا ہی ہے۔" مارگس نے کہا تو ٹائیرس کچھ دیر تک جینی کو گھورتا رہا اور پھر سر ہلا کے چل دیا اب مارگس اس کے سہارے بغیر اس کے ساتھ چلنے لگا اور ان کے پیچھے جینی بھی سست قدموں سے چلنے لگی۔

سلینا کافی دیر تیر نکالنے کی کوشش کرتی رہی مگر ہر بار اسے منہ کی کھانی پڑی خون مسلسل بہنے کی وجہ سے اسے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔

اچانک اسے پاس والے درخت میں اپنی ایک تلوار رکھی ہوئی نظر آئی تو اس نے ایک انتہائی فیصلہ کیا اس نے ہاتھ بڑھا کے تلوار کو درخت سے نکالا اور اپنی آنکھیں بند کرکے تلوار کو تیزی سے حرکت دی اور پھر دوسرے ہی لمحے جنگل اس کی تیز چیخ سے گونج اٹھا۔

☆......☆......☆

"اور کتنا سفر باقی ہے۔ اس سفر میں ہی ہم سب کی زندگی ختم ہوجائے گی۔" جینی نے اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں اگر ہم سورج نکلنے تک چلتے رہیں تو یہ جنگل ختم ہوجائے گا۔" ٹائیرس نے کہا۔

"اگر جنگل ختم ہوگیا تو کھلے میدان میں وہ ہمیں اور آسانی سے مار سکیں گے۔" مارگس نے منہ بنا کے کہا۔

"نہیں شکار صرف جنگل کی حدود تک ہوتا ہے اس سے آگے نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب اس جنگل سے نکلتے ہی ہم آزاد ہوں گے؟" جینی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر زندہ رہے تو دیوتا یہ شکار پچھلے کئی ہزار سالوں سے کھیلتے آ رہے ہیں اور آج تک کوئی بھی اس جنگل سے زندہ باہر نہیں آیا۔" ٹائیرس نے کہا تو جینی کا کھلا چہرہ پھر سے مرجھا گیا تو ٹائیرس کو اپنے لفظوں کی سختی کا اندازہ ہوگیا۔

"لیکن بے فکر رہو وہ سب مارے گئے کیونکہ ان

کے ساتھ ٹائیرس نہیں تھا۔" ٹائیرس نے مسکرا کے کہا تو جینی بھی مسکرا پڑی۔

"صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟" مارگس نے کہا۔

"بس ہونے ہی والی ہے۔" ٹائیرس نے کہا اور پھر فوراً ہی رک گیا اور اردگرد تیز نظروں سے دیکھنے لگا پھر اس نے جلدی سے مارگس کو کندھوں سے پکڑا۔

"میری بات غور سے سنو اور اس پر عمل کرنا ہر دیوتا کا اپنا ایک مخصوص ہتھیار ہوتا ہے جیسے میرا ہتھیار یہ کمان اور تیر ہیں، یہ کمان اور ترکش تم رکھو ان تیروں کا نشانہ کبھی خطاء نہیں ہوتا یہ گن مجھے دے دو اور اس رستے پر سیدھے چلتے رہو سورج نکلتے ہی تم جنگل سے باہر ہو گے۔"

"مگر تم کہاں جا رہے ہو۔" مارگس نے پریشان ہو کر کہا۔

"مجھے تھیسیس کے گھناؤنے وجود کا اردگرد احساس ہو رہا ہے میں اس سے یہاں روک کے رکھتا ہوں تم جاؤ یہاں سے۔" ٹائیرس نے کہا۔

"لیکن تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" مارگس نے اسے بازو سے پکڑ کے کہا۔

"بے وقوف مت بنو اگر میں یہاں نہیں رکا تب ہم سب مارے جائیں گے سمجھے وہ میرا بھائی ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔" ٹائیرس نے کہا تو مارگس اسے خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اب دیکھ کیا رہے ہو جاؤ یہاں سے...... فوراً" ٹائیرس چلایا۔

"ٹھیک ہے ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن تم بھی جلد آ جانا۔" مارگس نے کہا اور جینی کو لئے جانے کے لئے مڑا۔

"ایک منٹ رکو......" ٹائیرس نے کہا تو مارگس رک گیا اور ٹائیرس نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگا لیا ٹائیرس کی آنکھیں بھر آئیں "تم بالکل اپنی ماں جیسے ہو۔" ٹائیرس نے کہا اور پھر اسے دھکا دے کے خود سے جدا کر دیا۔

"اب جاؤ یہاں سے۔" ٹائیرس نے کہا تو مارگس سر ہلاتا ہوا جینی کے ساتھ دوڑ پڑا اور ٹائیرس انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دونوں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے ان کے جاتے ہی ٹائیرس نے طویل سانس لیا اور مشین گن کا بلٹ لگا کے بولا۔

"بہت ہو گئی یہ چھپن چھپائی اب تم سامنے آ سکتے ہو تھیسیس۔" اس نے کہا تو خشک پتوں کی آواز پیدا ہوئی اور درختوں کے جھنڈ میں سے تھیسیس باہر آیا۔

"کیسے ہو بھائی لگتا ہے مجھ سے کافی خوف زدہ ہو اس لئے تم اس لڑکے کو کہہ رہے تھے کہ تم میرے بھائی ہو اور میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" تھیسیس نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں میں نے یہ جھوٹ ضرور بولا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تمہارے لئے کوئی بھی رشتہ اہمیت نہیں رکھتا تم محض ایک درندہ ہو جسے زندگیوں کے چراغ بجھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔" ٹائیرس نے کہا تو تھیسیس ہنس پڑا۔

"تم نے ٹھیک کہا ہے چھوٹے بھائی کاش تمہارے پنکھ سلامت ہوتے تو تم سے لڑنے میں اور مزہ آتا۔"

"بے فکر رہو میں بنا پنکھ کے بھی تمہارا مقابلہ کر سکتا ہوں۔" ٹائیرس نے کہا تو تھیسیس اڑ کے اس پر حملہ آور ہوا تھیسیس نے فوراً ایک جانب چھلانگ لگا دی اور اس کے ساتھ ہی گن کی مدد سے اس پر فائر کھول دیا جنگل مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا مگر تھیسیس کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے ایک بھی گولی اسے چھونا پائی تھیسیس نے کلہاڑا سنبھالا اور ایک بار پھر اس پر حملہ کیا اور ٹائیرس ایک بار پھر سائیڈ پر ہو کر اس کا وار بچا گیا اور اس نے اڑتے ہوئے تھیسیس کا پنکھ پکڑ کر آگے دونوں ہاتھوں کی طاقت سے گھما کے ایک درخت سے دے مارا تو تھیسیس ڈھیر ہو گیا ٹائیرس نے مشین گن زمین سے اٹھائی اور اس کا رخ زمین پر پڑے تھیسیس کی جانب کیا اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا ایک تلوار اس کی کمر میں گھستی ہوئی اس کے سینے سے پار ہو گئی ٹائیرس نے حیرانگی سے مڑ کے دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اسے مارنے والا اور کوئی نہیں سلینا تھی۔

"کاش تم نے مجھے اسی وقت مار دیا ہوتا تو اب یوں میرے ہاتھوں نہ مرتے۔" سلینا نے کہا ٹائرس نے دیکھا اس کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا ٹائیرس نے آگے بڑھ کے اپنے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ لی تلوار اب بھی ٹائیرس کے وجود سے آر پار تھی لیکن اس کے باوجود اس کے ہاتھ کی گرفت میں اتنی سختی تھی کہ سلینا کو اپنا وجود مٹتا ہوا نظر آنے لگا کہ اچانک تھیسیس پیچھے سے اٹھا اور اس نے کلہاڑے کے ایک ہی وار سے ٹائیرس کا وجود دو ٹکڑے کر دیا اور اس کا بے جان وجود زمین بوس ہو گیا جبکہ سلینا اپنے ایک ہاتھ سے اپنا گلا مسلنے لگی۔

☆......☆......☆

پہاڑوں پر سرخ رنگ کی روشنی پھیلنے لگی تو مارگس اور جینی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا ان کے قدموں کی رفتار اور تیز ہو گئی اب جنگل بھی گھنا نہیں رہا تھا آخرکار انہیں جنگل کی حدود ختم ہوتی نظر آنے لگی۔

"مارگس......" اچانک جینی نے اسے پیچھے سے پکارا تو مارگس رک گیا اور اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو جینی جھک کے اپنے گھٹنے پکڑ کے کھڑی تھی مارگس نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"کیا ہوا جینی ہمت کرو ہم منزل کے قریب ہیں......" مارگس نے اتنا ہی کہا کہ جینی یک دم سیدھی ہوئی اور اس نے ایک چھوٹے سائز کا خنجر مارگس کے پیٹ میں گھونپ دیا مارگس حیرت بھری نظروں سے اپنے پیٹ میں ہونے والے سوراخ پر ہاتھ رکھ کے اسے دیکھنے لگا۔

"حیرت ہوئی ہے نا......؟ مجھے یہ حیرت بہت پسند ہے جب کسی مرد کے چہرے پر میں ایسی حیرت دیکھتی ہوں تو تمہیں اندازہ نہیں مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔" جینی نے خنجر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کے ایک بار پھر اس کے پیٹ میں گھونپتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ساتھی ٹائیرس ٹھیک کہتا تھا دیوتا واقعی بہادر اور جنگجو لوگوں کا شکار کرنا پسند کرتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی فوجی ہوں میں تو ایک ڈاکٹر ہوں۔ ہاں البتہ تم جیسے مردوں کا شکار کرنا میرا مشغلہ ہے میں نے اب تک 99 شکار کئے ہیں ہاہاہاہا۔ مذاق کر رہی ہوں گنتی 100 سے اوپر کی ہے سنچری تو میں کب کی کر چکی ہوں تم مجھے تاریخ کی سب سے کامیاب اور نا پکڑے جانے والی سیریل کلر کہہ سکتے ہو اور اس کا سارا کریڈٹ میری غضب کی اداکاری کو جاتا ہے جب لوگ میری معصوم شکل دیکھتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آتا کہ میں چڑیا بھی مار سکتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج تک پکڑی نہیں گئی اس جنگل میں آئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی مگر دیوتاؤں نے مجھے یہاں شکار کرنے کا موقع ہی نہ دیا اس لئے اب تمہیں یہاں مار کے اپنی عادت پوری کر رہی ہوں یہ خنجر اس اسلحہ کے باکس سے میں نے اس لئے سب سے نظریں بچا کے اٹھایا تھا تاکہ کسی کو تو شکار کر سکوں۔" جینی نے کہا مارگس نقاہت کی وجہ سے گھٹنوں کے بل گرا اس کے ہاتھ سے ٹائیرس کی دی ہوئی کمان گر چکی تھی۔

"اوہو ایک تو تم مرد بھی نا دو زخم لگنے کے بعد اپنے قدموں پر کھڑے نہیں ہو پاتے اور خود کو مرد بھی کہتے ہو چلو جو بھی ہے اب باقی کا سفر میں اکیلے کر لوں گی مگر بے فکر رہو تمہیں یوں تڑپتا نہیں چھوڑوں گی تمہارا کام تمام کر کے جاؤں گی۔" جینی نے بات کے آخر میں غرا کے کہا اور مارگس کو بالوں سے پکڑ کے اس کے گلے پر خنجر پھیرنے لگی ہی تھی کہ مارگس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے جینی کو کچھ سمجھ نہ آئی کسی نے ایک لمبا خنجر اس کی پیٹھ میں اتار دیا جینی حیرانگی سے مڑی تو اس کے سامنے گلوریا کھڑی تھی اس نے ایک بار پھر خنجر جینی کے سینے میں اتار دیا جینی کا وجود پھڑپھڑانے لگا مگر گلوریا نے اسے گردن سے پکڑ رکھا تھا اس لئے وہ گری نہیں۔

"اس جنگل میں صرف دیوتا ہی شکار کر سکتے ہیں تمہیں اس کا کوئی حق نہیں۔" گلوریا نے حقارت سے کہا اور خنجر جینی کی گردن پر پھیر کے اسے چھوڑ دیا تو اس کا وجود کسی ذبح شدہ جانور کی طرح تڑپنے لگا اور پھر چند لمحوں میں اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بے جان ہو گئیں اب گلوریا مارگس کی جانب بڑھی مارگس اسے اپنی جانب آتا دیکھ رہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں بھی بند

ہوگئیں شاید ہمیشہ کے لئے۔

☆......☆......☆

مارگس کے چہرے پر جب پانی کے چھینٹے پڑے تو اس کی آنکھ بے اختیار کھل گئی اس نے دیکھا کہ وہ جنگل سے باہر گھاس پر لیٹا ہوا تھا اور گلوریا اس پر جھکی ہوئی تھی یہ دیکھ کر مارگس نے گھبرا کے اٹھنا چاہا تو گلوریا نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔

"لیٹے رہو تمہارے زخم ابھی تازہ ہیں ہلنے جلنے سے دوبارہ کھل جائیں گے۔" گلوریا کے منہ سے اپنے لئے ہمدردی کے الفاظ سن کے مارگس حیران رہ گیا۔

"کیا میں اس مہربانی کی وجہ جان سکتا ہوں۔" مارگس نے اپنے زخموں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اپنی جان بچانے کی وجہ جاننے کی بات کر رہے ہو تو یہ میں خود نہیں جانتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا لیکن جہاں تک اس لڑکی کو مارنے کی بات ہے تو میں نے اسے اس کے کیے کی سزا دی۔" گلوریا نے کہا تو مارگس طنزیہ انداز میں مسکرا پڑا۔

"تمہیں ہنسی کس بات پر آرہی ہے؟"

"مجھے ہنسی اس بات پر آرہی ہے کہ ہزاروں انسانوں کی جان لینے والی ایک وحشی درندہ نے ایک معمولی قاتلہ کو اس کے کیے کی سزا دی حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ جابر اور ظالم ہے۔" مارگس نے گلوریا کی جانب حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس نے جو کیا مجھے اس کا انداز پسند نہیں آیا، میں ہمیشہ سامنے سے حملہ کرتی ہوں کسی کی ہمدرد بن کے اس کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپتی۔" گلوریا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یعنی تم نے اس لئے میری جان بچائی کہ تم ایک زخمی بے بس اور لاچار آدمی پر حملہ نہیں کرنا چاہتی تھیں اب تم چاہتی ہو کہ میں جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤں تا کہ پھر میرا شکار کر کے تمہارے نفس کو تسکین حاصل ہو۔" مارگس نے کہا تو گلوریا اسے دیکھنے لگی اس سے پہلے وہ کچھ بولتی سلینا اڑتی ہوئی ان سے کچھ فاصلے پر آن اتری۔

"گلوریا...... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" سلینا نے سختی سے گلوریا کو مخاطب کیا تو گلوریا گھبرا کے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں یہ جنگل سے باہر مجھے زخمی حالت میں ملا تو اسے دیکھنے لگی تھی۔" گلوریا نے جلدی سے کہا اتنے میں تھیسیس بھی اتر آیا اس کے ہاتھ میں اب بھی وہ خون آلود کلہاڑا موجود تھا۔

"تو اب تک اسے زندہ کیوں رکھا ہوا ہے مار ڈالو اس کو بھی۔" تھیسیس نے کہا۔

"مگر یہ جنگل کی حدود سے باہر آ گیا تھا اسے کیسے مارتی یہ اصول کی خلاف بات ہوتی۔" گلوریا نے نظریں چرا کے کہا۔

"اصول ہوتے ہی توڑنے کے لئے ہیں اب اسے مار ڈالو اور قصہ ختم کرو اگر تم ایسا نہیں کر سکتیں تو پھر یہ کام تھیسیس کرے گا۔" سلینا نے کہا تو گلوریا بری طرح گھبرا گئی اس کی گھبراہٹ دیکھ کے سلینا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"تھیسیس......" اس نے چلا کے تھیسیس کو مخاطب کیا تو وہ اپنا کلہاڑا تولتا ہوا مارگس کی جانب بڑھا۔

"رک جاؤ......" ان کے کانوں میں آواز پڑی تو وہ سب چونک اٹھے اور مڑ کے دیکھا تو وہاں سارس کھڑا تھا۔

"گلوریا ٹھیک کہہ رہی ہے اسے مارنا اصول کے خلاف ہے اگر ہم اپنے ہی بنائے ہوئے اصول توڑنے لگے تو ہم میں اور انسانوں میں کیا فرق رہ جائے گا اصول یہ ہے کہ جو بھی اس جنگل سے باہر آ گیا اسے کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے ہزاروں سالوں بعد یہ واحد انسان ہے جو زندہ اس جنگل سے باہر آیا ہے۔"

"لیکن......" سلینا نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں ہم پہلے کی طرح ہر اصول کی پاسداری کریں گے سمجھ گئے۔" سارس نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو سلینا ہونٹ چبانے لگی اور پھر یکدم اپنے پر سیکڑ کے فضاء میں تیزی سے بلند ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اس کے جاتے ہی تھیسیس نے بھی تقلید کی اور اڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور مارگس ان دونوں

باپ بیٹی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

میں زیوس کے محل میں ایک بڑے کمرے کے پلنگ پر لیٹے ہوئے گلوریا کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ بلا شبہ انتہائی حسین لڑکی تھی اس کو دیکھ کر کسی بھی انسان کا دیوانہ ہو جانا لازمی امر تھا اگر وہ اس کی دنیا میں ہوتی تو وہاں کا ہر نوجوان ہی اسے پانے کی تمنا کرتا مگر مارگس کو اس کی حقیقت کا علم تھا کہ وہ عام انسان نہیں ہے وہ ایک دیوی ہے جس کی عمر صدیوں پر محیط ہے اس لئے مارگس اس کی ہمدردی کو دیکھ کر اپنے دل میں کوئی بھی غلط فہمی نہیں پالنا چاہتا تھا اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ تا ئیرس اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور اس بات کا اسے سب سے زیادہ افسوس تھا پھر جینی کے دھوکے نے تو جیسے اس سے ہر کسی کا اعتبار چھین لیا تھا سارس اور گلوریا اسے اس محل میں لائے تھے وہ بھی سلینا اور تھیسیس کے اختلاف کے باوجود یہی وجہ تھی کہ وہ ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر وہ چاہتے تو اس جنگل میں ان کے لئے مارگس کا خاتمہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا وہ انہیں سوچوں میں گم پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور گلوریا اندر داخل ہوئی آج پہلی بار مارگس نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی وہ مسکرانے کی وجہ سے اور بھی حسین لگ رہی تھی وہ آرام آرام سے قدم اٹھاتی اس کی جانب بڑھی اس کے پر سکڑے ہوئے حالت میں ساکن تھے وہ اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی تو مارگس بھی تھوڑا سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"اب کیسی ہے تمہاری طبیعت؟" گلوریا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"پہلے سے کافی بہتر ہوں اور اس کے ساتھ ہی آپ کا بے حد شکر گزار بھی ہوں۔" مارگس نے مسکرا کے کہا۔

"شکر گزار......؟ کس بات کے لئے......؟" گلوریا نے معصومیت سے کہا تو مارگس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آپ نے دراصل دوبارہ میری جان بچائی ہے پہلی بار جینی کے ہاتھوں مرنے سے بچایا اور دوسری بار اپنی......" مارگس کہتے کہتے رک گیا کیونکہ اسے لگا شاید اپنی ماں کا نام اس کے منہ سے سن کر گلوریا کو برا لگے۔

"میں جانتی ہوں میری ماں طبیعت کی تھوڑی سخت ہیں مگر دل کی بہت اچھی ہیں۔"

"دل کی تو آپ بھی بہت اچھی ہیں۔" مارگس نے کہا تو گلوریا اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو......؟" مارگس نے اس کی نظروں کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ تم انسان کتنے جذباتی ہوتے ہو۔" گلوریا نے دھیرے سے کہا۔

"جذبات انسانوں میں کیا جانوروں تک میں ہوتے ہیں ہاں انداز ضرور ہر جذبے کا الگ ہوتا ہے۔"

"تمہارے جذبے کا انداز کون سا ہے؟" گلوریا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہا اس سے پہلے کہ مارگس کوئی جواب دیتا دروازہ کھلا اور سلینا اندر داخل ہوئی اور گلوریا کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو گلوریا گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"گلوریا تم جاؤ یہاں سے......" سلینا نے سرد آواز میں کہا تو گلوریا چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلی گئی اور سلینا نے اس کے جاتے ہی مارگس کو مخاطب کیا۔

"امید ہے کہ تم ایک دو روز تک مکمل ٹھیک ہو جاؤ گے اور اس کے بعد تمہیں تمہاری دنیا میں لوٹا دیا جائے گا۔"

"مگر سارس نے کہا تھا کہ میں......"

مارگس نے کہا تو سلینا نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہرگز نہیں سارس جو تمہیں یہاں رکھنا چاہتا ہے میں وہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی تمہیں یہاں سے ہر حال میں جانا ہوگا کیونکہ میں نے اپنا ایک ہاتھ تمہاری وجہ سے کھو دیا ہے اب اپنی بیٹی کو ہرگز نہیں کھونا چاہتی سمجھے۔" سلینا نے تیز لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی جب کہ مارگس حیرت سے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

دو روز بعد مارگس چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا اس روز کے بعد اس کا گلوریا یا سلینا سے سامنا نہیں ہوا تھا ہاں البتہ اب وہ گلوریا کے بارے میں ضرور سوچنے لگا تھا شاید اسے گلوریا سے محبت ہوگئی تھی مگر وہ کوئی بھی ایسی بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے دیوتاؤں کا پورا خاندان اس کا دشمن ہوجاتا سلینا اور تھیسیس پہلے ہی اسے ناپسند کرتے تھے اور وہ انہیں کسی بات کا اپنی جانب سے موقع نہیں دینا چاہتا تھا وہ چلتے چلتے شام کے وقت محل سے باہر نکل آیا جہاں پر چھوٹے بڑے چشمے تھے کہ اچانک ایک بڑے چشمہ کے پاس پڑے ایک بڑے پتھر پر اسے گلوریا بیٹھی نظر آئی گلوریا کی پشت اس کی جانب تھی اس لئے گلوریا اسے دیکھ نہ پائی مارگس آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور ارد گرد کسی کو نہ پاکے اس کے ساتھ پتھر پر بیٹھ گیا گلوریا اس کی آمد سے باخبر تھی مگر وہ بدستور نظریں جھکائے بہنے والے پانی کو دیکھے جارہی تھی۔

"کیا میں غلط وقت پر آیا ہوں......؟" مارگس نے ایک کنکر پانی میں اچھالتے ہوئے کہا مگر گلوریا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو......؟" مارگس نے کہا تو اس نے سر اٹھا کے ایک نظر مارگس کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"نہیں......"

"تو پھر اس دن کے بعد میرا حال پوچھنے کیوں نہیں آئیں......؟" مارگس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"کیونکہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتی جو آپ کی تکلیف کا سبب بنے۔" گلوریا نے دھیرے سے کہا۔

"تمہیں میری اتنی فکر کب سے ہونے لگی......؟" مارگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہوسکتی کیا میں انسان......" گلوریا کہتے کہتے رک گئی تو مارگس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"تم نے ٹھیک کہا تم واقعی بالکل انسانوں جیسی ہو اور باقی دیوتا بھی بالکل انسانوں جیسے ہی ہیں صرف طاقت کا ہی فرق ہے اور میں اس فرق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔" مارگس نے لاپروائی سے کہا۔

"اہمیت دینی پڑے گی کیونکہ جو آپ سے طاقت ور ہے اس سے الجھنا نہیں چاہئے کیونکہ وہ آپ کا بہت کچھ بگاڑ سکتا ہے اور یہی اس کائنات کا اصول ہے۔" گلوریا نے تیز لہجے میں کہا۔

"مگر اس کائنات کا ایک اور بھی اصول ہے وہ یہ کہ اپنے حق کے لئے کسی سے بھی ٹکرا جاؤ......" مارگس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ کا حق کب سے ہوگئی......" گلوریا نے جلد بازی میں کہہ دیا اور پھر اپنے ہی الفاظ کی اہمیت کا اندازہ ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی اور مارگس نے ایک دم آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"یعنی تمہیں بھی اس بات کا علم ہے کہ میں تمہیں اپنا حق سمجھتا ہوں۔" مارگس نے کہا مگر گلوریا خاموش رہی۔

"ہاں یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں کب سے؟ کیسے؟ ان سوالوں کا جواب میرے پاس بھی نہیں لیکن جو دل میں ہے وہ بتا رہا ہوں۔"

"آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کتنی سنگین بات سوچ رہے ہیں اگر اس بات کی کسی کو بھنک بھی لگ گئی تو آپ کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے اس بات کا آپ کو اندازہ ہے؟" گلوریا نے گھبرا کے کہا۔

"اپنے انجام کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں یقین ہے لیکن اگر تم بھی میرے بارے میں وہ سوچتی ہو جو میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے کسی انجام کی فکر نہیں۔" مارگس نے ٹھوس لہجے میں کہا اس سے پہلے کہ گلوریا کوئی جواب دیتی کوئی مارگس پر جھپٹا اور اسے دبوچ فضا میں بلند ہوتا چلا گیا مارگس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی گلوریا نے دیکھا یوں مارگس پر جھپٹنے والا اور کوئی نہیں تھیسیس ہے تو وہ بھی مارگس کو بچانے کے لئے بے اختیار

اڑی تھیسیس نے انتہائی بلندی پر پہنچ کے ایک دم مارگس کو چھوڑ دیا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی جانب بڑھنے لگا اسے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں مگر اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا کسی نے زمین سے چند فٹ اوپر ہی اس کا ہاتھ تھام لیا مارگس نے دیکھا اس کا ہاتھ تھامنے والا اور کوئی نہیں گلوریا تھی گلوریا اسے ہاتھ سے پکڑے تیزی سے محل کی جانب اڑ رہی تھی مارگس نے دیکھا تھیسیس تیزی سے ان کی جانب بڑھ رہا تھا اس کی رفتار گلوریا سے کہیں زیادہ تھی اور چند لمحوں میں ہی وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔

"رک جاؤ گلوریا......" تھیسیس ان کے قریب پہنچ کے غرایا۔

"آپ ہٹ جائیں ہمارے راستے سے۔" گلوریا جواباً غرائی۔

"تم جانتی ہو تم بغاوت کررہی ہو۔" تھیسیس غرایا۔

"نہیں میں کوئی بغاوت نہیں کررہی میں بس اسے بچانا چاہتی ہوں۔" گلوریا نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں تم اسے کیسے بچا سکتی ہو۔" یہ کہہ کر تھیسیس گلوریا پر جھپٹا اور اس کے دونوں پر اپنے آہنی ہاتھوں کے شکنجے میں لے لئے گلوریا نے زور لگا کے اس کی گرفت میں سے خود کو چھڑوانا چاہا مگر ناکام رہی اسی کشمکش میں اس کے ہاتھ سے مارگس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ تیزی سے زمین پر گرنے لگا۔

یہ دیکھ کر گلوریا نے آخری اپنی پوری طاقت سے خود کو تھیسیس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی مگر اس بار بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مارگس اب زمین پر گرنے کے قریب تھا یہ دیکھ کر گلوریا کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی مگر یہ اس کی آخری چیخ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے سر پر تھیسیس کا بھاری بھرکم ہاتھ پڑا تھا جس نے اسے ہوش کی دنیا سے بیگانہ کردیا۔

گلوریا کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنے کمرے کے پلنگ پر پایا وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی اس نے دیکھا اس کے ساتھ اس کی ماں بیٹھی تھی جبکہ اس کے پیچھے تھیسیس کھڑا تھا۔

"تو تمہیں ہوش آہی گیا۔" سلینا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں مگر وہ مارگس......"

"مارگس مر گیا ہے اور تمہارے لئے بہتر ہے کہ اب اس کا نام بھی مت لو......" سلینا نے غصے سے کہا۔

"مگر اس کا قصور کیا تھا؟" گلوریا نے چلا کے کہا۔

"چلاؤ مت اس کا قصور یہ تھا وہ تم سے محبت کرتا تھا۔"

"مگر میں تو نہیں کرتی تھی پھر اسے مارنے سے آپ کو کیا ملا۔" گلوریا نے بدستور چلا کے کہا۔

"اچھا ہے کہ تم اسے نہیں چاہتی تھیں ورنہ تم زندہ نہ ہوتیں اور زیوس کے قہر کا نشانہ بن جاتیں جیسے مارگس کی نافرمان ماں بنی تھی۔" سلینا نے کہا اور اٹھ کے باہر چلی گئی تھیسیس بھی اس کے پیچھے باہر نکل گیا اور دروازہ باہر سے بند کردیا جبکہ گلوریا کے گال کو بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

☆......☆......☆

مارگس کو ہوش اس وقت آیا جب وہ گرتے گرتے زمین کے قریب پہنچ گیا اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر دوسرے ہی لمحے اسے لگا جیسے وہ کسی پانی میں گرا ہوا ہو اور اب اس کی گہرائی میں جارہا ہوں اس نے بے اختیار سانس روک لی چند لمحوں بعد اس کا جسم خود بخود پانی کی سطح پر آ گیا اس نے دیکھا وہ خوش قسمتی سے پانی کے ایک چشمہ میں گرا تھا وہ تیرتا ہوا کنارے پر آیا اور باہر نکل کے کنارے پر لیٹ کے لمبے لمبے سانس لینے لگا اور گلوریا کے بارے میں سوچنے لگا اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ گلوریا اس کی وجہ سے اس مصیبت کا شکار ہوئی ہے وہ اس تمام مصیبت سے نکلنے کے لئے کوئی حل سوچنے لگا پھر اچانک اس نے ایک انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا رات ہوچکی تھی لیکن وہ اندازے پر ہی محل کی سمت بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

"مزیوس......" کسی نے چلا کے محل کے سامنے کہا تو سب سپاہی مارے خوف کے کانپ اٹھے کیونکہ آج تک

سی نے اتنے توہین آمیز انداز میں زیوس کو نہیں پکارا تھا سب سپاہی محل سے باہر کھلے میدان میں نکلے تو انہوں نے دیکھا پکارنے والا اور کوئی نہیں مارگس تھا سپاہیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا اس سے پہلے وہ اسے پکڑتے۔

"رک جاؤ......" کسی نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ تو سپاہی رک گئے زیوس نے محل سے باہر آتے ہوئے کہا اس کے ساتھ سارس، تھیسیس اور سلینا بھی تھی۔

"بولو لڑکے کیا وجہ ہے کہ تم نے ہمیں اس انداز سے پکارا ہے تم جانتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔" زیوس نے ناگواری سے کہا۔

"انجام...... انجام...... میں تنگ آ گیا ہوں یہ سب سن سن کر آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں کیا انسانوں کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔" مارگس نے کہا تو تھیسیس غصے سے آگے بڑھنے لگا مگر زیوس ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا کہا۔

"اہمیت ہے جتنی تمہارے نزدیک کسی کیڑے مکوڑے کی ہوتی ہے۔" زیوس نے حقارت سے کہا۔

"ٹھیک کہا آپ نے آپ کی ایسی سوچ کی وجہ سے سلینا اور تھیسیس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔" مارگس نے تحمل سے کہا۔

"ہاں انہوں نے بتایا تھا کہ تم گلوریا میں دلچسپی لینے لگے تھے اس لئے انہوں نے انتہائی قدم اٹھایا۔"

"یہ سچ ہے میں واقعی گلوریا سے محبت کرتا ہوں۔" مارگس نے جلدی سے کہا۔

"یہ جانے بنا کہ وہ تم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔" زیوس کے جواب دینے سے پہلے سلینا نے تیز لہجے میں کہا تو زیوس نے اسے غصے سے دیکھا۔

"گلوریا کو ابھی اور اسی وقت یہاں بلایا جائے۔" زیوس نے کہا تو تھوڑی دیر بعد گلوریا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر آ گئی وہ انتہائی لاغر انداز میں نظر آ رہی تھی اس کی خوب صورت آنکھیں شاید مسلسل رونے کی وجہ سے بجھی بجھی نظر آ رہی تھیں اس نے مارگس کو دیکھا تو اس کا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے ان میں مایوسی چھا گئی۔

"گلوریا کیا تم بھی اس کے جرم میں شریک ہو؟" زیوس نے غرا کے پوچھا مگر گلوریا سر جھکا کے خاموش کھڑی رہی۔

"اس کی خاموشی انکار کی علامت ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جرم صرف تم سے سرزد ہوا ہے۔" زیوس نے مارگس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات محبت جرم نہیں دوسری بات ہماری دنیا میں خاموشی کو اقرار تسلیم کیا جاتا ہے انکار نہیں۔" مارگس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"مگر یہ تمہاری دنیا نہیں......؟" زیوس نے کہا۔

"جانتا ہوں مگر یہ مسئلہ ایک انسان اور دیوتا ذات کے درمیان ہے اس لئے آپ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہاں میری نظر میں اس کا ایک حل ہے آپ کے پاس۔"

"کون سا حل......" زیوس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی انسان انہیں اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہرا دے تو وہ اس کی ایک خواہش ضرور پوری کرتے ہیں چاہے اسے پورا کرنے کے لئے دیوتا کی اپنی جان بھی دینی پڑے۔" مارگس نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں جانتا ہوں اس بارے میں مگر کیا تم نے دیوتاؤں کو اتنا کمزور اور کم تر سمجھا ہے کہ تم انہیں ہرا دو۔" زیوس نے حیرانگی سے کہا۔

"نہیں میں جانتا ہوں یہ بہت مشکل کام ہے مگر بعض دفعہ کسی منزل کو پانے کے لئے یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔" مارگس نے گلوریا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو گم صم سر جھکائے ان کی بحث سنے جا رہی تھی۔

"تو تم کس سے لڑنا چاہو گے......؟" زیوس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"آپ کی میں دل سے عزت کرتا ہوں اور سارس نے میری جان بچائی ہے رہا سلینا کا سوال تو یہ مجھ سے جتنی بھی طاقت ور ہوں بہر حال ایک عورت ذات ہیں

[illegible] سے لڑنا میری توہین ہے۔" مارگس نے کہا تو سلینا غصے سے بل کھا کے رہ گئی اس کا بس چلتا تو مارگس کے ٹکڑے کر کے فضا میں بکھیر دیتی۔

"تو تم تھیسیس سے لڑنا نہیں چاہتے ہو یہ جاننے کے باوجود کہ یہ تم پر ذرا بھی رحم نہیں کھائے گا۔" زیوس نے کہا۔

"ہاں وہ اس لئے کہ اس سے میں نے اپنے ایک دوست کی موت کا بدلہ بھی لینا ہے اور یہ قرض میں ضرور اتاروں گا۔" مارگس نے ٹھوس لہجے میں کہا تو زیوس نے تھیسیس کو اشارہ کیا تو تھیسیس چلتا ہوا مارگس کے سامنے آن کھڑا ہوا ان کے درمیان اب صرف دس فٹ کا ہی فاصلہ تھا تھیسیس اس کے وجود سے کافی بھاری بھرکم اور طاقتور تھا حقیقت میں ان کے مقابلے کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا تھیسیس نے زیوس کی جانب دیکھا اور جیسے زیوس نے سر ہلایا تھیسیس تیزی کے ساتھ مارگس پر جھپٹا مگر مارگس اس کے حملے کے لئے پہلے ہی تیار تھا وہ ایک دم بیٹھ گیا اور تھیسیس کا اڑتا ہوا حملہ ناکام ہو گیا لیکن وہ فوراً دوبارہ کسی عقاب کی طرح پلٹا اور مارگس پر حملہ آور ہوا مارگس نے سائیڈ پر ہونا چاہا مگر تھیسیس نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور فضاء میں بلند ہوا ابھی وہ چند فٹ ہی اوپر گیا تھا کہ مارگس نے زوردار جھٹکے سے اپنا کندھا چھڑا لیا اور زمین پر آن گرا اب سب یہ خونی لڑائی دیکھنے میں مصروف تھے سب کو ہی تھیسیس کی جیت کا یقین تھا گلوریا دم سادھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ لڑائی دیکھ رہی تھی۔

مارگس کو اپنی گرفت سے نکلتے دیکھ کر تھیسیس کو اور غصہ آ گیا وہ ایک بار پھر مارگس پر جھپٹا اور اسے پکڑ کے تھوڑا اوپر اڑا اور چند فٹ کے فاصلے پر آ کے اسے خود ہی چھوڑ دیا مارگس ایک بار پھر زمین پر گرا اس بار اسے کافی شدید چوٹیں لگیں سب کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ تھیسیس کو جان بوجھ کر طول دے رہا ہے تا کہ مارگس کو تڑپا تڑپا کے مار سکے مارگس نے ہمت کی اور ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا مگر اس بار وہ اٹھا ہی تھا کہ تھیسیس نے اسے پر مارا تو وہ اڑتا ہوا ایک جانب گرا اس بار اس کا سر زور سے زمین سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سر چکرانے لگا اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے تھیسیس اس سے بیس فٹ دور فضا میں معلق کھڑا تھا۔

"اٹھو لڑکے باتیں تو بہت بڑی بڑی کر رہے تھے میں نے کہا تھا ناں انسانوں کی اوقات ایک کیڑے سے زیادہ نہیں ہوتی۔" تھیسیس نے ہنس کے کہا۔

"تم غلط کہہ رہے ہو انسان اس پوری کائنات میں سب سے افضل ہے افضل تھا اور افضل رہے گا جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تم جیسوں کے لئے ایک عقل مند انسان نے کہا تھا۔ کسی وجود ہی کی سب سے بڑی طاقت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔" مارگس نے پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کے کہا۔

"میں سمجھا نہیں......؟" تھیسیس نے حیرت سے کہا۔

"کیسے سمجھو گے بے وقوف تم انسان تھوڑی ہی ہو۔" مارگس نے ہنس کے کہا اس سے پہلے کہ تھیسیس کچھ سمجھتا مارگس نے ایک پتھر کے پیچھے سے تائیرس کی کمان نکلی اور ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں نشانہ لے کر تیر چلا دیا تیر سیدھا تھیسیس کے دائیں پر میں لگا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گرا اس سے پہلے کہ وہ سیدھا ہوتا مارگس نے ایک تیر ہاتھ میں لیا اور تھیسیس کی پیٹھ پر سوار ہو کر تیر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

"اگر تم ذرا بھی ہلے تو یہ تیر تمہاری گردن کے پار ہو جائے گا۔" مارگس نے غرا کے کہا تو تھیسیس ساکن ہو گیا مارگس نے آہستہ سے اس کے اوپر سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیر پھینک دیا۔

"نہیں میں اب اور نہیں لڑ سکتا اگر ہم میں سے کسی ایک کے مرنے پر ہی لڑائی ختم ہوتی ہے تو مجھے مار دیا جائے کیونکہ میں یوں کسی کا قتل نہیں کر سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کسی کو کھونے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔" مارگس نے جذباتی انداز میں کہا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور سب گم صم اسے دیکھے جا رہے تھے تھیسیس بھی [illegible] حیرانگی سے دیکھے جا رہا تھا۔

"تم یہ لڑائی جیت چکے ہو۔" زیوس نے طویل سانس لے کر کہا تو سلینا کا چہرہ لٹک گیا جبکہ گلوریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بولو کیا مانگتے ہو......؟" زیوس نے کہا تو گلوریا کی خوشی دوچند ہوگئی۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ یہاں موجود تمام انسانوں کو اپنی دنیا میں واپس بھیجا جائے اور آئندہ کبھی بھی کوئی بھی دیوتا کسی انسان کا شکار نہ کرے۔" نارگس نے کہا تو گلوریا مارے حیرت کے اسے دیکھنے لگی صرف وہی نہیں سب کے چہروں پر حیرانگی چھا گئی چند لمحے کے لئے موت کا سناٹا چھا گیا۔

"کیا تم واقعی یہی چاہتے ہو جبکہ میرے خیال میں کچھ اور مانگنا چاہئے۔" زیوس نے گلوریا کی جانب دیکھ کر کہا جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے نارگس کو دیکھے جارہی تھی۔

"نہیں میری بس یہی خواہش ہے۔" نارگس نے گلوریا سے نظریں چراتے ہوئے کہا تو زیوس نے کچھ سوچ کے سر ہلادیا۔

"تم انسان واقعی ہم دیوتاؤں سے کہیں زیادہ افضل ہو اور یہ تم نے اپنے دل کی قربانی دے کر انسانیت کو بچا کر ثابت کردیا۔" زیوس نے کہا۔

اور پھر تمام انسانوں کو رہا کرکے دنیا میں لوٹانے کا حکم دیا ان انسانوں کے ساتھ نارگس کو بھی زمین پر لوٹا دیا گیا۔

☆......☆......☆

نارگس کو جیسے ہی نیویارک میں اتارا گیا وہ سیدھا پولیس اسٹیشن گیا اور گرفتاری دے دی جیل کے تباہ ہونے کے بعد اسے خطرناک فرار مجرم قرار دیا گیا اور اسے ہی جیل گرانے کا ذمہ دار قرار دے کے تین دن کے اندر اندر اسے موت کی سزا سنادینے کا فیصلہ ہوا صبح اسے انجکشن لگا کے ہمیشہ کے لئے سلادیا جانا تھا رات کا پچھلا پہر تھا نارگس اپنے سیل کی دیوار سے ٹیک لگائے گلوریا کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اسے مرنے کی فکر نہیں تھی اسے فکر تھی تو اس بات کی تھی کہ نہ جانے گلوریا اس سے محبت کرتی بھی تھی یا نہیں اور پتہ نہیں وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی وہ انہیں خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک سیل کا دروازہ کھلا۔

"شاید مرنے کا وقت ہوگیا ہے۔" نارگس نے سوچا مگر جب اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو حیران رہ گیا کیونکہ آنے والا اور کوئی نہیں گلوریا تھی۔

"گلوریا......تم......اور یہاں کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں......" نارگس نے حیرانگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ حقیقت ہے۔" گلوریا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا مگر کیا کرتا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا یا ایک ہی طریقہ تھا جس سے دیوتاؤں کے دل سے انسانوں کی نفرت کم کی جاتی اگر میں تمہیں مانگ لیتا تو یہ نفرت اور بڑھ جاتی......" نارگس نے سر جھکا کے کہا۔

"میں جانتی ہوں اور زیوس بھی اس بات سے بہت خوش ہیں اس لئے وہ خود تمہیں لینے آئے ہیں۔" گلوریا نے مسکرا کے کہا۔

"کہاں ہیں وہ......؟" نارگس نے حیرانگی سے کہا وہ باہر پہرے پر موجود سپاہیوں کو تھوڑی دیر کے لئے سلا رہے ہیں۔ اور مجھے کہا ہے کہ تمہیں لے کر دیوتا نگری پہنچوں۔" گلوریا نے کہا اور نارگس کا ہاتھ پکڑ کے باہر نکلنے لگی تو نارگس رک گیا تو گلوریا اسے حیرانگی سے دیکھنے لگی۔

"پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔"

"کون سی بات کا......؟" گلوریا نے حیرانگی سے کہا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے......؟" نارگس نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔

"اس کا جواب راستے میں دوں گی۔" گلوریا نے مسکرا کے کہا تو نارگس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی اور پھر گلوریا نارگس کو لئے باہر آئی اسے اپنی بانہوں میں لے کر زمین سے اوپر کو اٹھی اور ہوا میں اڑنے لگی۔